910
LIBRARY
LIBRARY CLERK
... COLLEGE
(FOR GIRLS)

DATE LABEL

If the book is not returned by the date last stamped, a fine of 25 paise per day will be charged.

Due Date	Due Date	Due Date	Due Date

آئینے اکیلے ہیں

کرشن چندر

MILLI
910
COLLEGE

ناول

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

آئینے اکیلے ہیں

کرشن چندر

کتابت : وقار رضوی
مطبع : نظامی پریس
بار اوّل : ایک ہزار
اگست : ۱۹۶۲ء

آئینے اکیلے ہیں

کرشن چندر

ناول

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

جملہ حقوق محفوظ

نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

آئینے اکیلے ہیں

انتساب

سلمیٰ کے نام

با کفر و ایماں ساختم، با آذری پرداختم
من قبلہ محمود ساختم محراب ابروئے کے

سرشار حیدر

پہلا پتھر

There is a tangent in a parabola, in parabola, in a tabola, bola bola - وہ بولا۔ "اندھیرا زیادہ ہے اور میرے دماغ میں چیونٹیاں بھر گئی ہیں شاید ہزاروں، لاکھوں ننھی ننھی چیونٹیاں میرے دماغ کے خلیوں میں رینگ رہی ہیں۔ میرا دماغ شہد کا ایک چھتہ ہے جو میرے جسم سے لٹکا ہوا ہے۔ وہ کالی سانولی چیونٹیاں لاکھوں کروڑوں ایک دوسرے پر پل پڑتی ہوئی میرے دماغ کے ہر حصے میں پہنچ گئی ہیں۔ اور اب وہ اپنے ننھے ننھے ڈنک اٹھا کر میرے دماغ کو کھا رہی ہیں۔ ایک ساتھ ایک لاکھ سوئیاں چبھو رہی ہیں ___ اُف!"

کنول نے گھبرا کر اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی لمبی لمبی بے حسین انگلیاں اس کے

گھنے بالوں میں گھومنے لگیں۔ اور کنول کو محسوس ہوا جیسے اس کی انگلیوں پر بھی وہی چیونٹیاں چڑھتی جا رہی ہیں۔ سینکڑوں، ہزاروں چیونٹیاں رینگتی بڑھتی چلی آ رہی ہیں۔ گھبرا کر اس نے ہاتھ جھٹک دیئے۔ ایک لمحے کے لئے ایک سو یا ایک ہزار چیونٹیاں اسکی انگلیوں سے اُڑ کر فرش پر گر گئیں۔ اور اب فرش پہ چلتی ہوئی اپنی ننھی منی کالی ٹانگوں سے چلتی ہوئی اب وہ اسکی ٹانگوں کی طرف آ رہی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چند لمحوں میں اسکے پیروں پر چڑھ آئیں گی اور پھر اس کے سارے بدن پر رینگنا شروع کر دیں گی۔ اس کے جسم کا کوئی کونہ ان چیونٹیوں کی زد سے نہیں بچے گا۔ وہ جلدی سے بستر سے اُٹھ بیٹھا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے کی کھڑکی تک پہونچ گیا۔ اور کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ برفیلی ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا۔ اور اس کے دماغ کی ساری چیونٹیوں کو اڑا کر لے گیا۔ وہ سب چلی گئیں تھیں۔ اسکے دماغ سے، ہاتھوں سے، ہاتھوں کی انگلیوں سے، فرش سے، پاؤں سے اب کہیں ایک بھی چیونٹی نہیں رینگ رہی تھی۔ سب گئیں۔ یکایک اسے بڑا اطمینان سا ہوا۔ اس نے برفیلی ہوا کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ اسے اپنے پھیپھڑوں میں اُتار دیا۔ پھر کچھ دیر روک کر باہر نکال دیا۔ اب اسکے پھیپھڑے بھی صاف تھے۔ جسم ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ریت میں دبے ہوئے کاغذ پر سے ریت اُڑ جائے۔ جتنے لمحے وہ اس کھلی کھڑکی کے سامنے پھیپھڑے بھرتا رہا۔ اور کانپتا رہا۔ اور گنگشٹن محلہ ڈون کی زرد زرد بتیوں کو لرزتے دیکھتا رہا۔ یہ روشنیاں جو رات کے اندھیرے گڑھے میں مصروفِ دعا

راہداریوں کے پیلے پیلے چہروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ لندن کا یہ حصہ کولابہ کی ایک گلی معلوم ہوتا ہے۔ رات میں بہت سے شہر ایک سے لگتے ہیں۔ جیسے بہت سی عورتیں ایک سی لگتی ہیں۔ جیسے بہت سی سڑکیں ایک سی لگتی ہیں۔ وہی سامنے سیمنٹ کی سطح، کول تار کا بلو بلیک، کناروں پر لوہے کے کھمبے روشنی کی قندیل لے کر جھکے ہوئے ایک ہی جگہ کھڑے ہوئے۔ کوئی شرابی گھر جاتا ہوا۔ کوئی بابی ٹہلتا ہوا۔ کوئی چور مال سمیٹ کر بھاگتا ہوا۔ کوئی اخبار گاڑی دنیا بھر کی گندی خبروں کا کچرا لادے ہوئے گزر رہی ہے۔ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ اس ملک نے اس ملک پر حملہ کر دیا۔ اتنے زلزلے آئے، کتنے ہوائی جہاز سے مرے، پچاس سالہ مسز روبی کینیتھ ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور وہ عورت جو پچیس سال سے اپنے خاوند کے ساتھ رہ رہی ہے وہ خبر نہیں ہے۔ وہ کلرک جو چھتیس برس سے اپنے دفتر میں بڑی دیانت داری سے کام کر رہا ہے۔ وہ خبر نہیں ہے۔ کوئی اچھی خبر، خبر نہیں ہے۔ صبح کا اخبار دیکھ کر ناک پر رومال رکھنے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ لوگوں میں عادت ہوتی ہے کہ غسل خانہ میں گھس کر اخبار پڑھتے ہیں۔ شاید اخبار پڑھنے کی صحیح جگہ وہی ہے۔ کموڈ! یکایک اس کی نگاہ سامنے کی بلڈنگ کے پورچ پر گئی۔ ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں کام کرنے والی مس کلارا شونڈیل ایک پیلے لمبے کوٹ میں ٹھٹھرتی ہوئی اپنے عاشق کو الوداع کہہ رہی ہے۔ خیر وہ اس وقت تین بجے ہوں گے۔ اس وقت اس کا بڈھا عاشق ہنری ڈی کورٹ لینڈ

واپس اپنے گھر جاتا ہے۔ رات کے تین بجے، ہر روز۔۔۔ کیا کہتا ہو گا اپنی بیوی سے،
کتنا ہی چالاک مرد کیوں نہ ہو۔ ہر روز نیا بہانہ نہیں بنا سکتا۔ علمِ ریاضی کی رو سے
یہ ناممکن ہے۔ اور عورتیں کوئی کام ریاضی کی رو سے نہیں کرتیں۔ ممکن ہے اُس کے
گھر میں کوئی عورت نہ ہو، یعنی کوئی بیوی نہ ہو پھر بھی اُس کے فلیٹ میں کوئی تو ہو گا
جس کے سامنے اُسے جوابدہ ہونا پڑتا ہو گا۔ ممکن ہے کوئی بھی نہ ہو۔ پھر بھی کچھ تو
ہو گا، کوئی ہم نفس نہ سہی، گھر میں فرنیچر تو ہو گا، صوفہ، پانی کا جگ یا تپائی
پر رکھا ہوا خاکدان۔ یہ چیزیں بھی بیویوں کی طرح گھر میں رہ کر آدمی پر اپنا حق اور
قبضہ جتانے لگتی ہیں۔ گھر میں کوئی نہ ہو، لیکن دیر سے آنے پر پانی کے جگ کی صورت
ہی بدل جاتی ہے۔ جیسے غصے بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا ہے۔ اتنی دیر کیوں؟
دیر ہو! صوفے پر بیٹھو تو لگتا ہے اسکے خالی حصے نے منہ دوسری طرف کر لیا ہے۔
خاکدان میں سگریٹ بجھانے کے لئے ہاتھ بڑھاؤ، تو اُس کے کھلے خالی منہ سے
ایسی گالیاں سی نکلتی معلوم ہوتی ہیں۔ "اس نگوڑی ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاؤ،
اب میرے پاس کیوں آئے ہو، رات کے تین بجے؟" —— دن بھر سے خالی منہ
اُٹھائے اُٹھائے تمہارا انتظار کر رہی ہوں، مگر تمہیں کیا؟" غصے اور غم سے
پوری ایش ٹرے سلگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ چیزیں خرید کر انہوں نے
ان پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چیزیں آہستہ آہستہ آدمی پر قبضہ کر لیتی ہیں۔
پھر وہ ان کا غلام ہو جاتا ہے۔ چاہے وہ ایش ٹرے ہو، یا پھولدان ہو، صوفہ ہو۔

یا بیڈ روم کی وہ پرانی کرسی ہو جس پر پچھلے بیس برس سے دن کے کپڑے اُتار کے رکھ دئے جاتے ہیں۔ وہ سب اپنا حق تم پر جتانے لگتے ہیں۔ کنول نے ڈالی کی کچھ تصویریں دیکھی تھیں۔ جس میں ایسے بے جان چیزوں کو روح اور شخصیت عطا کی گئی۔ مبالغہ آرائی کے باوجود ان میں کچھ تو سوچا ہے۔ ڈالی کبھی کبھی بڑے پتے کی بات کہہ جاتا ہے، اپنی تصویروں میں......

کنول کا سارا بدن اب برفیلی ہوا سے سُن ہو گیا تھا۔ ہولے سے اُس نے کھڑکی بند کر دی، کسی قدر افسوس کے ساتھ، اور پھر واپس اپنے بستر پر آگیا جہاں ایک کونے میں جولی بے خبر سو رہی تھی، جولی بہت بے خبر سوتی تھی، ایسی گہری نیند کہ اگر آپ اُسے قتل بھی کر دیں تو اُسے خبر نہ ہو۔ کئی بار کنول نے جولی کی گہری نیند کا آسرا لے کر اسے قتل کرنے کو سوچا بھی تھا۔ کتنا آسان ہو گا جولی کو قتل کر دینا۔ اُسے معلوم بھی نہ ہو گا۔ جب وہ آنکھ کھولے گی تو دوسری دنیا میں ہو گی۔ کیسی حیران ہو گی وہ اس وقت۔ کنول جولی کے چہرے پر پھیلتی ہوئی حیرت کا اندازہ کر کے مسکرانے لگا۔ جولی خواب میں بڑبڑائی۔ کنول نے ہاتھ بڑھا کر جولی کو ذرا تھپک دیا۔ کچھ دیر تک وہ بستر پر بیٹھا بیٹھا اندھیرے کی اس محراب کو دیکھتا رہا جو اس کے بستر سے کھڑکی تک ایک پیرابولا سا بناتی تھی۔ جس میں کھڑکی سے باہر گزرنے والی موٹروں کی روشنیاں ایک Tangnet کی طرح گزر جاتی تھیں ——
A Tangnet in a Parabola یا ایک تیز روشنی کا جوڑ جاتے

پنجرے پر ٹنگا ہوا۔ ہمیشہ یہ روشنی کا خنجر جولی کے چہرے کے اوپر سے گزر جاتا تھا۔ اور وہ بے خبر شدید گہری نیند میں کھوئی ہوئی سوتی رہتی تھی۔ یہ خنجر بھی نیچے گہرا نہیں اترا۔ کیوں نہیں اترا اس کے دل کے اندر۔ روشنی بھی قتل کر سکتی ہے یا وہ محض کرن کی طرح، خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر، قتل نہیں کر سکا۔ نہ روشنی کی مدد سے نہ اندھیرے کی مدد سے، شاید میں بزدل ہوں، کنول نے سوچا۔

باہر کی روشنی کا ایک لہریہ جولی کے چہرے سے گزر گیا چند ثانیوں کے لئے جولی کا چہرہ روشنی میں چمک اٹھا پھر روشنی گزر گئی، مگر کنول کے ذہن میں وہ چہرہ ابھی تک اسی طرح چمک رہا تھا۔ کسی چھوٹے سے لڑکے کی جیب میں کانچ کے بنٹے کی طرح، اس نے جولی کے چہرے کو کانچ کے بنٹے کی طرح الٹ پلٹ کے دیکھا Perfect ...... مکمل چہرہ، یونانی اقسام کے کلاسکی خدوخال، حالانکہ جولی قطعاً یونانی نہیں تھی، اینگلو سیکسن تھی۔ اور اگر وہ زندہ نہ ہوتی، تو اس وقت بستر پر اسے یوں لیٹے دیکھ کر اس کے چہرے اور اس کے بدن کی مناسبت اور توازن پر غور کر کے یہی گمان ہوتا کہ یہ کوئی عورت نہیں ہے، کسی پرانے یونانی صنم گر کا شاہکار ہے، جلد سنگ مرمر کی طرح سپید اور اسی طرح ملائم، اور اتنی ہی سخت، کنول جولی کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ گوشت تو نرم ہوتا ہے اور گداز ہوتا ہے۔ مگر اس جلد کے اندر پتھر کی سختی کی لازوال صفت موجود ہے۔ جیسے جولی کی جلد نے اس کے دل کی کٹھورتا مستعار لے لی ہو لیکن خود [illegible]

میں اسکے چہرے نے اُسے بہکایا تھا۔ اُسی جسم نے، اسی بدن کے خطرناک خم اس کے ذہن کو ڈس گئے تھے۔ اُسے وہ رات یاد تھی، ہنری کوئک برن (Henry Quick Burn) نے وہ اپنی پینتیسویں سالگرہ پر اپنے فلیٹ میں مدعو کیا تھا۔ وہ سینٹ جارجیز ہسپتال میں نفسیاتی علاج (Psychiatrist) کے عہدے پر کام کرتا تھا اور اُسی ہسپتال میں کنول بھی پلاسٹک سرجری کے شعبہ کا ایک ڈاکٹر تھا، ہنری بہت خوبصورت اور وجیہہ تھا۔ اور ماہر نفسیات ہونے کی وجہ سے لندن کے اونچے اونچے گھروں تک اسکی رسائی تھی، اور خوبصورت اور کنوارا ہونے کی وجہ سے بہت سی عورتیں اسپر مرتی تھیں، ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے، اور بغیر وجہ کے آجکل کچھ نہیں ہوتا۔ محبت بھی نہیں ہوتی۔ آسمان بھی نظر نہیں آتا، گیت بھی سنائی نہیں دیتے، پھول بھی نہیں مہکتے، روٹی بھی نہیں ملتی۔ موت بھی نہیں آتی، اسکی وجہ کیا ہے؟ کنول نے سوچا۔ کہیں پر تو کوئی دنیا ایسی ہونی چاہیے جہاں سب کچھ بلا وجہ ہوتا ہو۔ دوستی بلا وجہ محبت بلا وجہ..... سورج پر انگلی رکھ دو، تو ٹھنڈی ملائم روشنی بارش کی پھوار کی طرح پھوٹ کر بہہ نکلے دل کو جلانے والی گرم روشنی نہیں۔ ٹھنڈی اور ملائم جیسے کبھی جولی کی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی۔ جانے اب جولی کو کیا ہو گیا ہے۔

سالگرہ کی اُسی شرابی پارٹی میں، ہنسی ٹھٹھول اور ہڑبونگ سے بھری بڑی پارٹی میں ہنری نے جولی سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ بالکل سرسری سا تعارف،

کیونکہ ان دنوں جولی ہنری کی خاص دوست تھی، وہ کسی صابن بنانے والی کمپنی کی
ماڈل گرل تھی۔ شیمپو کے اشتہاروں میں جولی کی تصویر وہ اکثر رسالوں میں دیکھ
چکا تھا۔ ان دنوں جولی کے بال واقعی خوبصورت تھے، وہ فرصت کے اوقات
میں فوٹوگرافروں کی ماڈل گرل بھی تھی۔ اب اس نے صابن بنانے والی کمپنی سے
منقطع کر دیا تھا اور فری لانس ماڈل ہو گئی تھی۔ فلموں میں بھی اسے کام ملنے لگا
تھا۔ ایک جگہ بھی اس کے پاس آ گئی تھی۔ کپڑوں کا وارڈروب بہت عمدہ رکھتی تھی
اس وقت وہ ایک یاقوت کی طرح جگمگا رہی تھی۔ کنول اسے پہلی نظر میں دیکھ کر
مبہوت ہو گیا تھا۔ مگر جولی تو، جبکہ اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ جولی نے اسے
ایسی نگاہ ڈالی تھی جیسے وہ انسان نہ ہو، ناگ پھنی کی جھاڑی ہو۔ اوپری سرسری
تضحیک اور حقارت سے جھلکتی ہوئی نگاہ۔ جولی کو رنگ کا بڑا لحاظ تھا۔ ہر وہ
جس کی جلد کا رنگ گورے سے سوا کچھ اور تھا، جولی کی نگاہ میں قابلِ ملامت تھا
تھوڑا سا فنی بھی Funny ..... گورے رنگ کے سوا اسے باقی سب رنگ
انسانی جلد پر Funny لگتے تھے۔ وہ ان سے نفرت تو نہیں کرتی۔ مگر یہ لوگ
واقعی قابلِ رحم ضرور ہیں۔ یہ ایشیائی کالے اور پیلے، بھورے اور مٹیالے زرد
زرد سبزی مائل اور کسی قدر نیلگوں رنگ۔ یہ سب رنگ دیواروں پر اچھے لگتے ہیں مگر
انسانی جلد پر Funny .... شاید خدا نے کسی مزاحیہ لمحے میں ان لوگوں کو پیدا
بنا دیا ہوگا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اسے بے اختیار ہنسی چھوٹ جاتی تھی کچھ تو

سے الگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب ایشیائی اور افریقی اور جنوبی امریکی، you know مجھے ایسی باتیں کہنا نہیں چاہیے۔ سنتا ہے ان لوگوں کو کہیں کہیں پر آزادی مل گئی ہے اور وہ اپنے اپنے ملکوں میں انکی کچھ اہمیت بھی ہے ۔۔۔ مگر مائی ڈیر just look at them! Look at them.....

ہا ہا ہا! جولی زور سے میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ اسے اس کے چاہنے والوں نے اپنے حلقے میں لے لیا تھا اور کاک ٹیل کے بلوریں جام آپس میں ٹکرا کر چیاؤں کے سروں کی طرح کھنکنے لگے۔ میرا چہرہ لال ہوا جا رہا تھا۔ شفق پھیلتی جا رہی ہے غصے کی آنکھوں میں سرخ بدلیاں جھلک رہی ہیں۔ سمجھتی کیا ہے یہ جولی۔ یہ سفید لڑکی۔ گورا نہیں ہوں تو کیا ہوا۔ اتنا کالا بھی نہیں ہوں۔ گیہواں رنگ ہے میرا۔ اور ناک نقشہ ہندی ہے اگر اچھا نہیں ہے تو برا بھی نہیں ہے بلکہ ہندی کے چہرے میں تو ایک عجب پرانے خاندانوں والی نزاکت ہے۔ اور میں چاہوں تو اب بھی دو انگریزوں کے سر توڑ سکتا ہوں۔ ابھی ابھی اتنے سے میری اور جولی کی نگاہیں ملتی ہیں دو دشمنوں کی طرح۔ نگاہوں میں خنجر کوند جاتے ہیں۔ تمہاری یہ نازک فانی گلاس کی کانچ کی ڈنڈی کی سی نازک گردن کو میں ایک جھٹکے سے توڑ سکتا ہوں۔ سسا جو پیار کروں۔ کنول کی نگاہوں کو جیسے کہ کسی مبہم خطرے کا احساس کر کے جولی ہنستے ہنستے یکبارگی رک جاتی ہے۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگتی ہے۔ اس کے چاہنے والوں کا حلقہ اسکے ساتھ ساتھ

پیش رہا ہے، گھٹے . . . . اب اگر اس وقت میرے ہاتھ میں ایک اسٹین گن ہوتی سبکو بھون ڈالتا . . . ایک ایک کو بھون ڈالتا۔ برف کی ڈلیوں پر سنہری وسکی کو پھسلتے دیکھ کر میں اپنے گلاس سے ایک گھونٹ پی کر مسکراتا ہوں۔ کنول پرساد نگینہ اس متمدن مہذب متمول اور بظاہر معاشی طور پر امیر اس پارٹی میں گھونٹے پی کر تم کیسی خوفناک باتیں سوچ رہے ہو۔ تمہارے چہرے کے بھولے بھالے زاویوں، ہونٹوں کی میٹھی مسکراہٹ، اور کپڑوں کی شریفانہ دھج سے کوئی سوچ سکتا ہے کہ تمہارے اندر کیا قاتلانہ جذبہ کھول رہا ہے۔ ایک فرشتے اور ایک قاتل میں بہت کم فرق ہے۔ صرف احساس کی ایک پرت کا، یا نگاہ کے ایک زاویے کا . . . . یا جذبے کی ایک دھار کا . . . . کتنی جلدی انسان بدل اور پلٹ سکتا ہے، اگر اسے اخلاق، سماج، نظامِ زندگی، تعلیم اور تہذیب کے شکنجوں سے باندھ کے نہ رکھا جائے، تو وہ جانور ہے، بالکل جانور ہے ابھی تک . . . . !

کنول کے جسم میں ایک ہلکی جھرجھری سی آئی، اس نے ایک گھونٹ اور لیا اور ایک پتلے بلیڈ کی طرح کمرے کی بھیڑ کو چیرتا ہوا جولی تک پہنچ گیا۔ اور اس سے کہنے لگا۔ "آپ کے لئے ایک ٹیلی فون کال ہے!" اور جب جولی اسکا شکریہ ادا کرکے دوسرے کمرے میں جانے لگی، جہاں ٹیلی فون رکھا تھا، تو وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیا، جولی کا سرسراتا ہوا لباس اس کے کانوں میں

میٹھی سرگوشیاں کر رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر جب جولی نے ٹیلی فون کے چونگے پر ہاتھ رکھا تو اس وقت تک کنول اسے اپنے بازوؤں میں لے چکا تھا!

اس نے آہستہ سے جولی سے کہا۔ "ٹیلی فون پر کوئی نہیں ہے!"

جولی اپنے آپ کو کنول کی باہوں میں پا کر ذرا سا ٹھٹھکی۔ پھر بھڑک کر کہنے لگی۔

"مجھے فوراً چھوڑ دو!"

"سنو۔ باہر سے موسیقی آ رہی ہے۔ اُن لوگوں نے ناچنا شروع کر دیا ہے۔ فرض کر لو کہ یہ میرے بدن کا کال ہے۔ کیا تم اسے سُن نہیں سکتی ہو۔ وہ ٹیلی فون جو ایک جسم سے دوسرے جسم تک جاتا ہے؟"

"میں ہمیشہ ریسیور نیچے پٹخ سکتی ہوں!"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر حقیقت استعارے سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ تم اس وقت میری باہوں میں ہو۔ میں تمہیں اپنی باہوں میں مسل سکتا ہوں۔ اگر تم چیخو گی تو اس وقت سب کے سامنے ایک عجیب و غریب منظر ہوگا!"

"تم چاہتے کیا ہو ۔۔۔؟"

"تمہارے ساتھ ایک ڈانس!"

"تو باہر چلو ۔۔۔!"

"باہر نہیں، یہیں، ہنری کے اسٹیڈی روم میں ۔۔۔۔ یہ جگہ بہت خاموش ہے!"

پرشے پڑے ہوئے ہیں، روشنیاں نیلگوں ہیں، "تم میری باہوں میں ہو۔!"

اُس نے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کیں۔ پھر جیسے اُس نے کوئی فیصلہ کرلیا۔ وہ باہر سے آنے والی موسیقی کی دھن پہ میری باہوں کے ہالے میں ناچنے لگی...... ٹھنڈی اور مسرور، مہری، اکاٹو کی پتلی، موسیقی کی ڈور سے بندھی میری باہوں میں ہل رہی تھی!

"ہیلو اکشن برگ!" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ کچھ نیلی، کچھ سبزی مائل آنکھیں۔ "میرے پاس ایسی ہی آنکھوں والی ایک بلی تھی ــــ" میں نے جولی سے کہا۔

جولی خاموش رہی!

"ہیری تم سے شادی نہیں کرے گا۔ تم اُس کی یاد ہو یا گرل فرینڈ ہو ــــ" میں نے اُسے بتایا!

وہ پھر بھی خاموش رہی!

"دس منٹ کا لمبا ریکارڈ ہے۔ میں نے خود ریکارڈ پلیئر پہ لگایا ہے۔ ایسا لمبا ڈانس خاموشی میں کیسے طے ہو گا؟ ــــ"

جولی ڈارلنگ۔ تمہارا اکاٹو کا سا ٹھنڈا بدن میری باہوں میں ایک بھالا سیپ کی طرح لگ رہا ہے۔ کچھ تو بولو۔ اندر سے چاہے نفرت کرتی رہو۔ باہر سے مسکراتی رہو۔ بس یہ دس منٹ کے لئے کسی دوسرے جذبے کا اظہار [illegible] کرو

دوسرا لباس تھا۔ دس منٹ کے بعد اُسے اُتار پھینکنا۔ مگر یہ دس منٹ تو میرے اپنے گزر جائیں گے۔ وہ خوبصورت جھوٹ جس کا نام تہذیب ہے۔ اُسے آخر اپنی طول کے لئے تو رکھا جاتا ہے۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ میں تم سے، تم سے نہیں، تمہارے اس اندھے جذبے سے، تمہارے بدن سے نہیں، تمہاری خوبصورتی سے نہیں، تمہاری جوانی سے نہیں، تمہارے بالوں کی مہک سے نہیں، تمہارے ڈولتے ہوئے حسن سے نہیں، تمہاری خالی کھوپڑی سے، جو ہر اُس انسان کو حقیر سمجھتی ہے۔ اپنے سے کمتر اور جاہل اور رذیل جس کا رنگ تم سے مختلف ہے، بظاہر — اس قسم کی کوئی بحث میرے اور تمہارے درمیان نہیں ہوئی۔ مگر میں نے تو وہ نگاہ بھی پڑھ لی۔ جو تم نے پہلی بار مجھ پر ڈالی۔ اور میں اُس نگاہ کی بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ آخر نگاہ بھی بولتی ہے۔ چہرے کا خم بولتا ہے، ماتھے کی شکن بولتی ہے۔ تمہارے بدن کا ہر بیزار کن ادا بولتی ہے۔ تم ضرور چاہتی ہو کہ یہ دس منٹ دو منٹ میں طے ہو جائیں۔ مگر یہ بہت مشکل ہے۔ ناممکن ہے۔ دس منٹ دس منٹوں میں ہی ختم ہوں گے۔ وقت کا ایک ثانیہ اپنی باری پر تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح مارچ پاسٹ کرے گا۔ ہر حرکت اپنی جگہ مخصوص اور اٹل ہے۔ وقت اس دھن کی لے کی طرح ہے۔ یہ لے کبھی نہیں بدلتی ... وقت کبھی نہیں بدلتا صرف وہ بدلتے ہیں، جن کو وہ چھوتا ہے۔ دیکھو! تم میری باہوں میں ہو، اور ہم دونوں وقت کی باہوں میں۔ دس منٹ کے بعد ہم دونوں دس منٹ اور بڑے

ہو جائیں گے۔ دس منٹ اور موت کے قریب۔ اس لئے یہ دس منٹ بھی کیوں غم اور
غصے میں گزاریں۔ آؤ، اگر مانو۔ بھول جاؤ، مسکراؤ، چلو مجھ سے الگ رہ کر محض ڈانس
کے ردھم ہی کا مزہ لو...... جیسے مصور محض رنگ، شاعر محض لفظ اور ڈاکٹر محض
عارضے کی کیفیت سے مزا لیتا ہے۔ تجریدی آرٹ کی بنیادیں یہیں سے شروع
ہوتی ہیں۔ اور خصوصی طبی مہارت کی بھی۔ یہ specialised میڈیسن بھی ایک
فن کا تجریدی آرٹ ہے۔ یعنی جگر کو گردے سے الگ رکھ کے دیکھو! ۔ تلی کو
پیٹ سے، پھیپھڑے کو دل سے، اور تمہیں مجھ سے۔ حالانکہ یہ سب اعضا الگ
الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور کسی ایک کا فعل اور عمل
دوسرے کے فعل اور عمل کو لئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ تم اور میں اس وقت ایک ہی
ڈانس کے ردھم سے بندھے ہوئے ہیں۔ اپنی تمام نفرتوں، محبتوں، پسند اور ناپسند
کے باوجود بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس رقص کے دائرے سے باہر تہذیب اور سماج
کی آنکھوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ کیا تمہیں ان باتوں میں کوئی شک ہے۔ تم جواب
کیوں نہیں دیتی ہو؟ یہ رویہ بالکل درست نہیں ہے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔
تم نے میرا مطلب ہے تمہاری بے پناہ خوبصورتی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہ ایک
چھوٹی سی چال چل کے تمہیں اپنے ساتھ رقص کرنے پر آمادہ کروں۔ ایک تو تمہاری
خوبصورتی، دوسری وہ بیزار کن احساس برتری والی نگاہ جو تم نے مجھ پر ڈالی۔
ڈالی کیا بھالا پھینکا۔ تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔ مجھ پر ایسی نگاہ پھینکنے کا ——

پھر تمہیں عورت کو اپنی ذمہ داری سے آگاہی ہونا چاہیئے۔ خصوصاً اُن تمام لوگوں کے لئے جو تمہارے ملک میں ایک مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ویسے اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی ہمیشہ سے ایک مشرقی صفت رہی ہے۔ مغرب اس میدان میں ایک مبتدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اس میں مغرب کا بھی اتنا قصور نہیں ہے جس قدر نانن لی کے الفاظ میں مغرب کے جغرافیہ، وہاں کی آب و ہوا، اور وہاں کے سخت گیر ماحول کا ہے۔ چلو یہ بات نانن لی نے نہیں کہی۔ میں نے کہی ہے، میں نے بھی خود سے نہیں کہی۔ کسی سے سُن کر کہی ہے۔ مگر اس فرق سے اس امر کی سچائی اور حقیقت میں کیا فرق پڑتا ہے اور اگر پڑے بھی تو تمہیں اور مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ اکیلا کمرہ، یہ جگنوؤں روشنی، یہ دھیما دھیما رقص، یہ تمہارا مکمل چہرہ، میری آنکھوں کے سامنے، اور یہ ایک ردھم (Rhythm) جیسے دو مل کر مکمل کرتے ہیں۔ کیا تم جانتی ہو کہ ایک سے کچھ نہیں ہوتا۔ ایک معمولی ردھم بھی دو سے مکمل ہوتا ہے۔ کیا تم دو کی اہمیت سے واقف ہو۔ چونکہ تم مجھے کنول کہہ سکتی ہو۔ پورا نام کنول پرساد سکسینہ ہے۔ مگر تمہیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کنول آسان ہے۔ یہ فوراً زبان پر چڑھ جاتا ہے۔ پرساد تمہارے لئے ذرا مشکل رہے گا۔ لیکن اگر کوشش کرو گی، تو مجھے تین مہینے میں رٹ کر یاد کر لو گی۔ سکسینہ پھر ذرا آسان ہے۔ اگر تم یہ سمجھ لو کہ سکسینہ میں Sex آتا ہے۔ Sex اینہ۔ آسان ہے نا؟ کیا تم نے واقعی نہ پڑھنے کا ارادہ کر لیا ہے، زندگی بھر نہ پڑھو گی؟

جونی نے کچھ نہ کہا۔ اُس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں اور ۔ اور پھر ایک دفعہ کی چیخ ماری ۔۔۔۔۔۔!

ایک لمبی، لمبی، لمبی چیخ۔ پتنگ کے دھاگے کی طرح دور تک کھنچتی ہوئی، جسم و جان کی پوری طاقت لگا کر اپنی آواز کی پوری قوت ـــ استعمال کر کے گلے سے باہر دھکیلی ہوئی چیخ کنول پر پھٹ پڑی۔ ایک تیر سا تک پہنچا۔ آواز کی حدوں کو توڑتی ہوئی اُس کے اردگرد لہرائے اور بھنور سے بناتی ہوئی جیسے وہ اُس میں ڈوبتا جا رہا ہو۔

پھر یکایک اُس کے گال پر زور کا ایک گھونسہ پڑا۔ اور جب وہ چونک کر پیچھے ہٹا، تو اُس نے دیکھا کہ تین انگریز اس کے سامنے کھڑے غصے سے اُسے گھور رہے ہیں!

"ڈرٹی نگر ـــ (Dirty Nigger)!"

"ہنڈو نیٹو ـــ (Hindu Native)!"

"بلاسٹ ہم ۔۔۔ یہ بلیکی میری وائف کے ساتھ ڈانس کر رہا ہے!"

"تمہاری وائف؟" پہلا انگریز حیرت سے بولا۔ "یہ تو میری وائف ہے!"

"تمہاری وائف؟" دوسرے انگریز نے پہلے انگریز کی طرف دیکھ کر تعجب سے کہا۔ "یہ تو میری وائف ہے!"

تیسرا انگریز پہلے دو انگریزوں سے کہنے لگا۔ "آپ دونوں ضرور کسی بھاری غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ جونی درحقیقت میری بیوی ہے ـــ!"

وہ تینوں حیرت اور حماقت کے مجسمے بنے ہوئے جونی کو تک رہے تھے، جو [illegible]

گی گئی ہانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپید ہو گیا تھا۔ لیکن رخساروں پر غم اور غصے کے دو شعلے بھڑک رہے تھے!

پھر اُن تینوں انگریزوں کی نظریں جولی سے ہٹ کر کنول پر جم گئیں۔ کنول نے گھونسہ کھانے کے باوجود مسکرانے کی کوشش کی۔ اور اپنے جام کو اوپر اٹھا کر کہا: "Cheers"

اُن تینوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ ان کے گلاس بھی ان کے ہاتھ میں تھے۔ یہ انگریز جب چاہتے ہیں۔ بلا وجہ بدتمیز بھی ہو سکتے ہیں!

"یہ بلڈی انڈین کیا کر رہا ہے یہاں۔۔۔؟"

"یہ معلوم کرنے سے پہلے آپ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جولی آپ تینوں میں سے کس کی بیوی ہے؟ بہتر ہوگا کہ آپ لوگ ٹاس کر لیں۔۔۔!"

اُن لوگوں کی نظریں کنول سے ہٹ کر جولی پر ٹھٹھک گئیں۔ وہاں سے ہٹ کر کنول پر۔ کنول سے ہٹ کر وہ تینوں انگریز پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اب وہ تینوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کر رہے تھے۔۔۔!

"پہلے اسے باہر پھینک دینا چاہیئے" ایک انگریز نے مشورہ دیا۔
باقی دو نے سر ہلا کے اس تجویز کی تائید کی!

اب وہ تینوں کنول کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کنول نے سوچا۔ انگریزوں میں

تو بھی کچھ بہت زیادہ ہے۔ اور اسکی یہ ادا مجھے بہت زیادہ پسند ہے۔ اسی خصوصیت
نے غالباً انہیں کامیاب سامراج تعمیر کرنے میں بھی مدد کی ہوگی۔ اب اگر یہ لوگ بجائے
ہندوستانی تو اس وقت ان تینوں میں جوتی کے لئے جوتا چل گیا ہوتا۔ مگر یہ تینوں انگریز
تھے اور جوتی پر جھگڑا کرنے سے پہلے مجھے باہر پھینکنے کے لئے میری طرف بڑھ رہے تھے۔
مجھے تان کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کیونکہ میں بھی خاصہ تگڑا تھا اور لڑنے
مقابلے کے لئے تیار تھا۔ مگر میں دو کے لئے تیار تھا۔ اور وہ تین تھے۔ لڑائی تو بہت
اچھی ہوئی اور جم کے ہوئی۔ ہنری کی اسٹیڈی کا بہت سا سامان ٹوٹ پھوٹ گیا۔
ایک انگریز کے گلے میں ایک تصویر کا فریم ہار کی طرح لٹک رہا تھا۔ دوسرے کے سر
پر میں نے ہنری کا نیلا لیمپ شیڈ ایک کجے دار ٹوپ کی طرح پہنا دیا تھا۔ خود میرے
رخسار پر ایک لال لکیر تھی جو ایک انگریز نے ڈاک کے لفافے کھولنے والی کند چھری
کی مدد سے پیدا کی تھی۔ وہ تو میرے رخسار پھاڑ دینا چاہتا تھا۔ مگر آج کل لفافے
کھولنے والی چھری لوہے سے نہیں پلاسٹک سے بنتی ہیں۔ اور پلاسٹک میں وہ بات
کہاں جو لوہے میں ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے میری جان بچالی اور اس بات نے
بھی کہ ہنری کی اسٹیڈی میں کوئی زیادہ خطرناک سامان نہیں تھا۔ بالعموم ماہر
نفسیات اپنی اسٹیڈی میں ایسی اشیاء نہیں رکھتے جو ان کے پاگل یا نیم پاگل مریض
ڈاکٹر کے خلاف استعمال کر سکیں۔ پھر بھی اچھی عمدہ صاف اور ستھری لڑائی ہوئی۔
کیونکہ ہم چاروں کھاتے پیتے عمدہ صحت والے تگڑے نوجوان تھے اور چار پانچ

پھیک اندر جا چکے تھے۔ اور لڑکی جس کے لئے ہم سب باؤلے کتوں کی طرح لڑ رہے تھے۔۔
سامنے دیوار سے لگی سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ جیسے یہ بیسویں صدی کا کوئی کمرہ نہ ہو۔
آج سے پچاس ہزار برس پہلے کا کوئی پہاڑی غار ہو۔ ہم لوگ ریچھ کی کھال پہنے
ہوئے ہیں اور شیکسپیئر کو پیدا ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ پہلے تو میں نے
Reproduction کی کوشش کی کہ جب عظیم تعداد میں زیادہ ہو اور —
Manoeuvring کی گنجائش کم ہو تو یہی طریقہ سود مند رہتا ہے۔ مگر کھجوتوں نے
دروازہ بھی اندر سے بند کر لیا تھا۔ اس لئے جو کر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ کچھ
عرصے تک تو مقابلہ برابر کا رہا۔ بلکہ شروع شروع میں میرے چوٹیں زیادہ آئیں اور وہ
لوگ میری مدافعت پر کچھ حیران بھی ہوئے۔ غیروں پر حکومت کرنے کی عادت کتنی
بے خبر ہو جاتی ہے۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ ادھر انہوں نے مکا دکھایا۔ ادھر
میں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ مجھے ان کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا کہ ایک ہندوستانی
بھی اور ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی عمدہ مکے باز ہو سکتا ہے۔ بہر حال تین میں اور ایک
ایک ہے۔ کچھ عرصے کے بعد تین افراد کی اور ایک کی [illegible] آنے لگی۔ پہلے
تو کنول لڑکھڑانے لگا۔ پھر بچکار گرنے لگا۔ پھر گر کر اٹھنے لگا۔ پھر بالکل آخر میں
اپنے گھٹنوں پر ہو گیا۔ وہ لوگ اوپر سے مکے اور نیچے سے ٹھوکریں مار رہے تھے۔
پھر جیسے کسی نے کنول کی آنکھوں میں سیاہی انڈیل دی۔ اور وہ تاریکی میں کھو گیا۔

جولی نے بستر پر لیٹے لیٹے اس کی طرف کروٹ لے لی۔ وہ ابھی تک گہری نیند میں تھی۔ مگر اس گہری نیند میں بھی اس کے ہاتھ کنول کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ایسی گہری نیند میں بھی وہ اس سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ سے کنول نے اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف سرکا دیا۔ جولی کی نیند میں ڈوبی ہوئی انگلیاں کنول کی انگلیوں پر سرکنے لگیں۔ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جیسے پالتو کبوتر پر تھپکی اور پیار اور شفقت کا ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ کنول کے دل میں بیزاری کی ایک لہر اٹھی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور بغیر کسی حس و حرکت کے اپنا ہاتھ جولی کے ہاتھ میں سونپ دیا۔ بستر پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔۔۔

ایک بڑا گنبد۔ ایک بہت بڑا گنبد جس کے اندر وہ بند تھا۔ اس گنبد کے اندر

چاروں طرف اوپر نیچے، فرش، چھت اور اُس کی دیواروں پر گھومتا تھا مگر اسے کہیں باہر جانے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ کدو اندر سے چپچپا اور گیلا اور گودے دار تھا اور کدو کے اندر گھومنے سے اس کے سارے جسم پر لعاب لگ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بار بار اسی کدو سے باہر نکلنے کی کوشش میں اندر کی دیواروں پر چلتے چلتے پھسل کر کدو کے فرش پر گر جاتا تھا۔ اور ایک عجیب گیلی گیلی مرطوب دشمن خوشبو اس پر چاروں طرف سے گھیرا ڈالتی ہوئی اسے ڈس رہی تھی۔ اس کے سارے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ سارے جسم کا زور لگا کر کدو کے گودے میں گھس گیا۔ اس کا سانس بند ہوا جا رہا تھا۔ پھیپھڑے پھٹ پڑنے کے لئے تیار تھے یکایک وہ کدو سے باہر نکل آیا.....!

ایک لمبی سانس لے کر اس نے جو آنکھیں کھولیں، تو وہ سینٹ جارج ہسپتال کے ایک بستر پر تھا۔ اس کے سارے جسم پر پٹیاں بندھی تھیں۔ اور اس کے سرہانے قریب ایک کرسی پر جھکا ہوا ہنری ہیرن اُسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کنول کو ہوش میں آتے دیکھ کر وہ آہستہ سے مسکرایا۔

بولا "کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ تمہارا جسم بہت مضبوط نکلا۔ چھ سات دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے!"

کنول نے آنکھیں بند کر کے جب اپنے اندر کے جسم کا جائزہ لیا۔ یہ بالکل ممکن ہے۔ کسی ایکسرے کے بغیر اپنے اندر کے بدن کا جائزہ لینا۔ دماغ

کے اندر کوئی ایک ایسا پیرو میٹر لگا ہوتا ہے جس سے ہر انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کی حالت کیا ہے؟ کنول نے آنکھیں بند کر کے اس پیرومیٹر کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ پھر جب اسے اطمینان ہو گیا۔ تو اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں، اور ہنری کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا ــــ!

"درحقیقت میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" ہنری نے اس کے بستر کی چادر کی ایک شکن کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "میں جولی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ تم عین وقت پر میری مدد کو آگئے۔ حالانکہ میں نے یوں نہ سوچا تھا۔ میری اسکیم دوسری ہی تھی۔ مگر تمہاری مداخلت عمدہ رہی۔ بہت عمدہ رہی ــــ!

وہ چپ ہو گیا۔ کنول سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جولی چاہتی تھی کہ میں شادی کر لوں اس سے۔" قدرے توقف کے بعد ہنری اپنی چھنگلیا کی پور کے ناخن کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور میں ابھی شادی کے لئے تیار نہ تھا!"

وہ پھر چپ ہو گیا۔ اس نے ناخن کے مطالعہ کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ اور اس دلکش انداز میں مسکرایا جس پر عورتیں مرتی ہیں۔ "جولیا کراس ایک ہی قسم کی عورت ہے۔ وہ اپنے حسن کی قوت، دائرۂ اثر اور اس کی مار سے بخوبی واقف ہے۔ اس نے تین مختلف آدمیوں سے شادی کر رکھی ہے۔ اور ہر مرد کو مجبور کر رکھا ہے کہ وہ اس شادی کو خفیہ رکھے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"بالکل ممکن ہے۔ پہلی شادی اس نے رچرڈ اسٹوکرافٹ سے کی جبکہ رچرڈ نے سب سے زیادہ جو صدمات تمہیں پہنچائیں، کبھی وہ ایک عمدہ باکسر بھی تھا۔ دوسری شادی اس نے تھامس میک فارلین سے کی۔ یہ وہ آدمی تھا جس نے تمہارے رخساروں کو ڈاک کھولنے والی چھری سے پھاڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ تیسری شادی اس نے قاہرہ میں کی، جیمس کلفٹ سے جس نے تمہیں سب سے زیادہ ٹھوکریں ماریں۔ جیمس کلفٹ اور جولی دونوں نے مسلمان ہو کر یہ شادی کی تھی۔ مگر یہ شادی بھی انگلینڈ میں خفیہ رکھی گئی۔ اور یہ شادی پچھلی دونوں شادیوں کی نفی کرتی ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد جولیا کا اس نے جیمس کلفٹ سے ایک جعلی حلف نامہ پر دستخط لے لئے تھے۔ تاکہ جیمس کلفٹ کبھی اس پر زیادہ حق جتائے تو وہ فوراً اس سے الگ ہو جائے!"

"مگر کیا وہ ان میں سے کسی کے پاس نہیں رہتی تھی!" کنول کی حیرت بڑھنے لگی۔

"جولی ایک ابھرتی ہوئی فلمی اداکارہ ہے۔ مشہور و معروف ماڈل گرل ہے۔ بہت مصروف رہتی ہے۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ لندن میں اس کے تین گھر تھے۔ دو سال سے وہ وہاں زیادہ رہی تھی۔ اس کی جدت شیخ چالاکی اور ہوشیاری کی داد دینا پڑتی ہے۔ کہ جب وہ ایک شوہر کے پاس رہتی تھی تو دوسرے دو

شوہروں کے لئے فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہوتی اور جب وہ دوسرے کے ہاں جاتی تو پہلے دونوں کے لئے وہ کسی صابن کمپنی یا بسکٹ کمپنی کے اشتہاروں کی Assignment پر دن رات کام میں مشغول ہوتی۔ پھر وہ تینوں سے اینٹھ لیتی۔ مجھے کنوارا اور متمول اور دولت مند ماہر نفسیات سمجھ کر وہ میرے ساتھ بھی یہی چالاکی چلنا چاہتی تھی۔ اور شروع کے چند ماہ تو میں اس کی مسحور کن اور دلفریب باتوں کے پھندے میں گرفتار رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا حسن میرے لئے باسی پڑنے لگا۔ یہ میری ٹریجڈی ہے۔ عورت کا حسن بہت جلد میرے لئے باسی ہو جاتا ہے اور میں اس کے جال سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر اس سے شادی کا وعدہ کر چکا تھا۔ اب میں الجھن سے نکلوں تو کیسے نکلوں۔ اتفاق سے مجھے اس کا بھید معلوم ہو گیا۔ اور میں نے اس کے تینوں شوہروں کو اس دعوت پر مدعو کر لیا۔ خیال تھا تینوں کو ٹکرا دوں گا اور بیوی کا راز فاش ہو جائے گا۔ مگر تینوں میں آن پہنچے۔ بلکہ ایک ہندوستانی فلم کی طرح بینگ مار کر اندر آن گھسے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میری اس اسکیم میں تمہارا داخلہ بہت شاندار رہا۔ میں جوئی کے چنگل سے آزاد ہو گیا۔

"اور میری جو بڑی پسلی ایک ٹوٹ گئی؟"

"گھبراؤ نہیں۔ آٹھ دس دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے۔" ہنری نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔ اس وقت ایک ایسے کھوتی انگریز کو وقت دے رکھا ہے۔ جسے ہر شگوار کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ اس کا

بنا ہوا ہے۔" ہنری نے چلتے چلتے کہا۔

"کاش میں بھی پلاسٹک کا بنا ہوتا تو اس وقت مجھے دس روز کے لئے بستر پر تو لیٹنا پڑتا۔" کنول نے ہنری سے کہا اور جب ہنری چلا گیا تو اور میسز عمر کی انجینس جو اس کی نرس تھی اپنے دونوں ہاتھوں میں پھولوں کا ایک بہت بڑا گلدستہ لئے ہوئے اندر آئی۔ اور میرے سرہانے اس نے وہ پھول رکھ دیئے!

میں نے پھولوں کے ساتھ بھیجا ہوا کارڈ پڑھا۔ اس پر ایک سوال درج تھا

? How many bones نیچے جولیا کریمی کے دستخط تھے!

میں نے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے گلدستے کو پرے کر دیا۔ گلدستہ بستر سے روٹھا ہوا فرش پر جا گرا۔ انجینس غصے سے میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ کنول نے جولیا کی طرف دیکھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس گلدستے کے سوال کی تضحیک اس وقت بھی جولیا کے چہرے پر نمودار ہے۔ جیسے نیند میں اس وقت بھی اتنے برسوں کے بعد وہ اس پر ہنس رہی ہے۔ کنول جولیا کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کے ایک تھپڑ زور کا جولیا کے گال پر دینا چاہتا تھا۔ مگر بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو روکا۔ اس کی آزادی میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہو جائے وہ ماضی کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہتا تھا۔ کہیں اس کے فیصلے میں کوئی غلطی نہ رہ جائے!

دس دن کے بجائے اُسے بیس روز بستر پر رہنا پڑا تھا۔ آخر وہ ٹھیک ہو گیا

بچارے کام میں لگ گیا تھا۔ کنول بہت ہونہار۔ پلاسٹک سرجن تھا۔ اُس بنگلے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سینٹ جارج کے ہسپتال کے لئے اس کی خدمات بیش قیمت تھیں۔ اسی لئے وہ نکالا نہیں گیا تھا بلکہ سب لوگ اُس سے ہمدردی جتانے اس کے پاس آتے تھے۔ اب ہوتا وہ کوئی معمولی سرجن تو ایک دن گندہ اور (Redundant) کہہ کر اُسے ہسپتال سے الگ کر دیا گیا ہوتا۔ مگر ابھی ہسپتال کو اس کی ضرورت تھی۔ اور ضرورت بھی کیا چیز ہے؟ ضرورت ہو تو رنگ، نسل، مذہب، تعصب، ذاتی پسند اور ناپسند کا ہر جذبہ دبا دیا جاتا ہے اور اس جذبے کو دبا دینے کے لئے مختلف خوبصورت ناموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لفظ جیسے انسانیت، لفظ جیسے مساوات، لفظ جیسے رواداری، حق شناسی، وسیع النظری اور جانے کیسے کیسے خوبصورت نام، حسین الفاظ اور دلکش فلسفے اس بنیادی ضرورت پر غلاف چڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس دنیا میں جتنے خوبصورت جذبے یا چیزیں ہیں وہ ضرورتوں کی کٹھ پتلیاں ہیں!

پھر ایک دن ہسپتال میں ہی وہ مجھ سے ملنے کے لئے آ گئی۔ اس دن وہ ہلکے پیلے رنگ کے فراک میں وہ زرد گلاب کا ایک پھول معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کی نگاہوں میں اور اس کے جسم میں تیز نشتر کے کانٹے تھے۔ جب وہ کمرے میں آئی۔ تو ایک دھار دار خنجر کی طرح سرسرا رہی تھی!

"کیا تم نے پولیس کو مطلع کر دیا ہے؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

"ثابت کر سکو گے؟"

"یہی کہ میرے تین خاوند ہیں۔ اگر تم ثابت کر سکو تو میں سیدھی جیل جا سکتی ہوں!"

"اول تو مجھے تمہاری جیسی خوبصورت عورت کو جیل پہنچانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے پھر مجھے یہ بات بڑی بہت دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہوئی کہ لندن میں ایک عورت ایسی بھی ہے، جو مردوں کو اسی طرح دھوکا دے سکتی ہے جس طرح مرد عورتوں کو دیتے ہیں۔ تمہاری دیدہ دلیری مجھے پسند آئی۔ اس لئے پولیس میں جانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا!"

"تو شائد تم ان تین شوہروں کے خلاف رپورٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو جنہوں نے تمہیں پیٹا تھا---!"

"ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔ البتہ میں اُن تینوں کی اچھا م جانے پر الگ الگ پیٹنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ایک وفادار بیوی ہونے کی حیثیت سے تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"اس کے برعکس، مجھے تو خوشی ہوگی۔ اگر تم ان تینوں کی ہڈیاں توڑ سکو۔ اور وہ تمہیں ختم کر سکیں۔ تم چاروں نے اُس دن میرے لئے جو جنجال کھڑا کیا ہے۔ اُس سے مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے!"

"کیوں---؟"

"اُس دن میرا سارا بھید کھل گیا۔ اور وہ تینوں مجھ پر دعوے کرنے لگے ہیں

سوچ رہے ہیں!"

"اور ہنری نے۔۔۔؟"

"ہنری نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔" وہ ہونٹ چبا کر بولی۔ "مگر میں ایک مکمل اجنبی سے ایسے کیوں بات کر رہی ہوں؟"

"کیونکہ میں تمہارا چوتھا شوہر ہونے جا رہا ہوں!"

"شٹ اپ!" وہ غصے میں کھولتی ہوئی بولی۔ "کوئی کالا آدمی میرا شوہر نہیں ہو سکتا!"

"پھر تم مجھ سے ملنے کیلئے کیوں آئی ہو؟ خیریت پوچھنے یا یہ معلوم کرنے کہ میں پولیس میں جا رہا ہوں کہ نہیں۔۔۔۔ فرض کرو کہ میں پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتا ہوں!"

"میں تمہاری اس خواہش کو خریدنا چاہتی ہوں۔ کیا لو گے؟"

"تمہیں۔۔۔!"

"تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اور مجھے یہ کہنا بھی نہ چاہیئے۔ مگر کیا کروں۔ شاید یہ میرے خون میں ہے کہ مجھے رنگدار لوگوں کو دیکھ کر عجیب طرح کی کراہیت کا احساس ہوتا ہے۔ جب میں اس دن تمہاری بانہوں میں تھی۔ تو جی چاہتا تھا تم پر تھوک دوں!"

"شکریہ۔۔۔!"

"اس لئے تم صرف کی بات کرو۔ میں تمہیں روپے دے سکتی ہوں! تمہاری

خاموشی خریدنے کے لئے پانچ سو ڈالر دے سکتی ہوں۔!"

"بہت کم ہیں۔۔۔!"

"اس سے زیادہ کی۔۔" وہ رک گئی۔ ایک لمبے وقفے کے بعد بولی۔ "چلو۔۔۔۔ میں کہیں نہ کہیں سے ڈیڑھ سو ڈالر اور کر دوں گی!"

"میں ایک لاکھ ڈالر لوں گا۔۔۔!"

"پاگل ہو گئے ہو۔۔۔؟"

"ایک لاکھ ڈالر تمہارے جیسی خوبصورت گدبدن شعلہ رخ عورت کے عوض میں بہت کم مانگے ہیں میں نے!"

"ایک لاکھ ڈالر میں کہاں سے دے سکتی ہوں۔۔۔؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں۔۔۔!"

"پھر کیوں مانگتے ہو۔۔۔؟"

"میں نے مانگا۔۔۔ یہ شروعات تم نے چھیڑی ہے۔ تم میری خاموشی کی قیمت ادا کرنا چاہتی ہو۔ میں نے اپنی قیمت بتا دی۔۔۔!"

"کم نہیں کرو گے؟" وہ میری طرف دیکھ کر کچھ عاجزی، کچھ مجبوری، کچھ غصے سے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر اس وقت امید و بیم کی کشمکش چل رہی تھی!

"ایک ہزار ڈالر کم کر دوں گا۔۔۔!"

"مذاق کرتے ہو؟"

"تو وہ تھوڑا کم ہی سہی...!"

"تمہیں آٹھ سو پونڈ سے زیادہ نہیں دے سکتی۔ یہ آخری آفر ہے!"

"اپنے اس بھی مسٹر پرورش کا احسان جتاتی ہے؟"

"میں تمہارا گلا گھونٹ سکتی ہوں!"

"شوق سے آگے بڑھئے!"

"ڈارلنگ گرل...!"

"نوبل گرل...!"

"کیوں نہیں، اس ترکیب سے تو ہماری جان جائے گی؟"

"ٹھیک ہے بے بی۔ مذاق ختم ہو چکا۔ میں نہ تمہارا جو تھا شوہر بننا چاہتا ہوں، نہ تم سے ایک ہزار یا ایک سو پونڈ لینا چاہتا ہوں۔ نہ پولیس میں جانا چاہتا ہوں۔ آپ اطمینان سے جا سکتی ہیں۔ بس چولی کرا دیجئے!"

اُس نے میری طرف گہری آتش بار نگاہوں سے دیکھا۔ پھر کچھ کہے بغیر مڑ کر باہر نکل گئی۔ مگر اس کی آنکھوں میں بے انتہا نفرت تھی۔ جیسے وہ اس احسان کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر مجبور تھی اور اس مجبوری کی بنا پر اسکی نفرت مجھ سے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مجھے اس کے اس عمل پر کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ میں نے خود اپنی زندگی میں یہی کیا ہے۔ جب کسی نے مجھ پر کوئی احسان کیا ہے۔ میں دل ہی دل میں اُسے ناپسند کرنے لگا ہوں۔ شاید مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی بھی میرے لئے

اس حیثیت میں ہو کہ مجھ پر کوئی احسان کر سکے۔ خود احسان کرنے والے کے دل میں ایک
عجیب صفت چھپی رہتی ہے جیسے احسان کر کے اس کا چہرہ تمتما رہا ہو۔۔۔ دیکھا۔
جس کام کو تم اپنے لئے نہ کر سکے، وہ ہم نے تمہارے لئے کر دیا۔ اب جھکا دو اپنے
کندھے۔ اور گرا دو اپنے ہاتھ زمین پر۔ اور جھک کر چلو ایک گدھے کی طرح۔
تاکہ ہم اپنے احسان کا بوجھ تمہاری پیٹھ پر لاد کر چلیں!

ظاہر ہے کوئی شریف آدمی گدھا بننا پسند نہیں کرتا!

سہ پہر میں ہنری میرے پاس آیا!

"جولی آئی تھی۔۔۔؟" اس نے پوچھا

"ہاں!"

"پھر!"

پھر میں نے اسے پوری بات بتا دی۔ سن کر ہنری نے بڑے تعجب سے سر ہلا دیا

"تم نے بیکار میں اپنی مشرقی نیکی کا ثبوت دیا! اُس سے روپے لے لئے ہوتے!"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔۔!

"تم اُس سے محبت کرنے لگے ہو!"

"بالکل نہیں!"

"پھر اس قدر فرشتہ بننے کی کیا ضرورت تھی۔ آٹھ سو پونڈ؟"

میں چپ رہا۔!

وہ بولا۔ "اُس کے تینوں خاوند اپنے سالیسٹروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔ اب تمہیں ایک پیسہ نہیں ملے گا۔!"

"نہ ملے۔!"

"جول لندن چھوڑ کر کہیں چلی گئی ہے۔ اسے کہیں سے شاید خبر مل گئی ہوگی۔" ہنری کوٹنگ ہرٹن نے مجھے بتایا۔ پھر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے منہ میں پائپ کو ٹھیک کرتا ہوا بولا۔ "وہ زر پرست لڑکی اس وقت تمہارے قابو میں تھی۔ تم نے اُسے کیوں جانے دیا۔ احمق؟ — تم ایک گاڑی خرید سکتے تھے۔!"

"ہمارے یہاں خوشحال کسان اپنی بھینسوں کو سونے کی ہنسلی پہناتے ہیں!"

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔ "یہ بات کیا ہوئی؟"

"تم نہیں سمجھو گے...... یہ مشرق اور مغرب کا فرق ہے!"

"Fiddlesticks!" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اور کمرے سے باہر جاتے ہوئے بکنے لگا۔ guess so — well so long اگر یہ معاملہ اخباروں میں پہنچ گیا۔ تو شاید مجھے بھی سینٹ جارج سے جانا پڑے گا۔" اتنا کہہ کر اس نے پائپ سے ایک گہرا کش لیا۔ اور بے آواز قدموں سے باہر چلا گیا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میرے ہونٹوں کے اندر سبز رنگ کا ایک پائپ سلگ رہا تھا۔

جس کا رنگ بہتے ہوئے زردی مائل ہوتا جا رہا تھا۔ پائپ اب پھیل کر ایک فراک بن گیا تھا۔ فراک میں زرد پھول کھل گئے تھے!

جولی کو لندن سے غائب ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے، کہ ایک روز ہنری نے تھامس ہیک فارمین کو ٹیلی فون کیا۔

"ہیلو، ٹام — مجھے افسوس ہے تمہیں ایک بہت بُری خبر سنا رہا ہوں!"

"جلدی کہو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ باس کا بُلاوا آیا ہے!"

ہیک فارمین یورپ اور امریکہ کی مشہور "ریڈ انیفش باتھو کیمیکس" دوائیں بنانے والی کمپنی میں ایک ایگزیکٹیو ڈائریکٹر تھا۔ اور ہنری کو ذرہ برابر پسند بھی نہیں کرتا تھا۔

"ہنری بولا: میں چاہتا ہوں تم آکر جولی سے مل لو!"

"جولی؟ — کہاں ہے جولی؟ —" ٹیلی فون کے دوسرے سرے پر ٹام نے شدید بیزاری کے لہجے میں درشتی سے کہا۔

"ہمارے اسپتال میں —!"

"اسپتال میں؟"

"جولی ایک موٹر ایکسیڈنٹ میں شدید طور پر زخمی ہو گئی ہے۔ وہ موٹر دوڑ کی
ریس میں حصہ لینے والے مشہور موٹر باز ہیری ایرنڈیل کی اسپورٹس کار میں لندن
سے باہر جا رہی تھی۔ ہیری کو تم جانتے ہو گے۔ نام تو سُنا ہو گا۔ اس کے لئے ا
نوّے میل کی رفتار سے چلانا ایسا ہی ہے، جیسے ہم سلو ڈرائیونگ کہتے ہیں۔ اس
ایکسیڈنٹ میں ہیری تو مر گیا ہے۔ اس کی لاش سینٹ جارج میں پڑی ہے۔ مگر جولی
کے بچنے کی بھی کم اُمید ہے۔ اس لئے ......!"

ہنری ابھی کچھ کہہ ہی رہا تھا۔ کہ اُدھر سے میک فارلین نے ریسیور رکھ دیا۔

"ہلو۔ ہلو۔ ہلو۔" کہہ کر ہنری نے دو تین بار پکارا۔ پھر اُس نے جیمس کلفورڈ کو
ٹیلی فون کیا —!

"ہلو جیمز۔ میں ہنری بول رہا ہوں!"

"کون ہنری؟"

"جولی کا دوست!"

چند لمحوں کا سناٹا۔ پھر ٹیلی فون پر گالیوں کی ایک تیز تیکھی بوچھار۔
ہنری کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ بڑے مزے سے وہ گالیاں سنتا رہا جیسے
کان میں شہد گھل رہا ہو۔ جب بوچھار چند لمحوں کے لئے رکی۔ تو اُس نے کہا

"جم اس وقت کیا کر رہے ہو؟"

"برانڈی پی رہا ہوں!"

"کیا تم پانچ دس منٹ کے لئے بھی نہیں آسکتے۔ جولی چند گھنٹوں کے بعد ممکن ہے زندہ نہ رہے۔ ہم سب اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ موٹر کے ایک حادثے میں شدید طور پر زخمی ہو چکی ہے۔ کچھ بھی کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔ یا رہ چکی ہے۔ اور تم ایک مشہور انگریز مصنف ہو۔ اپنے ملک سے باہر یورپ میں تمہیں انگریزی کلچر کا بہترین نمائندہ مانا جاتا ہے۔ اور۔۔۔۔!"

"یہ بکواس بند کرو۔ میں جولی کے لئے اب کوئی نہیں۔ وہ میرے لئے اب کچھ نہیں۔ میں نے سب کچھ کیا اس لڑکی کے لئے۔ قاہرہ جا کے مسلمان ہو کے اس سے شادی کی۔ میں احمق تھا نمبر ون کا۔۔۔۔۔۔ مجھے برانڈی پینے دو اس وقت۔ جولی کی یاد مت دلاؤ۔۔۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، وہ مر چکی ہے۔ میں۔۔۔!"

"سنو جم۔ اُسے اس وقت مدد کی ضرورت ہے۔ پانچ فیصدی چانس ہے وہ بچ جائے۔ اس وقت اسے مدد چاہئے۔ نفسیاتی مدد۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اور دونوں بازو۔ اور گلے کی ہڈی۔ اور جسم پر بے شمار زخم ہیں۔ وہ اس وقت بالکل میری کی شکستہ اسپورٹس کار کی طرح ہے۔۔۔۔ جم آؤ۔ اس کا ہاتھ پکڑ لو۔۔۔!"

"تم خود اس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھو۔ بہتر ہے۔۔۔ میں تو آج شام کے ہوائی جہاز سے

اسپریکل جا رہا ہوں۔ اپنے نئے ناول کا مواد ڈھونڈنے ..... بائی!"

جم نے ٹیلیفون رکھ دیا۔ ہنری نے ہیرلڈ اسٹریکرافٹ کو ٹیلیفون کیا ـــ ہیرلڈ
ایک مشہور ہیوی ویٹ باکسر تھا۔ معلوم ہوا وہ دنگل لڑنے کے لئے نیویارک
گیا ہوا ہے۔ ہنری نے ریسیور رکھ کر ناامیدی سے کنول سکینہ کی طرف دیکھا۔ کنول
سکینہ نے دھیرے سے ایک طنز آمیز قہقہہ لگایا۔ ہنری کو کنول کی یہ ہنسی سخت
ناپسند تھی۔ یہ ایک ایسے آدمی کی ہنسی تھی۔ جو بہت زیادہ جانتا ہو جسے معلوم ہو کہ
دھوپ مر چکی ہے۔ راکٹوں کے تجربے سے ہی چاند بانجھ ہے اور آدم کا شہر بیس ہزار
میل کے اوپر کوئی روشنی نہیں۔ لیکن دو سو میل دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہنری
سے ایک دن کنول نے کہا تھا۔ صرف چھ انچ اندر جا کے دیکھو۔ پسلیوں کے اندر
چھ انچ۔ دل کے اندر کوئی روشنی نہیں ہے۔ یہ بجلی کا معجزہ ہے۔ ہنری۔ کہ
گاؤں شہر شہر روشنی پھیلی ہے۔ مگر دل کے اندر کوئی روشنی نہیں۔ کوئی روشنی
نہیں نہیں ....!"

"اچھا اچھا اچھا اچھا۔ اپنی بکواس بند کرو۔" ہنری نے کنول سے کہا۔
اور ٹیلیفون پٹخ کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور کنول نے جھک کے جولی کو دیکھا۔
اس کی آنکھیں بچ گئیں تھیں۔ جانے کس طرح۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ جسم کے ایک
ایک حصے کا شکستہ ہو جانا اور صرف آنکھوں کا بچ جانا۔ جیسے ان آنکھوں
سزا کے طور پر زندہ رکھا گیا ہو۔ کنول نے اپنے جسم کے ہاتھ سے میڈیکل رپورٹ

چیمبرلین۔ نرس ولمٹ بیتھ کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ میڈیکل پوسٹ
کے اس بی کاڑی کی رپورٹ معلوم ہوئی جسے اس نے تین ماہ قبل موڈیسن کو ٹھیک
کرنے کے لئے دی تھی۔!

رنگ سسٹم	بے روکن
دائیں دروازے کی ہڈی	بے روکن
بیٹری	نئی آئے گی
ناک کا بانسہ	نیا بنے گا
کاربوریٹر	ختم
کان	غائب
ہڈ کا ڈھانچہ	ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے
دونوں بازو	دو جگہ سے ٹوٹے ہوئے

وغیرہ وغیرہ

یہ تھی فہرست اس کی ایک۔ رومینٹک گرل کی جسے ہڈ کا ہیری کی
پولیس کار کو جنگ کر کے کوڑے میں ڈال دیا گیا تھا۔ کوئی بیلنگ اسے ٹھیک
نہیں کر سکتا تھا۔ یہی حالت جولی کی تھی۔ اول تو اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں
تھی۔ دوسرے اگر وہ بچ بھی گئی تو ہسپتال سے کیسی ہو کر نکلے۔ اور خود وہ چیز
کر وہ نکلے گی! اسے سوچ کر ہی ٹاکنسن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے ——

اس سے کہیں بہتر ہے کہ جولی مر جائے۔ مگر جولی مرتی بھی نہیں تھی۔ چار دن سے متواتر
وہ زندگی اور موت کے درمیان ایک بے حس پینڈولم کی طرح جھول رہی تھی۔ جسم پٹیوں
سے بندھا ہوا۔ دماغ، پھیپھڑے، جگر سے حادثہ کشتہ شریانوں میں ابھر رہا جا رہا تھا۔ اس کا
جسم ٹوٹی ہڈیوں اور کچلے ہوئے گوشت کا مربہ سا بن گیا تھا۔ پھر بھی وہ زندہ تھی۔
اور اگر خدا نہ کرے وہ کہیں سچ مچ زندہ رہ گئی۔ تو.... تو.... کنول کے سارے
بدن میں ایک جھرجھری آ گئی۔ اسے سائنس فکشن کی ایک کہانی یاد آ گئی جس میں دوسرے
ستاروں پر آباد کسی مخلوق کا ذکر تھا جس کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے تھے۔ اور جو
بلبلے گوشت کے لوتھڑے کی طرح اپنے جسم سے ایک سفید رطوبت خارج کرتے
ہوئے اسی لیس پر پھسل کر چلتی تھی۔ کیا سچ مچ جولی ایسی ہو جائے گی۔ اور اگر فرض
کر لو کہ اس کا دماغ ٹھیک رہا یا پھر سے کام کرنے لگا۔ حالانکہ ان دونوں باتوں
میں بڑے شبہ تھا۔ تو ان کے دماغ کے اندر کیسے بھیانک مد و جزر چلیں گے۔
اس کے دماغ میں وہ جولی جو اس موٹر حادثے سے پہلے تھی اور وہ دماغ میں ساتھ
ساتھ زندہ رہ سکیں گی۔ اور اگر وہ گھلیں زندہ تو یاد ایک ہو گئی۔ اس پر صورت
جولی کے ہاتھ میں جس سے وہ ہر لفظ اس خوبصورت جولی کے بدن کو گھائل کیا کرتی!
کنول جل بن گیا۔ وہ اپنے جسم کے انگ انگ میں اس چابک کے وار کو
محسوس کر کے اندر ہی اندر کسی غیر معمولی درد سے بلبلانے لگا۔ نو نو نو۔ وہ بے گناہ
نہیں۔ جولی کا درد اس کا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ دونوں موٹریں اس کے اندر ٹکرا گئی

تھیں۔ اور وہ اپنے ایک ایک انگ کو زخمی اور شکستہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر موٹی نرس ایلزبیتھ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نرس ایلزبیتھ اندر ہی اندر جانے کب سے کنول سے پریم کرتی تھی۔ کنول کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دیکھ کر اس کا چہرہ کھل گیا۔

"کیا بات ہے ڈاکٹر؟" وہ گہری نگاہوں سے ایک خاص ادا سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔۔۔

There is a short circuit somewhere. اُس نے کہا۔

"شارٹ سرکٹ؟" نرس ایلزبیتھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ موٹی تھی۔ گوشت اور چربی کا نرم گرم مجسمہ۔ اس کے موٹاپے نے اس کے چہرے کے خدوخال ایسے مسخ کر دیئے تھے۔ جیسے Epstein اپنے آرٹ سے اپنی عورتوں کے مجسموں کے خدوخال مسخ کر دیتا ہے۔ نرس ایلزبیتھ کی روح بھی ایک موم بتی سے مشابہ ہے۔ کوئی بھی اُسے اٹھا کر رات بھر جلا سکتا ہے۔ گھبرا کر اس نے جولی کے شکستہ ڈھانچے کی رپورٹ ایلزبیتھ کے ہاتھ میں واپس تھما دی۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ ہسپتال سے باہر نکل گیا۔ باہر سڑک پر چلنے لگا۔ خوبصورت نیلے رنگ کے نفیس کا بلاؤز اور اسکرٹ پہنے ہوئے ہاتھ اور پاؤں اور سارے جسم سے تندرست ایک انگریز لڑکی اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے جب اس کے قریب سے گزر گئی۔ تو یکایک جولی کے لئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اگلے دو تین دن وہ اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ جولی جو اب جیلی تھی۔ ایک

لیس دار رینگنے والی جیلی جیسی وہ آنکھیں۔ پلکوں کے بغیر ٹپ ٹپ اسکی طرف دیکھتی ہوئی۔ کوئی شکایت نہیں تھی ان نگاہوں میں کوئی غصہ نہیں تھا۔ تقاضہ سے رونے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بس اسکی طرف دیکھے ہی جاتی تھیں۔ اس نے دعا کی جولی مر جائے۔ رات کے سناٹے میں اس نے کسی گہری اندھیری جابر تاریک طاقت کو پکارا۔ جولی مر جائے۔ تاکہ اسے کسی طرح نیند تو آجائے۔

مگر اس کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ اور بستر کے قریب تپائی پہ رکھا ہوا کلاک زور زور سے ٹک ٹک کرنے لگا۔ اور اس نے روشنی کا سوئچ کھول دیا۔ روشنی سارے کمرے میں بھر گئی۔ اس کی نیند سے خالی آنکھوں میں درد چبھنے لگی۔ اس نے پریشان ہو کر پڑھنے کے لئے میگزین اٹھایا۔ Mini fashion۔ چھپے ہوئے صفحے پر جولی کی تصویر تھی۔ نئی نائلون جرابوں میں جولی کی خوبصورت سڈول لانبی لانبی ٹانگیں۔ اس نے میگزین پھینک دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سوئچ آف کر دیا۔ ٹک ٹک ٹک۔۔۔۔۔ ایک ہفتے تک وہ جولی کے کمرے کی طرف نہیں گیا۔ اور ایک ہفتے میں بھی جولی نہیں مری۔ اسکی دعاؤں کے باوجود نہیں مری۔ پھر ڈاکٹر پیرک ہاپکنس نے اسے بتایا کہ جولی کا دماغ اب ٹھیک سے کام کرنے لگا ہے خوش قسمتی سے جولی کے دماغ پہ کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر ہاپکنس دماغیات کا ماہر مانا جاتا تھا۔ اس کی بات سن کر کنول کا دل بیٹھ گیا۔۔۔!

"کیا مطلب ہے آپ کا، پروفیسر؟ جولی بچ جائے گی؟"

"علامات تو کچھ ایسی ہیں....." رابنسن نے کچھ رک رک کر، کچھ جھجک کر ایک ایک لفظ کو ناپ تول کر کہا۔ پروفیسر رابنسن اپنی تحت البیانی کے لئے مشہور تھا۔ اس لئے جب وہ یہ کہے کہ جولی میں بچنے کی علامات پائی جانے لگی ہیں، تو سمجھ لو کہ کیس خاصا امید افزا ہے!

"خوش قسمتی سے اس کے دماغ میں....." پروفیسر نے کچھ مزید کہنا چاہا۔ مگر کنول نے اسے راستے ہی میں کاٹ دیا۔ بولا۔

"آپ اسے خوش قسمتی کہیں گے پروفیسر، جولی بچ جائے گی؟ — اس کا مطلب ہے کہ وہ دیکھ سکے گی، محسوس کر سکے گی، سمجھ سکے گی، اندازہ کر سکے گی، مقابلہ کر سکے گی، اپنے حال کا ماضی سے، ماضی کا مستقبل سے..... جولی کے لئے یہ زندگی ہوگی کہ مسلسل موت! ..... پروفیسر؟"

"طبی اعتبار سے تو یہ زندگی ہوگی۔ سماجی اعتبار سے میں نہیں جانتا کہ....."

..... پروفیسر چپ ہو گیا۔ پھر مزید بڑبڑا کر بولا۔ "میں سماجیات کا ماہر نہیں ہوں —!"

پروفیسر مسکرا کر جلدی سے کنول سے رخصت ہو گیا۔ جیسے اس نے اپنے سامنے کسی نئی الجھن کو دیکھ لیا ہو۔ اور اب اس سے بچ کے نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے جانے سے پہلے کنول نے پروفیسر کا کوٹ پکڑ کر پوچھا تھا "کیا آپ یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ Mercy killing ایسے بیمار شخص کے لئے جائز اور قانونی قرار دیدی جاتی

چاہیئے۔" مگر پروفیسر نے جلدی سے پیشانی اس کی اس سے چھڑوا لیا تھا۔ اور منہ میں کچھ
بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چل دیا تھا

رات

ایک بجے

اکیلا

پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں جولی کے
کمرے کے اندر گیا۔ نرس ایلزبتھ سے میری آنکھیں چار ہوئیں۔ آہستہ سے ایک بہت
میٹھی، رازدار، سمجھنے اور جاننے والی مسکراہٹ اس کے لال موٹے چہرے پر آگئی۔
"وہ مجھ ہی کو تک رہی تھی۔ میں اس کے لئے آیا ہوں۔" تو جذبات سے اس کی آواز کپکپا گئی۔ بڑی ایک
نازک لہجے میں بولی "اوہ ڈاکٹر۔ آج تو رات بھر کی ڈیوٹی ہے میری.... کس قدر تھک گئی
ہوں میں۔ یہ میرے چارج میں سب سے مشکل کیس ہے۔ کتنا مضبوط دل اس کا ہے ——
The old girl won't die بڑبڑائی ...... I dare say ......!
وہ چپ ہو گئی۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ ایلزبتھ نے
ایک موٹا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "کنول۔ تم میرے
ساتھ کبھی پکچر تک نہیں گئے۔!"
"اس سنیچر کو چلیں گے۔" میں نے اس سے وعدہ کیا۔ "پھر اور لینڈ میں اطالوی
کھانا.... تمہیں اطالوی کھانا پسند ہے!"

"بہت!"

بستر پر جولی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ ایلزبتھ چونک گئی "وہ ہوش میں آنے والی ہے۔ دوا کا اثر ختم ہو رہا ہے۔ مجھے اسے دوسرا انجکشن دینا پڑے گا۔ میں ڈیوٹی روم میں جا کے انجکشن لے آؤں۔ کنول، مدد کرو تم نہیں جاؤ گے نا۔"

"مدد کرتا ہوں میں بیٹھوں گا۔ میں دراصل تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ لز ڈارلنگ!"

لز نے خوشی سے آنکھیں نچائیں۔ اور مچلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اب موقع تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ اتنا آسان ہوگا۔ جولی کو مار دینا۔ ایلزبتھ باہر گئی جتنی دیر میں وہ انجکشن لے کے آتی ہے میں اپنا انجکشن جو میری جیب میں ہے جسے میں تیار کر کے لایا ہوں۔ ایک منٹ میں بلکہ چند سیکنڈ میں جولی کو دے سکتا ہوں۔ اسی دوا کی ڈبل ڈوز جو جولی کو سونے کے لئے دی جاتی ہے۔ جو ابھی ڈیوٹی روم سے ایلزبتھ لا کے دے گی۔ یقیناً اس تین گنی ڈوز سے جولی مر جائیگی۔ ہمیشہ کے لئے اس زندگی سے چھوٹ جائے گی۔

میں نے جیب سے ڈبیا نکالا۔ ڈبیا نکال کے انجکشن کی سوئی کو احتیاط سے نکالا۔ دوا اسمیں بھر کے لایا تھا۔ میں نے سوئی اونچی کر کے روشنی میں اس کے آخری سرے سے دوا کی ایک بوند نکال کے دیکھا۔ اور پھر جولی کے بستر کی طرف بڑھا۔

اتنے میں جولی نے آنکھیں کھولیں۔

اس کا سارا چہرہ پٹیوں میں تھا۔ ماتھا بھی اور آنکھوں سے نیچے کا سارا چہرہ بھی

دونوں آنکھوں پر پٹی نہیں تھی۔ صاف بے داغ پپوٹوں پر لانبی لانبی [illegible] ہیں اور پلکوں کے اور کسی پہاڑی چشمے کی طرح۔ روشن آبی پتلیاں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جیتے پہچان نہیں رہی تھیں۔ مگر میری طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ گہری بے مقصد بے مدعا آنکھیں، روشن، ٹھنڈی بے خوف صاف شفاف آنکھیں اور پلکوں کی صفیں ریشم کی طرح ملائم اور پپوٹوں کے بیچ ہلکے گلابی اور بالکل بے داغ۔ یہ دو آنکھیں صرف میری طرف بے جھجک دیکھ رہی تھیں۔ اور ان کی ٹھنڈی ملائم نرم روشنی کا معصوم لمس دھیرے دھیرے میرے دل کو چھونے لگا۔ ان آنکھوں نے کچھ کہا نہیں مجھ سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ ان دونوں نے صرف میری طرف دیکھا۔ اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہاتھ میں جو انگشتری کی صورت ہے۔ وہ بالکل بیکار ہے۔ بے مقصد ہے۔ جولی کے اجاڑ بدن میں ان کے جسم کے ریگستان میں صرف یہی دو آنکھیں نخلستان کی طرح آباد تھیں۔ مگر ان کی ٹھنڈی آرام دہ اور پرسکون کہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سوئی خود بخود نیچی ہو گئی۔ میں نے چپکے سے ڈبیا بند کر کے جیب میں رکھ لیا!

جولی نے دھیرے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں اٹھ کے بستر سے واپس آ کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایلزبتھ آ گئی۔

کنول نے تاریک کمرے میں ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ جولی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا پتلی باریک ملائم انگلیاں ان میں کی ایک ایک پور اس نے جیسے خود بنائی تھی۔ کلائی

کے قریب ایک چھوٹا سا گڑھا تھا۔ اس نے اُسے ناخن کی سطح سے چھو کر دیکھا۔ پہلے گڑھے کا نشان یہ گڑھا ابھی نہیں گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی پوروں سے اس گڑھے کو سہلا کر جولی کے بدن میں گدگدی کر دیتا تھا۔ یہ گدگدی ایک میٹھی یاد تھی جو اب کسی طرح ختم نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے ڈرنک چاہیئے۔ وہ بے آواز قدموں سے سوتی ہوئی جولی کے بستر سے اٹھ کر آہٹ کئے بغیر وارڈ روب کیبنٹ کی طرف گیا اور بے آواز چابک دستی سے اس نے ایک ڈرنک بنا کر گلاس میں رکھ دیا۔ اور پھر جولی کے بستر پر آن بیٹھا۔ اور دھیرے دھیرے چسکی لے کر سوچنے لگا۔ اور اسے وہ دن یاد آیا۔ جب اس نے پروفیسر انگرسول سے کہہ سن کر جولی کے کیس کی نگرانی اپنے ذمے لے لی تھی!

”ینگ مین میں نے سنا ہے۔ جولی کی بدقسمتی کے ذمہ دار تم ہو۔ جنری کی اس پارٹی میں۔۔۔!“

”گویا آپ وہ سب قصہ سن چکے ہیں۔۔۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ اور اسی دن سے جولی کی بدقسمتی شروع ہوتی ہے۔ اگر تم انکار کر دیتے ڈال کے اس کے ساتھ ناچنے پر اصرار نہ کرتے۔ تو نہ اس کے خاوند کو پتہ چلتا۔ نہ یہ سب جھگڑا ہوتا۔ نہ وہ اسے نوٹس دیتے۔ نہ جولی کو جھیلنا پڑتا۔ نہ وہ اس [illegible] کے جال میں پھنستی۔ نہ یہ حادثہ ہوتا!“

پروفیسر انگرسول بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ سنجیدہ نہیں ہے!

میں نے کہا۔ "اگر وہ کرائسٹ کو سولی پر چڑھانے کے بجائے پتھر باندھ کر سمندر میں ڈبو دیتے۔ تو کراس کہاں ہوتا۔ عیسائیت ایک ایسی موثر علامت سے محروم ہو جاتی۔ جس نے اس کی ترویج و اشاعت میں اتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ پھر کیا اسی کراس کے لئے ہمیں رومن سپاہیوں کا شکر گذار ہونا پڑے گا۔ پروفیسر انگرسول! اتفاقات جو آدمی کی زندگی میں اگر آتے ہیں تو قوموں کی زندگی میں بھی آتے ہیں۔ ہر سڑک دو طرف کو جاتی ہے۔ اگر ہیری کی موٹر کسی دوسری طرف کو جاتی۔ آپ ایسا کیوں نہیں سوچتے پروفیسر......؟

"جولی کی زندگی خطرے سے باہر تو اب ہو چکی ہے۔" پروفیسر انگرسول نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "مگر آگے کیا ہو گا۔ اس کے متعلق ہر ڈاکٹر شبہ میں ہے۔ کوئی ذمہ داری لینے کو تیار نہیں ہے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہ ایک بہت دلچسپ کیس ہے۔ بالعموم ایسی حالت تک پہونچ جانے کے بعد ہزاروں بلکہ لاکھوں میں کوئی ایک فرد بچتا ہے۔ یہ جولی کی بدقسمتی ہے کہ وہ بچ گئی ہے۔ مگر آگے کوئی ذمہ داری کیا لے گا۔ میں نے بہت بڑے بڑے ماہرین کی رائے لی ہے۔ بہت سے۔ تقریباً سبھی اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ جولی کو پھر سے کارآمد انسان نہیں بنایا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک Living Jelly بن کر زندہ رہ سکے گی۔ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مصیبت اور لعنت کا ایک طوق...... پھر تم اس کے کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو جبکہ بڑے بڑے ماہرین......!"

"اسی لئے تو" میں نے انگرسول سے کہا۔ "میرے لئے جولی کا کیس اور بھی زیادہ

دلچسپی رکھتا ہے۔ نفسیاتی اعتبار سے بھی اور جسمانی اعتبار سے بھی یہ پلاسٹک سرجری کی ایک بہت بڑا تجربہ ہوگا۔ میں ضرور اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہوں گا ـــــ مگر مکمل طور پر......!

"مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر میں تمہیں جتا دینا چاہتا ہوں۔ تم جو کچھ سوچ رہے ہو۔ وہ بالکل ناممکن ہے۔ کیا جولی کے بدن میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اتنے آپریشنوں سے گزر سکے۔ کیا اس کا دل اتنا مضبوط ہے۔ کیا اس کی نفسیات میں اس قدر قوت آ سکے گی۔ کیا گوشت بھی موم ہو سکتا ہے۔ اب تک ہم نے جتنے تجربے کئے ہیں۔ وہ لگ بھگ موچیوں کے پیشے سے مشابہت رکھتے تھے۔ تم ایک بھدے سے جسم کو ہیرے بنانے کا دعویٰ کرتے ہو۔ but it is a tall order my boy میں تمہاری ہمت پست نہیں کرنا چاہتا۔ مگر مجھے تمہاری تجویز ایک رومانی تصویر کی پرچھائیں معلوم ہوتی ہے۔ کیا تم جولی سے محبت کرتے ہو؟"

"اس کے برخلاف۔ میں تو اُسے ٹھیک کر کے اُس سے انتقام لینا چاہتا ہوں!"

اُس نے اپنی گھنی ابروؤں کے نیچے سے مجھے تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر وہ بڑے عجیب انداز میں مسکرایا۔ پھر میز پر رکھے ہوئے کانچ کے پیپر ویٹ کو اپنی انگلیوں میں رول کرتے ہوئے بولا۔ "جاؤ۔ کوشش کرو۔ جولی آج سے تمہارے چارج میں ہے۔ مگر میرا خیال ہے تم اپنی کوشش میں ناکام رہو گے ـــ!"

"کیوں ڈاکٹر ـــ؟"

"کیونکہ تم عورت کو نہیں جانتے۔۔!"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔ پروفیسر۔ مگر میں جولی کو اس کا جسم واپس دینا چاہتا ہوں، تقریباً اسی حالت میں۔ جس حالت میں وہ اس حادثے سے پہلے اس کے پاس تھا۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی تنخواہ، اپنی آمدنی کی آخری پائی بھی کیوں نہ خرچ کرنا پڑے۔ میں جولی کو اس کا جسم اس کا مکمل جسم۔ اس کا دماغ۔ اپنی تمام [illegible] کے ساتھ اسے لوٹانا چاہتا ہوں۔ اسی حالت میں جیسے وہ پہلے تھا۔ یہ میرا سب سے بڑا انتقام ہوگا!"

جیسے میری احمقانہ باتوں سے وہ بہت محظوظ ہو کے مسکرا رہا ہو۔ پروفیسر ایگرول نے اپنی چمکتی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ شوخی بھرے لہجے میں جو اس بڈھے انگریز کے لئے بالکل عجیب لگتا تھا۔ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"کچھ شاعری سے دلچسپی ہے؟"

"جی۔۔۔" میں اس غیر متوقع سوال پر بالکل حیرت میں رہ گیا

"چارلس بادشاہ کی نظمیں پڑھی ہیں؟"

"کیا۔۔۔؟"

O whirl wind catching up the sea
And folding Islands in its arms
Gave him to me, Gave him to me

And I will wrap him in my shadows!
اسی لیے میں تمہیں بجوڈی کے حوالے کرتا ہوں۔ تم جا سکتے ہو!"

رچرڈ اسٹونکرافٹ اور تھامس میک نارلین سے دستخط لینا کوئی مشکل کام نہ رہا۔ کیونکہ جول کا بچ جانا اخباروں میں ایک طبی معجزہ سمجھا جانے لگا تھا۔ یہ خبر بھی اخباروں میں چھپ چکی تھی کہ سینٹ جارج کے ماہرین جول کو ایک نیا جسم دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جول کی موجودہ حالت کے بارے میں بھی کئی خبریں چھپی تھیں۔ اُسے بالعموم Space Jelly کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ خلائی پروازوں۔ سائنس فکشن اور دوسرے ستاروں میں ذہین زندگی کی دریافت کے بارے میں جو مضامین اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ یہ نام انہی سنسنی خیز مضامین کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ جول پہ Space Jelly کا نام چپک گیا تھا۔ اس لئے کنول کے لئے جول کے پہلے دو خاوندوں سے دستخط لینا مشکل نہ رہا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کوئی

بھی جولی کی طویل علالت، اس کے دوران ہونے والے آپریشنوں اور دیکھ بھال کے دیگر مصارف سے عہدہ برآ ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ کنول نے ان دونوں کے سامنے بہت آسان حل رکھ دیا تھا۔ ایک سادے کاغذ پر اس نے دو فقرے ٹائپ کرائے تھے۔

"جولی پر میرا کسی طرح کا کوئی کلیم یا حق نہیں ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس کے لئے میں کوئی قانونی چارہ جوئی نہیں کروں گا۔۔۔!"

یہ چٹ لے کر سب سے پہلے میں بالکر کے پاس گیا۔ اسٹو کرافٹ امریکہ سے ہار کر واپس آ چکا تھا۔ وہ بہت ہی سلجھے ہوئے سنجیدہ موڈ میں مجھے ملا۔ "اوہ۔ وہ Space Jelly ——" اس نے اخباروں کا چٹپٹا سا خطاب دہرایا۔ اور کاغذ پر بلا چوں و چرا دستخط کر دیے۔ اور پھر بڑے زور سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ جیسے اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جولی سے ہاتھ اٹھا لیا ہو۔

میک فارلین نے بھی زیادہ وقت نہیں لیا۔ البتہ اس نے ایک سوال مجھ سے ضرور کیا۔

"تمہیں جولی میں کیا دلچسپی ہے ——؟"

"محض عشق ——!"

"اوہ...... یعنی...... یہ بات ہے...... کہ تم دیو مالا کا کوئی گمشدہ نسخہ دوبارہ پانے والے ہو۔ میں نے سنا ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایک ایسی پراسرار دوشیزہ پائی

جاتی ہیں۔ جس سے پورے جسم کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی دوا ہے؟"

"اگر ایسی کوئی دوا ہے تو مجھے معلوم نہیں ہے۔ میں تو محض پلاسٹک سرجری جانتا ہوں۔۔۔۔ کٹنگ کے جانے پہچانے طریقے آزماؤں گا۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے اس کاغذ پر دستخط کرنے سے؟ مجھے معلوم ہے قانون کی نظر میں اس کاغذ کے پرزے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر نفسیاتی طور پر مجھے اپنے علاج میں بہت مدد ملے گی۔ جول۔۔۔۔ ایک کلین سلیٹ ہے۔۔۔۔ نئی زندگی۔۔۔۔۔ دوبارہ لکھے گی۔ میرا خیال آپ سمجھ گئے ہوں گے!"

"Perfectly my boy — perfectly!"..... میک نارمین نے دستخط کر دیئے!

میں نے اٹھتے اٹھتے اس سے پوچھا: "تمہیں معلوم ہے۔ جول کا تیسرا شوہر کہاں ہے؟ جیمس کلیفٹ۔ ناول نگار؟ ۔۔۔ میں نے اس کے فلیٹ پر ٹیلیفون کیا۔ تو کسی نے جواب نہیں دیا۔ شاید اسرائیل جانے والا تھا۔۔۔۔!"

"اسرائیل سے واپس آ گیا۔ لیکن لندن واپس نہیں آیا۔ اولیدو میں آرام کر رہا ہے!"

"اولیدو کہاں ہے؟"

"اسپین میں ہے۔۔۔!"

"ملاگا کے پاس۔ ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے۔ ماہی گیروں کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں وہ آرام کر رہا ہے۔ جولی کے مقدمے کے سلسلے میں میری اس کی خط و کتابت رہی ہے۔ مگر گذشتہ پندرہ بیس روز سے اس کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا ہے۔ جم ایک جہاں گرد، سیلانی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ اُسے پکڑنا بہت مشکل ہے۔!"

"میں کوشش کروں گا۔!"

"Good luck!" کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا.... اور اب مجھے اویدو یاد آتا ہے۔ چند پہاڑی ٹیلوں پر آباد ایک غریب اسپینی قصبہ۔ اندلوس میں میڈیٹیرین لہریں لیتا ہوا۔ ریت پر گدھے گھومتے ہوئے۔ اور ٹیلوں کی اوٹ میں جنگلی جھاڑیاں اور کہیں کہیں پر انجیر اور زیتون کے درخت۔ جم مجھے سب سے اونچے ٹیلے پر کھڑے ایک پرانے مورش کھنڈر کی ٹوٹی ہوئی محراب کے نیچے مل گیا۔ اس نے اپنے سامنے ایک ماہی گیر کو بٹھا رکھا تھا۔ اور وہ اس کا پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ اور وہ دونوں بیچ بیچ میں باتیں کرتے ہوئے قصبے کی کشید کی ہوئی گاڑھی شراب پیتے جاتے تھے۔ جو دیکھنے ہی میں اس قدر غلیظ معلوم ہوتی تھی کہ اسے پچانے کے لئے کسی گھوڑے کے معدے کی ضرورت تھی۔!

میں نے تصویر کی طرف دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

"مگر تصویر تو تم ایک گدھے کی بنا رہے ہو۔!"

میں..... مگر یہ ماہی گیر Inspiration کا کام کرتا ہے!"

"مگر گدھے اور ماہی گیر میں کیا مناسبت ہے۔ یا مشابہت ہے۔؟"

"اتنی مشابہت تو ہے، غور سے اس ماہی گیر کے چہرے کا مطالعہ کرو، اور پھر ایک گدھے کا چہرہ دھیان میں لاؤ۔ اور پھر دونوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کردو پھر اس ماہی گیر کے چہرے کی طرف دیکھو۔ تو تمہیں صاف اس میں کسی گدھے کے خدوخال ابھرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اسی عمل سے میں اسی ماہی گیر کو لے کر ایک اونچی جینس۔ ایک چاڈ یا بندر۔ حبشی یا پٹھان کی تصویر کھینچ سکتا ہوں۔ یہ ایک کاسمک لا (Cosmic Law) ہے کہ ہر ایک چیز کسی دوسری چیز سے نکلی ہے۔ اور اپنی ابتدا اور انتہا میں تمام چیزوں کا ماخذ ایک ہے۔ نو نو۔ میں خدا کی بات نہیں کرتا ہوں، محض سائنس کی۔ جیسے تمہارے اپنشد بھی یہی کہتے ہیں۔ مگر اس سمے میں مذہب کی بات بھی نہیں کرتا محض سائنس کی۔ مگر ایک عجیب و غریب بات تم دیکھو گے اس قصبے کے گدھے اور قصبے کے ماہی گیروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں اپنے قصبے سے دور نہیں دیکھ سکتے۔ دونوں ساحل کے نزدیک اپنا کام کرتے ہیں دونوں سر جھکا کر ایک ہی ڈھرے پر صدیوں سے ہزاروں سال سے ایک ہی طرح کا کام کرتے چلے آئے ہیں۔ تو پھر بتاؤ۔ چہروں کی مشابہت ہوگی کہ نہیں۔ میں اسی لئے ماڈرن زندگی کے حق میں ہوں۔ کہ اس نے ویرائٹی پیدا کی ہے۔ مشینوں کے باوجود ایک وسیع ویرائٹی۔ انسانوں کی شکلیں بھی اتنی مختلف نہ تھیں

جتنی وہ آتا ہیں۔ مجھے سمجھ گئے نا کہ میں کیا کہتا ہوں؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اور پھر یہ بھی نہیں سمجھا کہ تم تو ایک ناول نگار ہو
تم تصویریں کیوں بنا رہے ہو؟"

"ناول بھی تو تصویروں کا ایک البم ہوتا ہے۔ ایک چیز دوسرے سے جڑی ہوتی ہے۔ میں ساری دنیا گھوما ہوں۔ کبھی کسی شے کو اکیلا نہیں دیکھا۔ کسی سے جڑا ہوا ہی پایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے اس دنیا کا سب سے بڑا المیہ کیا ہے؟ کوئی اکیلا نہیں ہے۔ پرانی دنیا میں پھر بھی کوئی اکیلا مل جاتا تھا۔ آج کل کی پیچیدہ زندگی میں کہیں کوئی اکیلا نہیں ملتا ۔۔۔ یہ شراب پیو۔ اس قصبے کی شراب اسپین کی بدترین شرابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اسے صرف گدھے اور ماہی گیر ہی پی سکتے ہیں۔ اسے پینا دوزخ کی آگ کا مزہ چکھنا ہے۔ اور چونکہ ہم سب جہنم میں جانے والے ہیں۔ تمہارا سیت وا کرو۔ اس لئے ابھی سے اس شراب کی عادت کیوں نہ ڈال لیں۔ جہنم میں بھی ہمیں اکیلا نہیں رہنے دیا جائے گا۔ اور جنت میں فرشتے اسکول ماسٹروں کی طرح بچے اور ہمیں لے خدا کی برتری کا سبق پڑھایا کریں گے۔ پڑھو بچو ....."

"ویوزانت!"

وہ ادھیڑ عمر کے اسپینی ماہی گیر کو زرانت کہتا تھا۔ کیونکہ اس کی گردن لمبی تھی۔ اور جسم پر کئی دھاریوں والا کپڑا تھا۔ اور اس کا چہرہ بھی دبلا اور لمبوترا تھا۔ جیسے کلفٹ کے بال دو بالکل مختلف۔ اور بظاہر بالکل متضاد چیزوں کے

درمیان گہری مشابہت دیکھ لینے کا عجیب و غریب ادراک پایا جاتا تھا۔ شاید اسی ادراک نے اسے ایک کامیاب ناول نگار بنا دیا تھا۔ میں نے لقمے سے خوش ہو کے دو تین گھونٹ جلدی جلدی مار گئے۔ بڑی تیز اور تلخ شراب تھی۔ [illegible] سے آتی تھی۔ اور بعد میں زبان پر ایک کڑوا سا [illegible] ذائقہ چھوڑتی تھی۔ [illegible] کروں۔ اس کم بخت ناول نگار کو اس وقت خوش ہو کر [illegible] گا۔ جو اس وقت [illegible] ہونے کا اصل موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔

کیا اسرائیل میں کسی ناول کا پلاٹ نہیں ملا؟

"بڑا عجیب سا ملک ہے۔ چاروں طرف مصیبتوں سے گھرا ہوا۔ جیسے اسرائیل کو دیکھئے۔ [illegible] کام کر رہا ہے۔ ٹائم بم کی [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ ذرا سا ہلنے جلنے سے اڑ جائے گا۔ ہوں..... جب یہاں سے میں [illegible] کی [illegible] کر آرام کر سکتا ہوں۔ [illegible] اور [illegible] سکتا ہوں۔ ایسا ہو گیا۔ [illegible] مجھے اسرائیل میں نہیں ملا [illegible] I couldn't [illegible] اور [illegible] کیا [illegible] اسرائیل کے متعلق [illegible] جیسے کوئی [illegible] کے [illegible]۔ ایسی [illegible] جو کسی غیر معمولی واقعے یا حادثے کے انتظار میں ہو۔ All Israel is waiting for something to happen [illegible] اور یہ [illegible] خصلت کے [illegible] ہے۔ جناب۔ یہودی انتظار [illegible] وہ صرف [illegible] کرتا ہے۔ میں نے یہودیوں سے زیادہ [illegible] قوم [illegible] نہیں دیکھی [illegible]

جہاں گرد سیلانی قوم تو اب تک آ گئی ہیں تھے۔ سینے میں سارے زمانے کا درد لئے در بدر
گھومتی رہی ہے۔ اور اب ایک جگہ اکٹھی ہو رہی ہے۔ یہی اس قوم کا سب سے بڑا المیہ
ہے کہ یہ اپنی ابتدا کو لوٹ رہی ہے۔ اور ایک جگہ جمع ہو رہی ہے۔ یہ پوری انسانیت
کی توجہ طلب ہے۔ اور کاسمک رجحان کے خلاف ہے۔ کس کاسمک رجحان کے خلاف؟
تم مجھ سے یہ پوچھو گے، اور میں تمہیں بتاؤں گا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے تم نے آئنسٹائن
بھی نہیں پڑھے۔ اس لئے مجھے تمہیں بتانا پڑے گا۔ کہ کبھی یہ ساری دنیا اور ساری کائنات
ایک تھی۔ ایک مٹھی کی طرح بند تھی۔ پھر یہ بکھرنا شروع ہوئی۔ اور اب ہر ستارہ دوسرے
ستارے سے اور ہر نظام شمسی دوسرے نظام شمسی سے اور ہر گیلیکسی دوسری گیلیکسی سے
بھاگ رہی ہے۔ اور دن بدن یہ فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسے میں یہودی قوم کی تاریخ
ہوئی تھی کہ یہ پھیل رہی تھی۔ بکھر رہی تھی۔ دوسری قوموں میں ایک خمیر کی طرح جذب
ہو رہی تھی۔ اور اب اس نے کاسمک لا کو پلٹ دیا ہے۔ اور پھر سے ایک مٹھی میں بند ہو رہی
ہے اس لئے گلیلی کی وادی میں اب ایک ڈیوڈ تو پھر سے پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر آئن سٹائن
نہیں۔ آئن سٹائن کے لئے بہت کھلا آسمان چاہئے۔ اور تم سمجھ سکتے ہو کہ میں
اسرائیل سے بھاگ کر کیوں سپین میں آیا ہوں۔ کیونکہ کسی زمانے میں اسپین کو بھی یہی
مرکزیت نصیب تھا جو آج اسرائیل کو ہے۔ اس مسجد کی ٹوٹی محراب کو دیکھتے ہو۔ یہ سات
سو سالہ اسلامی فتوحات کی یادگار ہے۔ اسرائیل اور اسپین دونوں نے ایک طرح
سے اس راستے کو حل کیا ہے۔ عیسائی وحدت نے اسپین کے موری عنصر سے جنگ کی۔

اور مسلمانوں کو آئی بیرین جزیرہ نما سے بے دخل کر دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسرائیل نے فلسطینی مسلمانوں کو اپنی نئی ریاست سے بے دخل کر دیا۔ اسمیں وحدت تو مل جاتی ہے۔ مگر تنوع نہیں ملتا۔ سمٹنے میں ایک تنگ نظری ہے۔ بکھرنے میں وسعت ہے۔ اور اس وقت کا مسلک، رجحان بھی یہی ہے۔ کہ وہی قومیں ترقی کریں گی جو بکھرینگی۔ تم بکھر رہے ہو۔ یورپ کو دیکھو۔ جب یہ اپنے یورپی احساس سے نکل کر ساری دنیا میں بکھرا۔ تو اس نے ترقی کی اسی طرح اسلام نے ترقی کی تھی ایک زمانے میں۔ سمٹنے میں قدم جامد ہو جاتے ہیں۔ قدم جم جاتے ہیں۔ مگر تم ایک اکیلے پیڑ کے نیچے دھیان میں مگن ہو کر ساری دنیا سے معلق رہ سکتے ہو۔ دنیا کی سب سے عجیب قوم ہندوستانی ہے۔ اس پر کسی حملے کا، کسی طاقت کا، کسی غلامی کا۔ کسی آزادی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ [illegible] ایک ہی انداز میں چل رہی ہے۔ مگر تم یہاں کیوں آئے ہو —؟"

"بکھرنے کے لئے؟" میں نے جواب دیا۔

"بکھرنے کے لئے؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، تمہارے بیان کے مطابق اگر انسان بکھرنے سے ترقی کرتا ہے۔ تو آجکل ہندوستانی سب سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں، کیونکہ ہندوستانی دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں، کوئی ملک ایسا نہیں ہے۔ جہاں ہمارا گزر نہ ہو۔ تو کیا اس خیال سے کہ بکھرنے کے میدان میں ہم یہودیوں کی جگہ لیں گے۔ ہم بھی اتنے پرانے ہیں۔ اتنے ہی روایت پسند اتنے ہی قدامت پرست۔ اس لئے ہمارا حشر بھی یہودیوں کا سا ہوگا۔ یا آپ ہی کا سا۔!

یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ہم نے کسی کو نکالا نہیں ہے۔ اور پھر ہمارا ملک بہت
بڑا ہے۔ ہم اسکی وحدت میں کثرت رکھتے ہیں۔ اور اپنے کلچرل چار دیواری میں
بہت سے تجربے کرتے رہتے ہیں۔ جو ہمارا کلچر نہیں رہے۔ ہمیں ہمیشہ ہی نہیں رکھے
یورپ والے چیپ سے نہیں رکھے۔ لوگ کامن لا کی بات کرتے ہیں۔ وہ قانون کی بات بھول
جاتے ہیں جو کائنات میں رائج ہے۔ جب ایک شے کسی دوسرے میں مدغم ہو جاتی
ہے۔ واقعات اور حالات کی کشاکش، آویزش اور آمیزش کا جو باہمی عمل چلتا
رہتا ہے۔ انھیں یورپ کی معیشت نے۔ وسط ایشیا کے مسلمانوں نے اور اصل یہ
کہ نامیاتی طور پر بکھرنے کے باوجود۔ جس انفرادیت اور جدیت سے چند مستثنیات کو
چھوڑ کر ہمیشہ الگ رکھا۔ your way of life exclusive not inclusive
تم لوگ کسی ہونے کی بات کیسے کہہ سکتے ہو۔ جب تم انفرادی تجزیہ ایک معمولی تجربہ
اولاد کو برداشت نہیں کر سکتے۔ جو اپنی ازدواجی زندگی میں مستقل نہیں تھی۔ نہ بچہ کی تھی
"آہ۔ جرنل۔" مجھے ایک سندر کا قہقہہ لگایا۔ "تم اسکی جانب سے آئے ہو؟"
"میں خود آیا ہوں۔ اپنی جانب سے۔ یہ دو سطریں لکھ کر ان پر دستخط کر دو—!"
لگتے ہیں مجھے کچھ نہیں جتایا ہے۔ ابھی اس حالت میں بھی نہیں ہے کہ اسے کچھ بتایا
جاسکے۔ لیکن اگر تم اس پر دستخط کر دو گے تو میرے لئے آسانی ہو جائے گی۔ ابھی اسکا
ذہن اس پر راضی نہیں۔ اس کا بدن۔ اس کی پوری شخصیت ایک شکستہ ڈبل روٹی کی طرح
بے شمار ٹکڑے ہے۔ روٹی کی طرح بکھری ہوئی۔ مجھے اس روٹی کو پھر سے

مما تبدیلی کرکے اس سے پھر سے دوستی بنانا ہے۔؟"

"تم اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو۔ جبکہ اس میں زندگی نہیں ہے جس کے لئے کوئی اپنی قیمتی زندگی کا ایک لمحہ بھی برباد کرے۔ اس کے پاس ایک خوبصورت ترین جسم تھا بس۔ جب وہ بھی چلا گیا۔ تو اس پر وقت صرف کرنا فضول ہے۔ کیونکہ اس کے پاس اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اب تو بس یہ ہے وہ شخص ایک جیلی ہے۔ گوشت اور ہڈیوں کا ملغوبہ.....؟"

اس کاغذ پر دستخط کر دو گے؟"

اس نے کاغذ پر وہ دونوں سطریں لاپرواہی کے عالم میں پڑھیں۔ پھر برش اٹھا کر اس نے نیچے دستخط کر دیئے اور بولا۔

"اس قصبے میں صرف ایک ہی سرائے ہے اور اس میں ایک ہی اچھا کمرہ ہے آج رات تم میرے مہمان رہو گے۔؟"

"شکریہ۔ مگر میں تو آج رات ہی واپس ملایا جا رہا ہوں۔ میں ملایا سے ایک موٹر لانچ لایا تھا۔؟"

جب سے حویلی جشن میں آئی تھی اُس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی، وہ جہاں تک ہو سکے
کسی سے بات نہیں کر رہی تھی۔ اب اُس کے چہرے سے پٹی اتر چکی تھی۔ صرف بازو اور دو پٹیوں
میں بندھے تھے۔ اُس کا بدصورت چہرہ اُسے دکھا دیا گیا تھا۔ اُس چہرے کو دیکھ کر
اُس نے کوئی چیخ نہیں ماری تھی۔ صرف زور سے اپنے لب بھینچ لئے تھے، اتنے زور سے
جیسے وہ اپنے ہونٹوں کا سارا لہو پی جائے گی۔ اُس کی کنپٹیوں کی رگیں اُبھر آئی تھیں اور
سارا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ پھر دھیرے سے اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور
نرس ایلس بیگ سے التجا کی۔ "مجھے ختم کر دو۔"
پھر جب اُس کے منہ سے رقیق غذا پہنچانے کی نلکی نکال دی گئی۔ تو اس نے کھانا
کھانے سے انکار کر دیا۔ کسی کے سمجھانے بجھانے پر راضی نہ ہوئی۔ اب تک میں نے اپنے

آپ کو بھی منظور نہ رکھا تھا۔ بجائے وہ بھوکی۔ کیونکہ وہ میری صورت ہی سے نفرت کرتی تھی اور میں اصرار کرکے اسے مزید بیزار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے نرسوں کو منع کر دیا کہ اگر وہ کھانا نہیں کھانا چاہتی۔ تو اُسے کھانا نہ دیا جائے میں اس بات کی اُمید میں تھا کہ جب اس کا جسم شدت سے غذا مانگے گا تو وہ خود ہی کھانا مانگے گی مگر جب پورے دو دن اور دو رات اُس نے کھانا نہیں کھایا۔ تو میں نے اس سے فیصلہ کن بات کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ میں کب تک یہیں منظر میں چھپا رہ سکتا تھا۔ یہ بات تو مجھے اس سے کرنی ہی تھی اور اگر میں جولی کا تعاون حاصل نہ کر سکا تو میں اپنے ارادوں میں کامیاب بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بات ہوگی اور بہت صاف صاف بغیر کسی لگی لپٹی کے!

دوسری رات کھانے سے انکار کے بعد کوئی دس بجے کے قریب مختلف پلنگوں سے بچتا بچاتا ہوا مریضوں کا معائنہ کرتا ہوا میں اُس کے کمرے میں پہنچا اور کرسی کھینچ کر اُس کے پلنگ کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈیوٹی دینے والی نرس جاش کو باہر بھیج دیا—

"ہیلو بدصورت—" میں نے اُسے مخاطب کیا

جولی نے منہ پھیر لیا۔

"میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

جولی منہ پھیرے چپ رہی—

"مگر بات کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی ضد کا فقدان پیدا کرو۔ سکھ

ڈال دو....؟"

اس کی گردن میری طرف گھومی میں نے تینوں تحریریں اُسے دکھا دیں۔ اس کے
پہلے تینوں تحریروں کی ....

"مجھے خاصی پریشانی اُٹھانا پڑی ہے۔ ان تینوں تحریروں کو حاصل کرنے
میں۔ کلفٹن کی تلاش میں مجھے اسپین تک جانا پڑا۔ خیر وہ سب کچھ ہو گیا۔ اب
تم آزاد ہو۔ تم پھر سے نئی زندگی شروع کر سکتی ہو۔!"

"ایک شیخ کی طرح؟" اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلا تبسم آیا۔
وہ ہونٹ جو اب تک مجھے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں سے مشابہ تھے، چکنے ہو
ناک کے بانسے میں ابھی تک ایلومینیم کی وہ نلکیاں لگی تھیں جو نتھنوں کا کام دیتی تھیں۔

"اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔ تو شاید میں تمہیں پھر سے ایک نیا جسم دینے
میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ پہلے کی طرح خوبصورت جسم تو نہ ہو گا تمہارا مگر ایک
کارآمد جسم۔ ہاتھ پاؤں۔ ناک کان گردن۔ ہر طرح کا مکمل جسم۔ ایک عورت کا جسم۔
جسے دیکھ کر کسی کو گھن نہیں آئے گی۔ جسے دیکھ کر بچے ڈریں گے نہیں۔ تمہارا اپنا
جسم کسی میگزین کی ماڈل گرل کا جسم نہیں، مگر ایسا جسم جیسا ہزاروں لاکھوں اُن
عورتوں کا ہوتا ہے۔ جو شریف گھروں کی مائیں ہوتی ہیں۔ جن سے ان کا خاوند
اور بچے پیار کرتے ہیں۔ ایک اوسط درجے کا جسم۔ چند کوتاہیوں اور خامیوں کے
باوجود جس کے لئے میں پہلے سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ کیونکہ سائنس نے

ابھی اس درجہ ترقی نہیں کی، کہ وہ انسانی اعضا کو جوں کا توں بنا دے۔ مگر میری نظر میں چند نئے تجربے ہیں جنہیں میں تم پر آزمانا چاہتا ہوں، ہڈی اور گوشت رگوں اور نسوں کے نئے گرافٹس جو ابتک کسی انسانی جسم پر نہیں آزمائے گئے۔ وہ میں سب تم پر آزماؤں گا، اور تمہارا کیا جائے گا؟ سوچو ــــ جس بگڑی ہوئی حالت میں تم اب ہو۔ اس سے ابتر حالت کا تصور ممکن نہیں۔ تو پھر مجھ سے تعاون ہی کیوں نہ کرو۔ ویسے میں تم کو یہ بات بتا دوں کہ اگر تم مجھ سے تعاون نہیں کرو گی۔ تو بھی میں اپنی سعی کر گزروں گا۔ میں تو اپنے تجربے کرنے ہی والا ہوں۔ اور اسپتال کے بورڈ نے مجھے اس کی اجازت بھی دیدی ہے۔ مگر مریض اگر تعاون کرے تو ڈاکٹر اور مریض کے باہمی ذہنی اور نفسیاتی تعاون سے علاج بہت آسان ہو سکتا ہے!

تعاون کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ آج تم کھانا کھا لو۔ روز کھانا کھایا کرو۔ خودکشی کرنا کیا مشکل ہے۔ کبھی روز کسی دن بھی خودکشی کی جا سکتی ہے۔ جو چیز مجھے تو کسی فرد اور عورت پر نگرانی نہیں رکھی جا سکتی۔ اس دنیا میں ایک یہی تو بات ہے جس پر اپنا پورا اختیار ہے۔ خودکشی۔ کیوں نہ اس کے لئے چند ماہ ٹھہر جاؤ۔ چھ ماہ میں کچھ زیادہ کام تو نہیں ہو سکتا۔ نمونے کے طور پر میں تمہاری ایک ٹانگ درست کر کے دکھا دوں گا۔ تم اس ٹانگ کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتی ہو کہ تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو کہ نہیں؟ ــــ خودکشی کرو گی کہ زندہ رہنے کی کوشش کرو گی؟

مجھے صرف چھ ماہ چاہئیں۔ صرف چھ ماہ کا تعاون... بس!"

اتنا کہہ کر میں کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور نرس کو کھانے کا آرڈر دے گیا۔!
جولی نے اُس رات کھانا نہیں کھایا لیکن دوسرے دن ناشتے پر اُس نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ ناشتہ کر لیا اُس نے۔ اور نرس نے خوشی خوشی اُس کی اطلاع مجھے دے دی۔ اصل میں اب میرا کام شروع ہوا۔!

شروع شروع میں ہر شخص میرے کام کو بے یقینی سے دیکھتا تھا سب سے زیادہ بے اعتمادی جولی کو تھی۔ اور یہ ایک لازمی امر تھا۔ مگر دوسرے ڈاکٹر اور میرے اپنے شعبے میں کام کرنے والے ڈاکٹر دیر دہ میرا مذاق اڑاتے تھے۔ اور یہ مذاق کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھا۔ کیونکہ جولی کے جسم کو گوشت پوست ہڈیاں۔ رگیں نسیں۔ وہ تمام فاضل سامان کی ضرورت تھی جو سب کا سب اس کا جسم مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ فارن گرافٹ کے بغیر جولی کا جسم کسی طرح مکمل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور فارن گرافٹ کے متعلق ابھی کامیابی صرف اتنی تھی کہ چند ہفتے یا چند مہینے دو یا تین مہینے سے زیادہ کوئی فارن گرافٹ انسانی جسم میں نہیں ٹکتا۔ دوسرے کے جسم سے لیا گیا گردہ یا گوشت کا کوئی حصہ ـــــ اعصابی نظام فٹ نہیں ہوتا۔ چند ہفتوں کے بعد جسم اُسے مسترد کر دیتا ہے۔ اس لئے تو کسی ڈاکٹر نے جولی کو ٹھیک کرنے کی حامی نہیں بھری تھی!

طالب علمی کے زمانے میں فارن گرافٹ میرا اہم موضوع رہا ہے۔ اب بھی میں لگاتار اپنی فرصت کے اوقات میں اُس پر ریسرچ کرتا رہا ہوں مختلف تجربے

کٹ جانے کی سنی۔ نئے خیال میرے دماغ میں سپیدہ چین تھے۔ ان میں سے ایک خیال یہ بھی تھا کہ جب بچہ نو ماہ تک ماں کی کوکھ میں رہ سکتا ہے۔ آخر بچہ بھی تو ایک طرح کا فارن گرافٹ ہوتا ہے۔ اور ماں کا جسم اسے قبول کر لیتا ہے۔ اور اپنی کوکھ میں اسے مکمل کرتا ہے تو دوسرے فارن گرافٹ کو بھی انسانی جسم کو قبول کرنا چاہیئے کم سے کم نو ماہ تک...... خیر مجھے اب ایک زندہ لیبارٹری مل گئی تھی۔ اپنے تجربات کے لئے......!

چھ ماہ کے عرصے میں میں نے جولی کی دائیں ٹانگ پر بے شمار چھوٹے بڑے آپریشن کئے۔ ٹوٹی ہڈیوں کو جوڑا۔ نئی ہڈیاں ڈالیں۔ نئے گوشت کے پیوند لگائے نئی رگوں اور نسوں کے جال بنائے۔ چاروں انگلیوں کو پھر سے ٹھیک طرح سے باندھا۔ صرف انگوٹھا کسی طرح بچ گیا تھا۔ باقی چاروں انگلیوں کا ملغوبہ سا بن گیا تھا۔ ہر ایک انگلی کی پھر سے شکل بنائی۔ ران اور پنڈلی کے زخم بھر کر ان پر پھر سے پوسٹ گرافٹ کیا۔ ٹخنوں کی کلائیاں درست کیں۔ پلاسٹک سرجن کا کام بھی موچی کا ہوتا ہے۔ کبھی جراح کا۔ کبھی فنکار۔ کبھی مسمر گر کا۔ یہ ٹانگ جس کی ہڈیاں شکستہ تھیں جس کا گوشت کہیں سے پچکا کہیں سے جھڑا ہوا تھا۔ کہیں سے غائب تھا۔ اس بے ہنگم بدصورت ٹانگ ہی کو دیکھ کے گھن آتی تھی۔ اسے پھر سے شکل دینے کے لئے میں نے Tate Gallery میں جا کر پھر سے پتھر کے خوبصورت مجسموں کی حسین ٹانگوں کے چربے اتارے۔ میں دن رات اس ایک ٹانگ

ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کام کرتے رہے۔ مگر جولی کے اوزار میرے لئے ایک بہت تراش کے اوزار تھے۔ جس ٹانگ کا خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ وہ تو اب جولی کی اپنی اصلی ٹانگ سے بھی حسین اور سڈول تھی۔ مگر مجھے ہر طرح کی تفصیلات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی تفصیل حقیر سے حقیر بھی میرے لئے زبردست اہمیت رکھتی تھی۔ اُن دنوں دنیا بھر کے مشہور پلاسٹک سرجنوں سے میری خط و کتابت ہو رہی تھی۔ میرے ساتھیوں سے گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ میں جولی کے باقی جسم پر شاید ایک نگاہ بھی نہیں ڈالتا تھا۔ جیسے جولی کا سارا جسم اسی ایک ٹانگ پر مشتمل تھا۔ نہ دن کا مجھے ہوش تھا نہ رات کا۔ وقت میرے لئے ختم ہو گیا تھا۔ میرے تجربے نے خود میرے دل میں ہیبت پیدا کر دی تھی۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ چھ ماہ بعد کیا ہو گا۔ جب پٹیاں اتریں گی۔ جب پلاسٹک نکلے گا۔ کیا شے باہر آئے گی؟ دل سوچ کر ڈوب جاتا تھا!

چھ ماہ بعد جب صبح پٹی کھلنے والی تھی۔ اُس رات میں سو نہیں سکا۔ وہ ساری رات میں نے جولی کے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھے بیٹھے کاٹ دی۔ جولی اور میرے درمیان اب تھوڑی تھوڑی بات چیت ہونے لگی تھی۔ مگر زیادہ تر پروفیشنل انداز کی۔ جیسی ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ آج وہ بالخصوص بہت خاموش تھی۔ غالباً اس کا دل بھی اسی شدت سے دھڑک رہا ہو گا جیسا میرا۔

”ڈاکٹر۔“ اُس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارا تجربہ ناکام ہوا!

"تو شاید میں خودکشی کر لوں۔!"

وہ میرا جواب سن کر حیران ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"کیا تمہیں مجھ پر اس قدر رحم آنے لگا ہے؟"

"رحم دل نہیں ہوں۔ ڈیوٹی محض ڈیوٹی اور کچھ نہیں صرف ڈیوٹی....!"

جولی نے پوچھا۔ "یہ کس طرح ڈیوٹی ہے۔ ڈیوٹی تو دوسرے ڈاکٹر بھی بجا لاتے ہیں۔ مگر تم گزشتہ چھ مہینوں سے تقریباً ہر وقت اسپتال میں رہتے ہو۔ یہ [illegible] ہیں۔ نرسیں مجھے بتاتی ہیں۔ ان چھ مہینوں میں تمہیں کسی نے کسی لڑکی کے ساتھ سینما تک جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔!"

"شاید مجھے تمہاری بدصورت ٹانگ سے عشق ہو گیا ہے!"

"نان سینس!"

"شاید مجھے تجربے کرنے کا شوق ہے۔ تم گویا میرے لئے تجربہ کرنے کو [illegible] ہو!"

جولی نے اپنے بھدے بھدے چھوٹے ہونٹ دانتوں میں زور سے دبا لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "اور تم اب تک مجھ سے کتنی نفرت کرتے ہو؟"

میں نے اُسے کوئی جواب نہیں دیا۔ رات کے پڑھنے کے لئے جو کتاب لایا تھا اُسے کھولنے لگا۔!

"کونسی کتاب ہے؟"

"انگریزی شاعری ہے!"

"تمھیں شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟"

"ہاں۔ اور تمھیں.....!"

"میں جب خوبصورت تھی۔ تو لوگ میرے متعلق شاعری کیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھی میں سن لیا کرتی تھی...!"

"آج کل تو بدصورت چہروں کے متعلق بہت شاعری ہوتی ہے۔ حسن، نیکی، نرمی، ہمدردی، طمانیت۔ محبت کا لمس، آنکھ کا آنسو۔ یہ سب باتیں فیشن سے باہر ہیں۔ آجکل ہر جذبے کو پہلے سے نچوڑ کر خالی کر لیا جاتا ہے پھر اسے پاؤں تلے اچھی طرح روندا جاتا ہے۔ جب وہ جگہ جگہ سے پھٹ جاتا ہے، اوپر کالے نیلے چکیٹ دھبے پڑ جاتے ہیں۔ ایسے جگہ جگہ نفرت، حماقت، گھٹیا پن کی بیزارکن بو آنے لگتی ہے تو شاعر اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر اپنی ناک کے قریب لاتا ہے۔ اور دونوں آنکھیں بند کر کے اسے زور سے سونگھ کر کہتا ہے۔ آہا!"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ تم بدصورت ہو۔ اب تمہاری تعریف کرنے والے کئی شاعر مل جائیں گے۔ اسی مجموعے میں بہت سے ایسے ہیں جنھیں میں خط لکھ دوں تو دوڑے دوڑے آئیں گے۔ اور کہیں گے ایک نظم in praise of Jelly! وہ بڑے خوش قسمت زمانے میں تمہارا یہ ایکسیڈنٹ ہوا ہے جولی اب تو ممکن ہے تمھیں کوئی پریمی مل جائے!"

جولی منہ پھیر کر روتی رہی۔ میں کتاب کے ورق الٹتا رہا۔ بیچ میں سو بھی گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھا بیٹھا۔ پھر نہ جانے کب کتاب میری گود سے پھسل کر فرش پر گر پڑی۔ اور میں جاگ گیا۔ جولی اب سو رہی تھی۔ آنسو بھی اس کی پلکوں پر خشک ہو چکے تھے۔ اس کے سارے چہرے پر اب یہ آنکھیں بہت عجیب لگتی تھیں۔ پورا چہرہ اس قدر بھدا اور بد نما تھا بے ڈھنگ اور اس قدر مختلف تھا کہ اس پر آنکھیں بالکل بدصورت اور بے ہیبت معلوم ہوتی تھیں۔ بدصورتی کا بھی اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ اگر بدصورت نقشے میں اگر کہیں ایک شے بھی خوبصورت نظر آ جائے تو بدصورتی اپنا توازن کھو بیٹھتی ہے۔ شاید یہ فطرت کی طرح مکمل توازن کا حامی ہوتا ہے یا تو پھر کہیں کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ یا پھر داغ دھبے ہی دھبے ہوں.... اگر کوئی صحیح پیار تجربہ ناکام رہا تو میں یہ آنکھیں بھی جولی سے چھین لوں گا۔ ویسے بھی چھینی لگتی ہیں یہ کسی کے جانے پہچانے ناک پر بدصورت چہرے پر۔ بلکہ جولی کی منحوس بے پلکوں کی آنکھیں ہی اس چہرے کو زیب دیں گی۔

رات بھاری ہے۔ ویسی ہی خاموش رات تھی وہ۔ جب کنول کو یاد آیا۔ وہ عمرو کی کھول کر ہسپتال سے باہر دیکھنے لگا تھا مگر اندر دور تک دیکھنے پر نہیں ملا۔ اس کو بڑے شہر میں نہیں ملا باپ اور بچے۔ جنہیں مریض اور شکلیں۔ منگلی شکلیں اور شہر کے سارے شعور کا بہروپیا۔ ناگ اور سانپ۔ ایسے میں وہ دو تین کسی بچے جو دیا خون کی طرح اور آتی ہے۔ پتھر کے فرش پر وہ رات بجتی ہے۔ قلفش کی زنجیر ہوتے گھٹتی ہے۔

دن چڑھ گیا۔ نہ شوالے کی گھنٹی۔ نہ مسجد کی اذان۔ نہ پرندوں کی چہکار۔ نہ کھیت نہ ٹیلے۔ نہ پہاڑ۔ ٹیمز کے گدلے پانی میں ایک دخانی کشتی کا بھونپو بج رہا ہے۔ یکایک وہ اپنے گھر جانے کے لئے بیتاب ہو گیا۔ اس کے گھر کے اندر آنگن میں تلسی مہک رہی ہو گی۔ دیواروں پر لوکی کی بیلیں چڑھ گئی ہوں گی۔ اور اس کی ماں مٹکے میں متھانی ڈال کر دہی بلو رہی ہو گی۔ گھوں۔ گھوں۔ گھوں۔ مٹکی میں سے آواز آ رہی ہے۔ جیسے کبوتر مست ہو کر خوشی سے ناچتے ہوں۔ غٹرغوں غٹر غوں۔ اور ...... نہیں یہ تو ٹیمز میں بہتے ہوئے ایک چھوٹے سے آگن بوٹ کا بھونپو ہے......!

وہ ایک لمبی سانس لے کر واپس کرسی پر آ گیا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ پھر نرس الزبیتھ آ گئی اور نرس جاسمی اور ڈاکٹر ہنری کونگ برن۔ اور پروفیسر انگرسول اور دوسرے کئی ڈاکٹر۔ وہ سب دیکھنے کے لئے آ گئے تھے۔ اور سب کی نگاہیں ہونٹوں پر تھیں۔ اور کچھ کنول پر۔ اور کنول کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کسی سے آنکھ ملانے کو تیار نہ تھا۔ ایسا سناٹا تھا جیسے تماش گھر جانے کے پٹ کھلنے پر ہوتا ہے۔ کوئی بھی نہیں تھا کمرے میں اسے ایسا لگا۔ کوئی بھی نہیں ہے۔ صرف اس کا بستر کمرے میں ہے۔ سامنے صلیب اور یسوع۔ پشت پر کتھیڈرل کے رنگین کانچ اور دور دھیما دھیما بجتا ہوا پائپ آرگن اور دور چڑیاں گا رہی ہیں۔ دھیرے دھیرے اور جوتی سو رہا ہے۔

ایک ایک ہڈی کے پرتی اتر رہی ہے دھیرے دھیرے پلاسٹر چھوڑنے لگتا ہے۔ جیسے وہ
ہزاروں سال سوئی ہوئی جوانی کو برف کے نیچے سے دریافت کر رہا ہو۔ اسے
تھام کر اسٹڈی ذرا دھیرج۔ شانت ہو جاؤ کنول......!

دھیرے سے بہت دھیرے سے۔ جیسے کنول صبح کی پہلی اُمید کے سامنے
سجدہ کرنے جا رہا ہو۔ اس کے کانوں میں ایک انجانے دھیمی سنگیت کا شور بھر
گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔ وہ ٹانگ اس کے سامنے تھی۔
ایک لمحے کے لئے صبح کے دھندلے دھندلے دھندلکوں میں اس سفید مرمریں
ٹانگ کو دیکھا۔ سیب میں تراشی ہوئی سندر۔ سڈول۔ مکمل۔ موتیوں کا آبی رنگ
لئے ہوئے۔ ایک لمحے کے لئے۔ پھر جیسے آنکھوں میں سب کچھ جھلملا کے رہ گیا۔ کوئی
اس کا شانہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کا استاد پروفیسر انگر سول زور زور سے امکانات
بکے جا رہا تھا۔ کتنی ہی آوازیں تھیں جو اس کے چاروں طرف گونج رہی تھیں۔
یکایک اس کا سارا بدن سُن ہو گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ شانے ڈھلک گئے۔
اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھا بیٹھا بیہوش ہو گیا......!

چھ ماہ کی رُکی ہوئی نیند نے یکلخت غلبہ کیا تھا۔ وہ متواتر دو دن تک
سوتا رہا۔ پروفیسر انگر سول نے کہا تھا۔ کوئی اسے پریشان نہ کرے۔ واقعی یہ ایک
معجزہ تھا۔ ایسی لاثانی۔ صحت مند کہیں پر ایک چوٹ نہیں۔ داغ دھبہ نہیں۔
حرکت کرتی ہوئی۔ گول گول گھٹنے۔ خوبصورت پاؤں۔ کنول کے پھول سے

نازک اور شفاف۔ جیسے کسی پرانے یونانی صنم گر نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہو۔ یا زہرہ کے مجسمے سے الگ کر کے جولی کے بدن سے لگا دیا ہو۔ ایک ایک کے سب ڈاکٹروں نے اُسے میعاد دے دی تھی۔ رینڈ نے اسے اپنے تجربوں کے لئے کھلی چھٹی دے دی تھی۔ اور اب اس کے لئے ایک معقول فنڈ بھی دے دیا تھا۔ اب اسے اپنی تنخواہ میں خرچ نہیں کرنا پڑے گی۔ اور ڈاکٹروں کو بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ کنٹرولر کے اصرار پر اس تجربے کی خبر اخبارات میں نہیں دی گئی۔ وہ اپنا تجربہ مکمل تو کرے.....!

دو دن بعد جب وہ جولی سے ملنے گیا تو اس نے دیکھا کہ جولی کی آنکھوں کی خشک جھیلیں پانی سے بھر گئی ہیں۔ اور منڈیروں پہ پلکوں کی قطار در قطار کچھ شرمیلے جگمگاتے سپنے اس سے نظریں نہیں ملا رہے ہیں۔!

وہ جب جولی کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو اس وقت نرس وارڈ میٹرن جولی کی مصنوعی ٹانگ کے پاؤں کے ناخنوں میں گلابی رنگ لگا رہی تھی۔ جولی نے آنکھ اُٹھا کر بس ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اور بھی اپنی ٹانگ پر جھک گئی۔ اور ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔!

دو سال اور اس نے محنت کی۔ ان تھک مشقت۔ مگر وہ اور بھی لگن والی محنت۔ جولی کا جسم اس کے لئے جسم نہیں تھا۔ وہ ایڈورڈ والکر کا پراجیکٹ تھا جو اس کے گاؤں میں بجلی لے کر آیا تھا۔ اس نے انجینئروں کو اس پراجیکٹ پر کام

کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ قصہ کچھ اس طرح جیسے نہر کھودی جانے یا ریل چلایا جائے۔
یا صبح اٹھ کر مندر جایا جائے۔ ہر کام عبادت چاہتا ہے۔ کام عشق ہے۔ بات یوں کہ
لفظ بنتے ہیں۔ جولی کا جسم ایک کیتھیڈرل ہے۔ کوئی میکس نہیں ہے اس کے اندر۔ اس کے
لئے تو ایک سمفنی کی شروعات ہیں۔ ایک سُر یہاں تو دوسرا وہاں۔ ایک دھُن یہاں تو
دوسرا اُدھر وہاں۔ ایک رنگ یہاں تو دوسری شکن وہاں۔ ایک پیچ در پیچ پیچیدہ نقشہ۔ ندیاں
نالوں، جنگلوں، پہاڑیوں اور وادیوں سے بھرا ہوا۔ ایک جسم میں دس ارب خلیے
ہوتے ہیں۔ اور ہر خلیہ (سیل) پوری توجہ چاہتا ہے۔ توجہ اور ربط باہم۔ کیونکہ
ہر خلیہ دوسرے کا محتاج ہے اور دوسرا تیسرے کا۔ دس ارب خلیے مل کر ایک
انسان کی تخلیق کرتے ہیں۔ ایک جسم بنانا ایک مندر بنانے کے برابر ہے۔ ان چھ مہینوں
کے بعد پھر سے دو سال اور لگے۔ جولی کے باقی جسم کے بنانے میں پہلے اس نے
اس کی دوسری ٹانگ بنائی۔ پھر اس کے دھڑ اور کمر کا حصہ ٹھیک کیا۔ پھر دونوں
بازو ایک ہی بار میں بنا دیئے۔ جب دو سال گزر گئے۔ تو جولی گردن کے نیچے
سے لے کر پاؤں کی پور تک دوبارہ بن چکی تھی۔ صرف چہرہ باقی تھا!

"میرا جی چاہتا ہے کہ تمہارا چہرہ نہ بناؤں۔ اسے ویسے ہی رہنے دوں۔" ایک
دن کنول نے جولی سے کہا۔

ان دونوں کے درمیان اب تک بہت کم باتیں ہوتی تھیں۔ بات کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہوتی
اگر جولی کا جسم کنول کے لئے ایک معبد تھا۔ تو کنول کے ہاتھ جولی کے لئے پوجا کے پھول تھے وہ

وہ بہت کم بات کرتی تھی مگر اس کا جسم جولی کے ہاتھوں میں ایک ایکٹر کی طرح بولتا تھا۔

"اچھا ہے۔ مت بناؤ۔ میں مسلمان عورتوں کی طرح نقاب ڈال کے چلا کروں گی اور کسی کیبرے میں نقاب پوش حسینہ کا لقب مستعار لے کر ناچا کروں گی۔!"

"ہو سکتا ہے میں کل مر جاؤں۔ اور تمہارا چہرہ اسی طرح بد صورت رہ جائے!"

"پھر لوگ مجھے تمہاری ادھوری معشوقہ کہیں گے۔!"

"اگر تمہارا جسم سنگِ مرمر کا ہوتا۔ تو میں سارا جسم تیار کر کے تمہارا چہرہ بے تراشا چھوڑ دیتا۔ کسی آئندہ آنے والے سنگ تراش کے حسنِ تصور کے لئے۔ دیکھنے والے پاؤں سے گردن تک مسحور ہو کر اس جسم کے فتنہ پرور حسن کو دیکھتے جو فطرت پر ایک اضافہ ہے۔ اور سوچتے کہ اس سیم تن ساحرہ کی صورت کیا ہو گی اور حسن کی کیسی کیسی نادر تشبیہیں۔ نازکی کے کیسے کیسے نادر نقش عالمِ خیال میں ابھرتے۔ تمہارا خالی چہرہ ہر آنے والے سنگ تراش کے لئے ایک inspiration ہوتا۔ مگر افسوس کہ تمہارا جسم محض گوشت کا ہے۔ اتنی محنت اگر میں نے کسی پتھر پر صرف کی ہوتی۔۔۔!"

"تم ہی کیوں نہیں سمجھ لیتے میں تمہاری روح کا پہلا پتھر ہوں!"

میں چونک گیا۔ میں نے غور سے جولی کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو صرف تمہارا جسم بنایا ہے۔ روح نہیں۔ پھر یہ تبدیلی کہاں سے آئی؟"

"جب تک میں بگڑی نہیں تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ روح بھی کوئی چیز ہوتی ہے ممکن ہے زندگی ہوتی ہو۔ اس بستر پر اس کمرے میں ڈیڑھ سال لیٹے لیٹے میں نے

اگر مجھے تھوڑا سا سمجھا ہے تو صرف درد کو...... مگر کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، صرف درد ہی آشنا ہے!"

"تم ہندو درویشوں کی سی باتیں کرنے لگی ہو۔ یہ بہت ہی بری بات ہے۔ میرا خیال ہے۔ میں تمھیں ایک خوبصورت چہرہ دے کر پھر سے تمھیں ایک شگفتہ خود معتمد لڑکی بنا دوں گا!"

مگر اس کا چہرہ بنانے میں مجھے پورا ایک سال لگا۔ ایک سال کے بعد خود آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو پہچان نہ سکی تھی! یہ بات نہیں کہ یہ اس کا چہرہ نہیں تھا۔ کوئی بھی ______ جلنے سے پہلے کے فوٹو سے اس کا چہرہ ملا سکتا تھا۔ میرے پاس اس کے فوٹو کے بیسیوں انلارجمنٹ تھے۔ جن سے میں نے چہرہ بناتے وقت مدد لی تھی۔ بالکل وہی چہرہ تھا۔ لیکن باریک جزویات میں کچھ فرق تھا۔ ناک کا بانسہ پہلے سے متوازن تھا۔ اور نتھنے زیادہ تنگ۔ اور متناسب۔ اور کان کی لویں کم لمبی اور ہونٹ پہلے سے زیادہ بھرے ہوئے اور گرم، دانت جلد پہلے سے صاف شفاف۔ اب وہ تقریباً مکمل تھی۔ پہلے سے بہتر۔ صرف ایک خامی رہ گئی تھی۔ بائیں پاؤں میں ٹخنے کے قریب ایک نس میں نقص رہ گیا تھا جو میں کسی طرح ٹھیک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی ٹانگ میں ایک خفیف سا لنگ باقی رہ گیا تھا۔ ورنہ وہ بالکل مکمل تھی!

"اس نقص کو ٹھیک کرنے کے لئے مجھے تین چار سال تک مزید تجربہ کرنے

پڑنے لگے!" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "مگر اس کے لئے نہ اب میرے پاس وقت ہے نہ ہی تمہیں اب اس بستر سے باندھے رکھنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اب اپنی نارمل زندگی شروع کر سکتی ہو۔ میں بھی اب اپنے وطن چلا جاؤں گا۔ تمہاری وجہ سے ٹھہر گیا تھا۔ ورنہ ویک اینڈ سے پہلے چلا گیا ہوتا!"

"پھر میرے اس لنگ کا کیا ہوگا؟"

"It is the touch of the imperfect upon perfect!"

میں نے اس سے کہا۔ "یہ کیفیت سا لنگ تمہارے حسن میں اضافہ کرے گا۔ تمہاری شہرت میں چار چاند لگا دے گا۔ لارڈ بائرن......!"

"تھانک یو سر!"

ہسپتال سے شفا یاب ہو کر باہر جانے پر اس کے لئے پروفیسر انگرسول نے ایک پارٹی دی تھی جس میں شہر کے معروف جرنلسٹوں کو بلایا گیا تھا۔ "ٹائمز" کے تھامپ ولکنسن کا ایڈیٹر بانس اور ڈیلی میل کا شیفرڈ بھی موجود تھے۔ دعوت والوں بہت سی تصویریں کھینچی گئیں۔ میری بھی اکٹھی اس کی۔ ایک ہفتے تک اور کوئی موضوع ہی نہیں تھا اخباروں میں۔ Lancet نے مجھ سے میرے تجربات کے سلسلے میں ایک مضمون بھی مانگا تھا جس کو پچھلے زیادہ کانفرنٹس اور آفر آ رہے تھے۔ امریکہ کی ایک بہت بڑی اشتہاری کمپنی نے اپنے ہاں گراں قدر معاوضے پر ماڈل گرل بننے کی

پیشکش کی تھی۔ اُس نے مجھ سے صلاح لی "میں امریکہ چلی جاؤں؟" "ضرور چلی جاؤ۔ اس سے عمدہ آفر تمہیں مشکل سے ملے گا!" میری بات سُن کر وہ زور سے ہنسی۔ بولی "تو کل آئرلینڈ ویں میں مجھے کھانا کھلاؤ۔ ممکن ہے میں پرسوں چلی ہی جاؤں۔!"

میں نے ہاں کر دی۔ وہ سنیچر کی رات تھی۔ بہت عمدہ خنکی والی۔ میں آئرلینڈ کے دروازے کے باہر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی جیگر سے شاداں و فرحاں اُتری اُتنے عرصے تک اتنے قریب سے اُسے دیکھتا رہا کہ اب اُسے ذرا دور سے دیکھنے معلوم ہوا کہ اس کا چہرہ دوبارہ بناتے وقت میں کس قدر اطالوی مصوروں اور سنگ تراشوں سے متاثر ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ ایک اطالوی میڈونا کا سا دکھائی دے رہا تھا اور اُس گہرے سبز لباس میں وہ بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے جیگر کا پٹ کھلتے ہی اُسے تھام لیا اور اپنے بازو کا سہارا دے کر اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ آئرلینڈ کے اطالوی منیجر نے جو اب مجھے اچھی طرح سے پہچاننے لگا تھا۔ اوپر کی منزل پر ایک کونے سے الگ کارنر میں ہمیں جگہ دے دی۔ جب ٹیبل پر موم بتی جلی تو مجھے لگا جیسے کوئی میڈونا کے سامنے موم بتی پیش کر رہا ہو۔ وہ میرے خیالات نہیں پڑھ سکتی تھی۔ بس اپنے آپ میں خوش اور مگن تھی۔ بالکل پہلے کی سی جولیا پہلے سے تھوڑی سی سنجیدہ مگر اسی طرح شوخ اور تیکھی۔

منیجر خود آرڈر لینے آیا۔ میں نے وائن مینو دیکھ کر جولیا سے پوچھا۔

"تمہیں تو کیا وائن پسند ہے؟"

"نہیں۔ میری پسند بدل گئی ہے۔ آج میں باردولو پیوں گی!"

"آہ باردولو" منیجر خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا "میڈم کا انتخاب بہت عمدہ رہا۔ وائن کے معاملے میں ایک حسین عورت ہمیشہ اپنے حسنِ ذوق کا ثبوت دیتی ہے۔ باردولو ہمارے پیڈمانٹ کی سب سے عمدہ وائن ہے۔ نیبولو انگور سے کشید کی جاتی ہے۔ الکوحل کی طاقت صرف بارہ سے چودہ ڈگری تک۔۔۔۔ رنگت یاقوت کی طرح سُرخ۔ ذائقے میں عمدہ سے عمدہ برگنڈی کو مات کرتی ہے۔ آہ کیا انتخاب کیا ہے باردولو۔۔۔۔ اور آپ سینیور۔۔؟"

"مجھے صوفیا لارین کے گاؤں کی شراب چاہیئے!"

"آہ۔ مارسالا۔!"

"گالی دیتے ہو۔؟"

"نہیں جناب۔ شراب کا نام بتا رہا ہوں۔ مارسالا سسلی کی بہترین شراب کا نام ہے۔ صوفیا لارین کے گاؤں کی شراب۔ صوفیا لارین کے حُسن میں جو آتش فشاں کیفیت پائی جاتی ہے وہی کیفیت مارسالا میں ہے۔ وائن کیا ہے جیسے پگھلا ہوا لاوا پی رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہمارا مسالے دار اطالوی کھانا بہت جچے گا۔ ہاں اگر آپ کوئی ہلکا بے مسالے کا انگلش کھانے کا آرڈر دے رہے ہیں تو وائن بھی بدل دیجئے پھر میں تجویز کروں گا۔ کوئی ہلکی نازک سفید وائن جیسے سیاٹو ولنگے یا اوجی یہ لگوریا ضلع کی وائن ہے ہمارے Bianca della Cinque Terre

پہاڑی چٹانوں کی سطح مرتفع پر ان کے انگوروں کے باغات ہیں۔ اس وائن کی خوشبو اور کوالٹی انگلش کھانے کی بدمزگی دور کر دے گی۔ ہاں اگر آپ اطالوی کھانا آرڈر کریں تو پھر مارسالا۔۔۔۔!"

"مارسالا۔۔۔۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو۔۔؟" جول نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ آرڈر کر رہا ہوں۔۔!"

جب منیجر چلا گیا۔ تو میں نے جول سے کہا۔ "یہ منیجر باتیں بہت کرتا ہے۔ ویسے یہاں کے کھانے کا جواب نہیں ہے!"

"نہیں۔" جول بولی۔ "کام کی باتیں کرتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ کھانے اور وائن کے سلسلے میں اس کا ذوق بہت شستہ ہے۔" پھر ذرا سا رک کر بولی۔ "میں کیسی لگتی ہوں۔۔؟"

میں اس سے بھی زیادہ رکا۔ پھر بولا۔ "مجھے کیا معلوم۔ تم بتاؤ۔ دوسرے کیا کہتے ہیں۔۔؟"

"کہتے ہیں۔ تم اب پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی ہو!"

میں چپ رہا۔!

ویٹر جول کے لئے بارڈولا لایا۔ میرے لئے مارسالا۔ پہلا جام خاموشی میں گزرا۔ دوسرا بھی۔

"کچھ بات کرو۔" وہ بولی۔

"اچھا کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ دو گھونٹ پی کر پھر چپ ہو گیا۔

"اونہہ۔۔؟" وہ کسی قدر بے چینی سے بولی۔

دو جام اور خاموشی میں گزر گئے!

"بڑے بور ہو!"

"اس میں کیا شبہ ہے!"

"اگر تم نے نئی زندگی نہ دی ہوتی تو ابھی اٹھ کے چلی جاتی!"

"اب بھی جا سکتی ہو۔ ایک طرح سے جا ہی رہی ہو۔ اور پھر۔۔۔۔!"

"تم نے تو یہ بھی نہ پوچھا۔ اور یہ کہ کب جا رہی ہو!"

"کب جا رہی ہو۔؟"

"کل۔۔!"

"بہت اچھا۔۔!"

دو جام پھر خاموشی سے گزر گئے۔ جولی نے جھینپ کے کہا "یہ بیہودہ فقرہ!"

"محض بے وقت بیہودہ ہو۔ جگہ بیہودہ ہو۔ تمہارا ساتھی بیہودہ ہو اور تم میں یہ سب باتیں کہنے کی ہمت نہ ہو!"

"اگر تم مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے۔ تو تم نے مجھے میرے حال پر کیوں نہ چھوڑ دیا۔ مجھے پھر سے زندگی کیوں دی۔۔۔۔؟"

میں نے جب تم پہ کام شروع کیا تو واقعی تم سے نفرت کرتا تھا۔ میرا ارادہ تم سے انتقام لینا تھا۔ تمہیں ٹھیک کر کے تمہیں پھر سے انسان بنا کے تمہیں اس گالی کا جواب دینا تھا۔ جو تم نے مجھے کال دی۔ بیسٹو۔ اور ڈرٹی انڈین کہہ کر دی تھیں۔ مگر جوں جوں میں کام کرتا گیا۔ میں تمہارے جسم میں الجھتا گیا۔ وہ نفرت غائب ہوتی گئی۔ دھیرے دھیرے اُس کی جگہ محبت آنے لگی۔ کیوں ایک عورت اپنے جسم پہ فخر کرتی ہے۔ اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کی عزت کرتی ہے۔ اس کے لئے مر سکتی ہے۔ عورت کا جسم ایک شاہکار ہے۔ یہ میں فنی اعتبار سے کہتا ہوں۔ ڈھائی سال اُس کے پورے ڈھانچے پہ کام کرنے کے بعد کہہ سکتا ہوں۔ کہہ سکتا ہوں ناں؟"

"مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں میں اب کیسی لگتی ہوں؟"

کنول نے اب مارسالا کی آدھی بوتل ختم کر دی تھی۔ اس نے ایک انگلی اٹھا کر جول کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "تم؟" ــ پھر ایک لمبے وقفے کے بعد جس کے دوران میں وہ بستر پہ لیٹا ہوا سے جول کو تکتا رہا تھا۔ اور جس دوران میں وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ یکایک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اور اس نے کہا۔

تم!

ایک یا دو

وا کیا ہو کہ مت ہو

ہر بار، تمہارا پیکر تراشے

یوں کھا گئی جھاگ تمہاری ذات کا غم
ایک لمحے کے لئے تیرا حسن دمکے
جیسے شیشہ بادلوں کی بارگی
اور پھر
اب یاد کی چھلنی میں کچھ باقی نہیں ہے!

(جی۔ ایس۔ فریدہ)

"ایسے ہی تم مجھے بھول جاؤ گے۔ اب یاد کی چھلنی میں کچھ باقی نہیں ہے۔" جولی نے دہرایا۔

"اس میں کیا شبہ ہے۔ تم امریکہ جا رہی ہو۔ میں ہندوستان۔۔۔۔۔۔۔ اپنے وطن۔۔۔۔۔۔۔ Finish!"

نیل پر جولی کا ہات زور سے کانپا۔ اس نے گلاس نیچے رکھ دیا اور سختی سے بولی۔

"مگر میں امریکہ نہیں جا رہی ہوں!"

"تم کیوں امریکہ نہیں جا رہی ہو؟"

"کیونکہ میں ہندوستان جا رہی ہوں!"

"تم ہندوستان کیوں جا رہی ہو؟"

"کیونکہ میں نے اپنی پسند بدل دی ہے۔ کیونکہ اب میں وہ جولی نہیں ہوں۔"

وہ جولی مر گئی۔ اور یہ جولی اس وقت تمہارے سامنے غسل پہ بیٹھی ہے۔ وہ تمہاری تخلیق ہے۔ اور کوئی تخلیق اپنے خالق سے جدا نہیں رہ سکتی!"

اتنا کہہ کر جولی نے سب کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کنول کی گردن میں ڈال دیئے۔ اور اس کا منہ چوم لیا!

کھانے کے بعد جب وہ دونوں جولی کی جگہ میں واپس جا رہے تھے۔ تو پھر جولی نے اپنے ہونٹ کنول کے کان سے لگا دیئے۔ اور کنول کے کانوں میں آتش کا وہ مشہور گیت سنانے لگی۔

اس نے مجھے چوم کر جگایا۔

اور کوئی خفا نہ ہوا۔

سورج چمکا

اور بادلوں پر، آنکھوں پر، کنکریوں پر، سب پر

اور وہ اونچا پہاڑ سمندر کے کنارے بیٹھا ہے۔

اور اب اپنے [illegible] دیکھنے کی آواز [illegible]

مچھلیوں کی طرح ایک ہی دائرے میں

پیارے تم میرے ہو کیونکہ آئینے اکیلے ہیں۔

اور وہ اونچا سبز پہاڑ سمندر کے کنارے بیٹھا ہے۔

پیارے تم میرے ہو کیونکہ آئینے اکیلے ہیں۔" جولی نے ایک ایسی حسرتناک گرمجوشی سے کہا کہ کنول کا دل اندر ہی اندر پگھلنے لگا۔

بادل چھٹ گئے تھے۔ اور پن ٹاپ ہوٹل کے بار کی بلوریں دیوار سے گلمرگ اور دائیں بائیں عقبی پہاڑوں کا بلند سلسلہ۔ آسمان کے نیلے کینوس میں برف کی انگلیوں سے دودھیا تصویریں بنا رہا تھا۔ برفیلی چوٹیوں سے نیچے دیوداروں کے جنگل کھڑے تھے اور کہیں کہیں پہاڑی سلوٹوں سے شفاف جھرنے بہہ رہے تھے۔ حالانکہ بادل چھٹ گئے تھے۔ لیکن شام کی آمد سے خنکی بڑھ گئی تھی۔ مگر بار کے اندر کی طرح خنکی نہ تھی۔ ہر ایک نے اونی کپڑے پہن رکھے تھے۔ خاصی مقدار میں شراب اندر جا چکی تھی۔ چہرے سرخ تھے۔ نگاہیں چمکیلی، آوازیں بلند اور لہجے میں شوخی، اور جو اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو شراب پینے کا مزا ہی کیا ہے اور گلمرگ آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

جولی کو اس نیم روشنی والے بلوریں دیوار کے زیریں صوفے پر بیٹھ کر مارٹینی پینا پسند تھا۔ وہ چھوٹا سا گھونٹ یا تو دو مارٹینی کا لیتی گلاس کے اندر برف کو گھلتا ہوا دیکھتی۔ اس کے گلابی میٹھے ذائقے میں تلخی ایک ہلکے سرور کو زبان پر محسوس کرتی۔ اچھی مارٹینی اور اچھی موسیقی میں بہت مماثلت ہے۔ آنکھیں بند کرنے پر کان اور زبان پر ایک ہی لطیف لمس تیرنے لگتا ہے۔ کتنی ہی حسیات ہیں جو الگ الگ ہونے پر بھی ایک دوسرے میں بدل سکتی ہیں۔ وہ اس بلوریں دیوار سے لگ کر مارٹینی پیتی ہے۔ ایک نگاہ اٹھا کر باہر کے منظر کو دیکھ لیتی ہے جو ہندوستانی ہونے پر بھی اطالوی منظر معلوم ہوتا ہے۔ اور اسے اپنے یورپ کی یاد دلاتا ہے۔ جسے چند ماہ ہوئے وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہے۔ مگر یہ منظر الگ ہوتے ہوئے بھی کس قدر مماثلت رکھتا ہے اس کے یورپ سے۔ وہ کنول کے لیے ایک اونی سویٹر بنتے سوچتی ہے۔ سویٹر کا رنگ گہرا سنہرا ہے۔ اور ڈوبتے ہوئے سورج کا پگھلتا ہوا سونا اس کے رخساروں پر لرز رہا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت معلوم ہو رہی ہے۔ حالانکہ بار میں اور بھی خوب صورت عورتیں موجود ہیں۔ دو دراز قد گیہوں رنگ کی پاکستانی لڑکیاں ہیں۔ دیکھے خوش وضع کنواریاں۔ ہاتھوں میں گوگل لیے اپنے تیتیں ہنس ہنس کے دوستوں کے باتیں سہہ جاتی ہیں۔ مسکراتی ہیں۔ ہنس دیتی ہیں۔ شرماتی ہیں۔ سرخ سرخ ہو جاتی ہیں۔ ایک اکیلی سویڈش لڑکی ہے۔ بال بالکل نیلگوں۔ چہرے کا رنگ

جیسے صبح کی برف کی پہلی تہہ پر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی ہوں۔ اُن آنکھوں کی نیلاہٹ کنول کھول سی ہے۔ اس نے ایک ہاتھ میں گلاس تھام رکھا ہے۔ دوسرے ہاتھ پنسل سے اپنے پیڈ پر کچھ اسکیچ کرتی جاتی ہے۔ اس کا وہ بھی خوبصورت ہے اور ایک سے سے خوبصورت تو وہ نیگرو لڑکی بھی ہے۔ جو ایک امریکن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہے۔ بڑی قابلِ قبول ہے۔ اور بھاری کولہے ہیں۔ اور رنگت کالی بھی نہیں گوری بھی نہیں زیتونی بھی نہیں، گندمی بھی نہیں۔ کچھ عجیب سی رنگت ہے۔ جیسے اس کے بدن میں شام کو آئے دل لگے ہوں۔ اسے بھی اپنے حسن کی ساحری کا احساس ہے۔ اور وہ گورا امریکی تو اس پر مرتا ہے۔ بار میں بیٹھے پیئے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھتا ہے۔ بلکہ نگاہوں ہی نگاہوں سے اُسے دھیرے دھیرے کھا رہا ہے۔ نگاہوں سے آدمی بہت سے کام لے سکتا ہے۔ نگاہیں صرف دیکھتی ہی نہیں، کھاتی بھی ہیں۔ بولتی بھی ہیں ______ سونگھتی بھی ہیں۔ سنتی بھی ہیں۔ بہری بھی ہو سکتی ہیں۔ اندھی بھی۔ اور کبھی کبھی ایسے ...... Prism کی طرح کام کرتی ہیں کہ آپ کے دل کے مخفی ترین گوشے میں چھپا ہوا تاریک ترین جذبہ بھی منعکس کر دیتی ہیں۔ گو اس امریکی کی نگاہوں میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس نے اپنی نگاہوں سے اس بھری بار میں اپنی ساتھی نیگرو لڑکی کے کپڑے اُتار دیئے ہیں۔ اور ہم اس نیگرو لڑکی کو ایک تو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے اس کے امریکی چاہنے والے کی نگاہوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے اس نیگرو لڑکی کے دو بلوریں جسم

ہوں اور ایک دوسرے سے مختلف زاویوں میں مدغم ہوں۔

مگر ان حسیناؤں کے باوجود اکثر مرد کبھی چور نگاہوں سے کبھی بے باک نگاہوں سے جولی کی طرف زیادہ دیکھتے ہیں۔ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کے حسن میں کوئی بات ایسی ہے جو جولی کو اس کا علم ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے۔ اور اس امر نے اس کے دل میں ایک پُروقار اطمینان پھر سے پیدا کر دیا ہے — جو ہر خوبصورت عورت کے دل میں اپنے حسن کی استقامت کے یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ اور دن میں کئی بار اس یقین کو دُہرانا ضروری ہے۔ اور اس کی استقامت کو پرکھنا ضروری ہے کہ کہیں کوئی چول ڈھیلی تو نہیں۔ اس وقت چاروں طرف سے جولی پر نگاہوں کی جو بارش ہو رہی ہے اس نے جولی کو ایسا سکون اور اطمینان عطا کیا ہے کہ وہ اپنے آپ میں مگن سوئٹر بُن رہی ہے۔ مارٹینی پی رہی ہے۔ اور کانچ کی دیوار کے باہر کے منظر کو دیکھ رہی ہے اور کبھی کبھی نگاہ اُٹھا کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے اُن چاروں کو دیکھ لیتی ہے۔ جو بیئر کے بڑے بڑے مگ اپنے سامنے رکھے ہوئے ایک ایسی بحث میں مصروف ہیں جس میں جولی کو کوئی زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے۔ ان چاروں میں ایک تو کنول ہے۔ دوسرا سری نگر کا ایک وکیل ہے سوم ناتھ زتشی۔ تیسرا ایک امریکی مصنف ہے مائیکل ہارکنس جو دو سال سے ہندوستان میں گھوم رہا ہے۔ وہ ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے۔ جس کا عنوان The changing pattern of Indian civilization. ہو

اس کتاب کو امریکہ کے مشہور پبلشر ہارڈ اینڈ بلاٹینن چھاپ رہے ہیں اور وہ دو سال
سے وہی مائیکل کا خرچہ برداشت کر رہے ہیں۔ چوتھا اُمیش نرائن سکسینہ کنول کا
نیا زاد بھائی جو اس وزٹ کے لئے گل مرگ آیا تھا کنول کا مہمان ہو کر۔ سوم ناتھ
زتشی نرمے گہرے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے گہرے بھورے بالوں میں کہیں
کہیں شمشیر سے لگے ہوئے تھے۔ اور اس کا سارا چہرہ موم اور شنگرف کا بنا ہوا
معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک زندہ آدمی تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ ہزاروں برس سے
اس کے خاندان میں کہیں کوئی باہر کا میل نہیں ہوا۔ اس لئے زندہ ہوتے ہوئے بھی
اس کے چہرے میں ایک ممی کی سی کیفیت۔ اور جوانی کے باوجود ایک عجیب قسم کی
کہنگی جو بے حد نجیب الطرفین کشمیری خاندان والے کے چہرے پر جھلکتی ہے۔
یہ چہرہ کبھی کبھی موم کا بنا ہوا لگتا ہے۔ کبھی کبھی قدامت کا ایسا عجیب تاثر چھوڑتا
ہے کہ اس کا خیال آتے ہی جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ کیونکہ الگ
الگ مذاہب کے وجود ہم لوگوں کی تہذیب ایک ہے۔

"کیا ضرورت ہے ایک تھی؟" اُمیش نے طنز سے پوچھا۔ وہ بے حد شریر طبیعت
تھا۔ اور ہر بات کا بُرا پہلو دیکھتا اور دکھاتا اچھا ہوتا تھا۔ پھر بحث کرنے کی بھی اس کی
عادت تھی۔ یعنی بحث کی خاطر بحث۔ بلکہ کج بحثی میں اُسے مزا آتا تھا۔ کیا گزشتہ پانچ سو
برسوں میں کہ جب مسلمان کشمیر پر حکمراں رہے ایک نئی اور الگ تہذیب نے جنم نہیں لیا۔
جس کے فلسفے اور کلچر کی بنیادیں پچھلی تہذیب سے الگ ہیں؟

سوم ناتھ وتسٹی بولا۔ یوں تو ساری دنیا میں مختلف خیالات اور سماجی حالات کے کارن مختلف تحریکیں چلی ہیں۔ اور آویزش کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے۔ لیکن مختلف ملکوں میں اس کی صورتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ کہیں پر آویزش کی کارفرمائی زیادہ درشت ہے۔ جیسے اسپین میں۔ اسپین میں سات سو سالہ مسلم حکومت کے باوجود وہاں کی مسیحیت نے مسلمانوں کو اکھاڑ پھینکا۔ اور انھیں ان کے افکار سمیت اسپین سے بدر کر دیا۔ کہیں پر آویزش سے زیادہ آمیزش کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ایسے خوش قسمت ملکوں میں کشمیر کی مثال بھی دی جا سکتی ہے۔ یہاں پانچ سو سالہ مسلم حکومت کے دوران جو تہذیب پیدا ہوئی وہ پرانی تہذیب کی نقل نہ تھی۔ وہ بالکل ایک نئی تہذیب بھی نہ تھی۔ ایک طرح سے کہنا چاہیے کہ دونوں کا عجیب و غریب سنگم تھی۔ ان دو مختلف دھاروں کا سنگم اس عجیب و غریب امتزاج سے ہندوستان کے کسی اور خطے میں وقوع پذیر نہ ہوا ہوگا۔

"کس طرح سے؟" مائیکل پارکنسن نے اپنی نوٹ بک نکال لی تھی اور پنسل سے نوٹ کرتا جاتا تھا۔

دراصل مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہی یہاں پر ایک نئے فلسفے کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ وتسٹی سمجھانے لگے۔ جسے تریکا شاستر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جس میں ہندو مذہب اور بدھ دھرم کی بہترین تعلیمات جمع کر دی گئی تھیں۔ اس تریکا شاستر کے فلسفے کو شیومت سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ بعد میں جب مسلمان آئے

تو انہوں نے اس سلسلے کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ مسلم صوفیوں نے اس میں مناسب اضافے کرکے کشمیری راہبوں کے ایسے سلسلے کو فروغ دیا جن کی عزت کشمیر کے ہندو اور مسلمان دونوں کرتے تھے۔ ان کشمیری راہبوں کو ہماری زبان میں رشی کہا جاتا ہے۔ جو ممکن ہے سنسکرت لفظ رشی کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ان رشی عارفوں میں آپ کو ہندو بھی ملیں گے اور مسلمان بھی اور دونوں ایک دوسرے کے مرشد اور مرید بھی۔ علاوہ ازیں دونوں کا طریق عمل ایک سا تھا۔ عبادت گزاری۔ سادہ زندگی۔ شادی سے اجتناب، خدمتِ خلق اور گوشت سے پرہیز کرکے صرف جڑی بوٹیوں کو کھا کے زندہ رہنا۔ ان رشی راہبوں نے بہت حد تک وادی میں ہندو مسلمان کی تہذیبی تفریق مٹا کے ایک ملی جلی تہذیب کو جنم دیا تھا۔ جو آج بھی باقی ہے۔ تہذیبوں کے اس سنگم میں اور ملک کے اس امتزاج میں جس کا اصل تقویٰ کا ذکر ابھرتا ہے۔ اُن میں پرمانند، سیتا عارفہ، شیخ نورالدین ولی، کرشن دیپرتو، نند رشی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ہندو مسلمانوں کے میل جول سے رشی مت وجود میں آیا۔ جس کے مت میں فرقے اور عقیدے کا کوئی فرق نہیں تھا۔ یہاں تک کہ بہت سے مسلمان رشی بزرگوں پر ہندوؤں نے ہندو ہونے کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ شیخ نورالدین ولی کو آج بھی ہندو نند رشی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ لوگ گوشت تو گوشت آخر میں دودھ چاول اور سبزی تک کھانے سے گریز کرنے لگے تھے۔ اور صرف جڑی بوٹیاں کھا کے گزر کرتے تھے اور یہی ساری زندگی کا دوام

خلوت میں گزار دیتے تھے۔ یا پہاڑی غاروں اور گپھاؤں میں بند ہو کے ریاضت کیا کرتے تھے۔"

"اس میں نئی بات کون سی ہے۔؟" انیش سکسینہ نے پوچھا۔ "یہی جھگڑا کبیر کے بارے میں کھڑا کیا تھا۔ کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان؟ دونوں فرقے انھیں اپنا مانتے تھے۔ ہندو سنیاسیوں اور مسلم صوفیوں کی بھی ہندوستان میں ایسی کوئی کمی نہیں ہے۔ جنھوں نے ترکِ دنیا کر کے عبادت گزاری میں اپنا وقت گزارا ہو۔ اور ہندو مسلم ایکتا کی تلقین کی ہو۔"

"سب مانتا ہوں۔" دوشی بولا۔ "لیکن کشمیر میں اس کا اثر بہت گہرا پڑا ہے۔ اس ریشی تحریک کا۔ یوں کہنا چاہیے کہ صوفیوں کی وہ تحریک جو ہندوستان میں ایک مشترکہ تہذیب کو پورے طور پر جنم نہیں دے سکی۔ وہ کشمیریوں نے اپنے وطن میں جگہ دے کر وہ معجزہ کر دکھایا۔ کشمیری عوام میں بلا لحاظ مذہب و ملت بہت ساری مشترکہ روایات آج بھی ملتی ہیں۔ کھیر بھوانی ہندوؤں کا متبرک تیرتھ استھان ہے۔ لیکن آپ وہاں جائیے تو آج بھی اس کی پوجا کے لئے پھول پتے دودھ میوے وغیرہ کا کام مسلمان کرتے ہیں۔ عیش مقام پر بابا زین الدین کی زیارت گاہ اور سری نگر میں شاہ ہمدان صاحب اور مخدوم صاحب کی زیارتوں کو ہندو اور مسلمان دونوں مانتے ہیں۔ بتہ مالو صاحب کی زیارت گاہ پر ہر سال لاکھوں کا میلہ ہوتا ہے۔ مئی کے مہینے میں یہ میلہ چار دن تک لگتا ہے۔ اور

ہندو اور مسلمان دونوں یہاں منتیں ماننے آتے ہیں اور دونوں فرقوں کے لوگ
چار دن تک گوشت خوری سے پرہیز کرتے ہیں۔ دیوسر میں تو تریپورسندری دیوی
کے استھان پر مسلمان آتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرح منتیں مانتے ہیں کیونکہ
تریپورسندری دیوی اور اننت ناگ میں راگنیا دیوی کے استھان بھی اسی طرح
دونوں فرقوں کی نگاہ میں مقدس اور لائق احترام ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے
مولوی اور پنڈت تعویذ اور گنڈے دیتے ہیں اور یہ سلسلہ مسلمانوں سے پہلے کے
زمانے سے چلا آتا ہے۔ لیکن ایک بات ان تعویذوں میں جو بے حد اہم سمجھی جانی
چاہیئے وہ ان کی زبان ہے۔ ان تعویذوں کی زبان میں ہندو دیوتاؤں کے نام بھی
آتے ہیں اور مسلمان فرشتوں کے بھی۔ زبان بھی ملی جلی ہوتی ہے یعنی سنسکرت کے
ساتھ ساتھ عربی اور فارسی بھی۔ ہے یہ غیر اہم باتیں نہیں؟

میں اس ارتباط کے وجود سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن اس سے بھی بڑی حقیقت
یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں میں کشمیر کے ہندو اور مسلمان بھی ایک دوسرے
سے دور ہوتے گئے ہیں۔ ورنہ اننت ناگ کو اسلام آباد کا نام دینا کیا معنی رکھتا ہے
امیش سکسینہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ اس کے ماتھے کے بیچ میں ایک رگ ابھر
آئی تھی۔ وہ پھر کہنے لگا۔ یہ بھی کرنل واسے شرارت کی آگ کیا تھا۔ شیخ [illegible]
ایسے پیدا نہیں ہوتے۔ ان پر امن وادیوں میں بھی پیدا نہیں ہوتے۔ گزشتہ پچاس
برسوں میں کشمیری مسلمان پاکستانی مسلمانوں کے قریب ہوتے گئے اور اپنے اقتدار [illegible]

میں کم ہوتے گئے۔"

"تو کیا جموں کے ہندو جن سنگھ کے زیادہ قریب نہیں ہوتے گئے؟" کنول نے بحث میں پہلی بار حصّہ لیتے ہوئے کہا۔ اب تک وہ خاموشی سے سُن رہا تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد اب کشمیر کی تقسیم کی تجویز ایک مسلمان نے نہیں بلکہ ایک ہندو نے ملک کے سامنے رکھی ہے۔"

"اس میں ساری غلطی تم کشمیری پنڈتوں کی ہے۔" مہیش سکسینہ نے ایک انگلی اٹھا کر اسے تنبیہی انداز سے زتشی کی طرف گھماتے ہوئے کہا۔ "جناب آپکو معلوم ہے۔ اب وہ مائیکل پارکنسن کی طرف متوجہ ہوا۔ "کشمیر میں موجودہ تنازع اور چپقلش کے ذمے دار اصل میں یہ کشمیری پنڈت ہیں۔"

"وہ کس طرح۔؟" مائیکل پارکنسن کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

"مجھ سے پوچھو۔" مہیش سکسینہ بولا۔ "سن ۱۳۲۰ء میں کشمیر میں سہدیو حکمران تھا۔ اس سال ذوالقدر خان جو چنگیز خان کی اولاد تھی کشمیر پر سات ہزار گھڑ سواروں کے ہمراہ ___ حملہ آور ہوا۔ راجہ سہدیو مقابلے کی ہمت نہ پاکر کشتواڑ بھاگ گیا۔ جہاں کے راجہ سے اس کا رشتہ تھا۔ ذوالقدر خان نے جسے کشمیری اپنی زبان میں ذولچو کہتے ہیں۔ کشمیر میں لوٹ مار کرنے کے بعد ہندوستان لوٹنے کی ٹھان لی لیکن راستے میں برف باری سے اس کی فوج کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا ملک کی تباہ حالی نے پہاڑی قبیلوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کی طرف مائل کیا۔ اور

اس افراتفری کے زمانے کو رنچن شاہ نے اپنی حکمت عملی سے فرو کیا۔"

"ٹھہرو۔" مائیکل پارکنسن بولا "یہ رنچن شاہ کہاں سے آ ٹپکا۔ ذکر سہدیو راجہ کا ہو رہا تھا۔

"رنچن شاہ بدھ مت کا پیرو تھا۔ یہ کشمیر میں اپنے اور دو ساتھیوں سمیت وارد ہوا تھا۔ ایک کا نام شاہ میر تھا۔ یہ شاہ طاہر کا بیٹا تھا اور مسلمان کا بیٹا تھا۔ تیسرا ہندوستان کا ایک سردار لنکر چک تھا۔ یہ تینوں راجہ سہدیو کے زمانے میں اپنی قسمت آزمانے آئے تھے اور راجہ کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ بعد میں راجہ کے بھاگ جانے کے بعد ان کے جوہر کھلے۔ افراتفری اور تباہ حالی کے زمانے میں رنچن نے شاہ میر کی مدد سے کشمیر میں امن و امان قائم کیا اور شاہ میر کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ یہ کشمیر کا پہلا مسلمان وزیر تھا۔

رنچن نے کشمیر کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے قدم جمانے کی خاطر راجہ سہدیو کے وزیر رام چندر کی بیٹی کوٹا رانی سے شادی کر لی۔ رنچن بدھ مت کا پیرو تھا۔ کوٹا رانی ہندو تھی۔ اور وہ رنچن کو جو اس وقت کشمیر کا راجہ بن چکا تھا۔ ہندو دھرم میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن سوم ناتھ زتشی کے بزرگوں نے رنچن کو اپنے مذہب میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔

"کیا یہ سچ ہے؟" مائیکل کے ابرو اوپر اٹھ گئے۔

زتشی نے اثبات میں سر ہلایا۔

رمیش بولا۔ "جب رینچن کو ہندوؤں نے اپنے مذہب میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ تو وہ مسلمان ہو گیا۔ اور اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد اس کی رعایا کے بہت سے لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ گویا کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت کو قائم کرنے کا سہرا بھی ان کشمیری پنڈتوں کے سر ہے!"

رمیش ہنسنے لگا۔ زرتشتی بھی ہنسا ______ مائیکل نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بلاڈی فولز۔" اس نے زور سے کہا۔ اور نوٹ بک بند کر دی۔

کنول نے کہا۔ "بلاشبہ اب بھی وادی میں آویزش کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اور یہاں پر میں زرتشتی سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن آویزش اور آمیزش کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اور میں اس بات پر رمیش سے اتفاق کروں گا کہ گزشتہ پچاس برسوں میں آمیزش سے زیادہ آویزش کے سلسلے کو تقویت پہنچی ہے۔ جس کی ایک مثال پاکستان کا قیام ہے۔ اور دوسری مثال شمالی ہند میں جن سنگھ کا غیر معمولی پھیلاؤ۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ سلسلہ کہاں پر جا کر رکے گا۔"

جمیلہ نے اون کے گولے میں دونوں سلائیاں زور سے گھونپ دیں۔ اور جمائی لے کر بولی۔ "یا خدا۔ میں بالکل بور ہو چکی ہوں۔ اس بحث سے ...."

"واقعی بحث طویل تھی۔" کنول نے صاد کیا۔ "اب کیا کریں؟"

"سوچا تھا۔ شام کو گھڑ سواری کریں گے۔" جولی بولی۔ "مگر وہ وقت

بحث میں نکل گیا۔ اور اب رات آ گئی ہے۔ ڈنر کا وقت ہو چلا ہے۔ ڈائننگ روم سے بینڈ کی آواز آ رہی ہے اور مجھے کچھ کچھ بھوک لگ رہی ہے۔"

"تو کھانے کے کمرے میں چلیں۔" مائیکل بولا۔ "مگر پہلے ڈرنک کا آرڈر دے دیں۔"

"وہسکی؟ پانچ وہسکی؟"

"پانچ نہیں چار۔" جولی بولی۔ "میں سہ پہر سے پی رہی ہوں۔ اب پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کھانے کے ساتھ کچھ نہیں لو گی؟" مائیکل نے پوچھا۔

"سیب کا جوس لے لوں گی بس!"

"تو ایک شیری یا سائیڈر۔"

"اچھا تو ایک سائیڈر۔" جولی سر ہلا کے بولی۔ اس کا گورا اور سڈول سراپا اس نے اپنے شرٹ شوٹ میں پہن رکھا ہے۔ اور ہم سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور اسے بیٹھی سے جھلانے لگی۔ کنول، ڈشی، مائیکل اور امیش جلدی سے اپنا ڈرنک ختم کر کے اٹھے۔ جولی نے کنول کے ہاتھ کا سہارا لیا اور یہ قافلہ بار سے ڈائننگ روم میں منتقل ہو گیا۔ جہاں اس وقت ڈانس شروع ہو چکا تھا۔ اور ڈانس فلور کے کنارے میزوں اور سوپ کی پلیٹوں میں چمچے کھنک رہے تھے۔

مائیکل نے ایک شوخ و شنگ ہندوستانی لڑکی کو ناچ کی دعوت دی اور کنول نے جینگر و لڑکی سے ڈانس کے لئے کہا۔ وہ اس کے ساتھ فلور پر آگئی۔ ناچتے ناچتے اُس نے بتایا۔ میں کیلی فورنیا کی ہوں۔ لاس اینجلز میں رہتی ہوں۔ نفسیات پڑھاتی ہوں۔ مارگریٹ ریشیل میرا نام ہے تم مجھے میگی کہہ سکتے ہو اور تم بتاؤ تمہارا کیا نام ہے۔

میں نے کہا۔ "میرا نام کنول ہے اور میں پلاسٹک سرجری کا ماہر ہوں یعنی ماہر سمجھا جاتا ہوں۔ کئی برس کے بعد لندن سے اپنے وطن لوٹا ہوں۔ اپنی بیوی کو ہندوستان گھما رہا ہوں۔"

"وہ انگریز لڑکی جو تم اشارہ لگتی ہے؟" میگی نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تمہاری کمر کا خم بیحد دلکش ہے۔ میں نے اس قدر پتلی کمر مغربی عورتوں میں کم دیکھی ہے۔" میں نے اُس سے کہا اور پھر سوچا۔ کیا وہ امریکی تمہارا شوہر ہے؟

"کون ڈیوڈ؟" میگی نے اشارہ کیا۔

میں نے سر ہلایا۔

"نہیں وہ تو میرا منگیتر ہے۔ مگر میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" میگی کے بے حد سپید دانت دمک گئے۔

جول نے ابھی اپنا سوپ ختم کیا تھا کہ ڈیوڈ گھومتا ہوا اٹھ کر اس کے پاس

جھک کر اس سے ڈانس کی درخواست کرنے لگا!

جولی نے خفیف سی مسکراہٹ سے سر ہلا کر اس سے انکار کر دیا۔

ڈیوڈ گوڈرڈ چائیلڈ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر وہ واپس چلا گیا۔ اپنی میز پر اور جب ڈانس ختم ہوا۔ اور بیگم اور کنول الگ ہوئے تو وہ اپنی میز سے اٹھ کر واپس آتے ہوئے جوڑوں کے قریب پہنچ کر کنول سے کہنے لگا "یہ کیا بات ہے۔ میری بیگم نے تو تمہیں انکار نہیں کیا۔ لیکن تمہاری لڑکی نے میرے ساتھ ناچنے سے انکار کر دیا۔"

کنول نے مسکرا کر کہا "A woman's privilege"

"مائی فٹ!" ڈیوڈ کچھ بیزاری سے بولا۔ اور بیگم کو تھام کر اسے اپنی میز پر لے گیا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد جب وہ لوگ اٹھے تو کنول نے پھر جولی کو ذرا سا سہارا دیا۔ چلنے میں جولی کا لنگ ذرا سا نمایاں ہونے لگا تو ڈیوڈ کی میز سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ جولی نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لیکن اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوتا چلا گیا۔ کنول نے پلٹ کر دیکھا ________

________ یہ ڈیوڈ کی ہنسی تھی۔ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا تھا اور وہ چپ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ہنسی ایک نشتر کی طرح جولی کے سینے میں اتر چکی تھی۔ جب وہ کمروں کے کوریڈور سے جلدی سے

گزر کر اپنے بیڈ روم میں پہنچی تو بستر پر گر کر رونے لگی۔

"میں لنگڑی ہو رہی میں لنگڑی ہوں!" سسکیاں اس کے سینے سے نکل رہی تھیں۔

کنول نے اسے اپنی باہوں میں لیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اس کے گال آنکھیں بال، گردن، شانے.....

"مجھے تمہاری یہی لنگ پسند ہے۔" کنول میٹھی سرگوشیوں میں اس سے کہنے لگا۔ "اس سے چلنے میں تمہاری کمر میں جو ایک گھماؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس پر میری جان جاتی ہے۔" وہ اس کی باڈیس کے بٹن کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

بعد میں، جب وہ دونوں پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے تو کنول نے ذرا ہنس کے کہا۔
"معلوم ہے آج جو کچھ ہوا اس سے مجھے کشمیر کی ایک پرانی لوک کہانی یاد آئی ہے
جو بہت مدت ہوئی میں نے سنی تھی"

"کیا کہانی تھی وہ۔ اوں؟" جولی اس کا ہونٹ چوم کر بولی۔ "اوں؟"

"تم نے جس طرح اس امریکی کے ڈانس کی آفر رد کر دی اور جس کی وجہ سے وہ
احمقانہ طور پر ہنسا۔ اس سے مجھے مولوی عطاء اللہ اور ڈیچو کی کہانی یاد آ گئی"

"سناؤ ناں!" وہ شہد بھرے لہجے میں بولی۔

"کیا تمہیں نیند تو نہیں آ رہی ہے؟" کنول نے اس کے ابھرے ہوئے سینے کے
پیچ در پیچ ریشم کو اپنی ہتھیلی سے دبایا۔ جولی نے اس کا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔ پھر

اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اور کہنے لگی۔

"ہاں آتی تو رہی ہے مگر کہانی سننے کو بھی جی چاہتا ہے۔"

میں نے کہا: "وادی کے دور افتادہ دامن میں، دو پہاڑوں کی تنگنائے میں ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ دونوں طرف گھاٹیوں پر جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک پُرشور نالہ بہتا تھا جس میں اوپر جنگل سے چیڑ اور دیودار کے تنے کٹ کر بہتے ہوئے آتے تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں کو ٹھیکے دار اس امر کی مزدوری دیتے تھے کہ وہ لکڑی کے لٹھے جو اکثر نالے میں ایک جگہ آکر جمع ہو جاتے تھے اور آگے جانے کا بہاؤ روک دیتے تھے۔ انھیں الگ کر کے آگے بہا دیں۔ گاؤں کے اکثر مکان لکڑی کے اونچے لٹھوں سے بنے تھے۔ دیہاتی بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ لکڑی کاٹنے کے موسم میں لکڑی کے لٹھے بناتے اور کھیتی باڑی کے وقت کھیتی باڑی کیا کرتے۔ مگر کھیتی باڑی کے لیے جگہ اس قدر کم تھی کہ مکئی کے سوا کھیتوں میں کچھ پیدا نہ ہوتا اور جو دھان کے کھیت ہوتے وہ اکثر پُرشور نالے کے بہاؤ میں بہہ جاتے تھے۔ اس گاؤں کا مولوی اور [illegible] کا بڑا بارعب چالاک مولوی تھا۔ وہ شادیاں اس نے کر رکھی تھیں اور تیسری کی فکر میں تھا۔ گاؤں میں وہی تعویذ گنڈے بانٹتا تھا۔ شادیاں کراتا تھا۔ انھیں رجسٹر کرتا تھا اور گاؤں میں موت اور پیدائش کا حساب رکھتا تھا۔ اور آنے جانے گزرنے والے سرکاری حاکموں تک اس کی رسائی تھی۔

"وہ تیسری شادی کیوں کرنا چاہتا تھا؟" جولی نے پوچھا۔

"اسلام میں چار شادیاں جائز ہیں۔"

"تب تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے۔" جولی نے پوچھا۔ "بڑے مزے میں رہو گے۔"

میں نے کہا۔ "اگر تمہارا یہی مشورہ ہے تو مجھے کب انکار ہے۔"

"گلا گھونٹ دوں گی تمہارا!" جولی نے اپنے دونوں ہاتھ میرے گلے پر رکھ دیئے۔ مگر آہستہ دبایا نہیں۔ دانتوں سے پکڑ کے چھوڑ دیا۔ میں نے اس کا نرم گرم لطیف لمس اپنی گردن پر محسوس کیا۔ دانت گڑنے میں درد کی نہ جانے ایک عجیب لذت سی محسوس ہوئی.....

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے کہا۔ اس گاؤں میں حمید نام کا ایک چرواہا رہتا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور خوبصورت تھا اور گو اس کے پاس زمین بہت کم تھی لیکن بھیڑ بکریاں چراتا اور شام کو اپنے مویشی خانے میں لے آتا۔ پھر نالے کے کنارے اپنے شہتیروں کے مکان میں اپنے بڈھے ماں باپ کے ساتھ کھانا کھا کے لکڑی کے فرش پر کمبل بچھا کے سو جاتا۔

"بے چارہ اکیلا سوتا تھا۔" جولی نے افسوس سے سر ہلا کے کہا۔ "اکیلے سونے میں کیا مزا ہے؟"

"تم کہانی تو سنو۔ ایک دن اس نے جنگل میں اپنا ریوڑ چراتے چراتے بس

ایک لڑکی کو دیکھ لیا۔ اس کا نام زیناں تھا۔ اور وہ بہت خوبصورت تھی۔ کشمیری لڑکیاں تم دیکھ چکی ہو۔ اکثر خوبصورت ہوتی ہیں۔ مگر زیناں بہت خوبصورت تھی تیکھے نقش، ستواں ناک، غنچہ دہن، رنگت جیسے گلاب اور بالائی۔

"یعنی گلاب رخساروں پر اور بالائی گردن پر؟" جولی نے شریر نگاہوں سے میری طرف تاکا۔ پھر پوچھنے لگی۔ "جنگل میں وہ کیا کرتی تھی؟"

"وہ اپنے گاؤں سے ریوڑ چرانے جمید کے جنگل میں آنکلی تھی۔ وہ بھی چرواہی تھی۔ اس لئے دونوں میں بہت جلد دوستی ہوگئی۔ جمید تو اسے دیکھتے ہی دل دے بیٹھا۔ کہنے لگا۔

"زیناں تو تو بہار کے پہلے دن کی صبح کی طرح حسین ہے۔"

"لگتا ہے تم نے زیناں کو کہیں دیکھا ہے! اتنی تعریف جو کر رہے ہو اس کی۔" جولی کے لہجے میں رشک کا شائبہ سا ابھرنے لگا۔ "کہاں دیکھا تھا تم نے اس کو؟"

"ہوں بے وقوف بچی۔ ایک کہانی سنا رہا ہوں۔"

"کیا وہ مجھ سے بھی خوبصورت تھی؟"

کنول نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں کے نیچے سے ڈال کر اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر دیر تک اس کے ہونٹ چومتا رہا۔ جولی کا سارا غصہ دور ہوگیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی "آگے سناؤ۔"

"جب دونوں میں عشق ہوگیا تو ایک دن جمید نے زیناں کے ساتھ اسکے

گھر جاکر لڑکی کے ماں باپ سے شادی کے لئے کہا۔ لڑکی والوں نے پہلے تو انکار کیا مگر جب زیناں کا جذبہ دیکھا۔ چھپکے چھپکے حیدر کے گاؤں جاکر اس کا گھر دیکھا مویشی خانہ دیکھا۔ ریوڑ دیکھا۔ اس کے شریف ماں باپ سے ملے تو ہاں کر دی۔ حیدر کو زیناں سے شادی کرنے کی اس قدر جلدی تھی کہ اس نے نکاح میں زیادہ لوگوں کو بلایا تک نہیں تھا۔ بس قریب کے چند رشتے دار اور دوست لے کر لڑکی والوں کے گاؤں چلا گیا اور زیناں کو بیاہ کے لے آیا۔ اُسے شادی کی اتنی عجلت تھی کہ شادی کرنے سے پہلے اس نے اپنے گاؤں کے مولوی عطا اللہ سے مشورہ تک نہیں کیا۔ ویسے یہ نکاح مولوی عطا اللہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ لڑکی والوں کے گاؤں کا مولوی دوسرا تھا۔ مگر قاعدے سے حیدر اور اس کے ماں باپ کو اپنے گاؤں کے مولوی سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا اور یہ بات مولوی عطا اللہ کے دل میں چبھ گئی۔

اور وہ سوچنے لگا کہ اگر اس طرح روایت قائم ہو گئی اور اس طرح اس کے گاؤں والوں نے اسے نظر انداز کرنا شروع کیا تو اس کی تو چھٹی ہو جائے گی اور وہ روزی سے بھی جائے گا۔

"میں کہتی ہوں تین مہینے سے ہم ہندوستان میں گھوم رہے ہیں۔ تم اپنی روزی روٹی کا سلسلہ کب شروع کرو گے کیا تمہارے گھر والے بہت امیر ہیں؟"

"ابھی ٹھاٹھ ہیں"۔ جولی نے زبان نکال کر اس کا منہ چڑایا۔

کنول نے آگے بڑھ کر اس کی زبان اپنے منہ میں لے لی۔ چند لمحوں کے بعد جولی نے

منہ پھیر کر کہا۔ "ہٹو۔ گندے۔ کہانی سناؤ۔ نہیں تو۔"

"نہیں تو کیا؟"

"نہیں تو اپنی زبان تمہارے منہ میں رکھ دوں گی۔"

"اس کا مطلب ہے تم کہانی سننا نہیں چاہتی ہو۔"

"نہیں، نہیں سناؤ۔ مجھے مولوی عطا اللہ سے دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ کیا وہ

بہت ہینڈسم تھا؟"

"ادھیڑ عمر کا سخت گیر مولوی تھا۔ داڑھی بھی رکھتا تھا۔"

"مجھے سخت گیر آدمی اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً جو داڑھی رکھتے ہوں۔"

جولی نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے تم پوری کہانی تو سن لو۔"

"سناؤ۔"

دلہن کو گھر میں لانے کے بعد جیدے اور اس کے ماں باپ نے دعوت کی۔ اس دعوت میں مولوی صاحب کو تو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ مولوی عطا اللہ گئے اور جب دلہن ان کے سامنے لائی گئی تو انہوں نے ساری محفل کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ ہٹ گئے۔ صرف دلہا دلہن لڑکے کا باپ اور اس کی ماں کمرے میں رہ گئے۔ اور دلہن!

مولوی نے نظر بھر کے دلہن کو دیکھا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ایک خوبصورت

لڑکی اس نے زندگی میں آج تک نہ دیکھی تھی۔ شرمائی لجائی سی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں پھیلا کاجل اور بھری بھری گوری باہوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں.... مولوی نے سوچا کر زور سے پاؤں زمین پر پٹخا اور لاحول پڑھ کر بولے۔

"یہ دلہن اس گھر کے لئے نامبارک ہے۔"

"نامبارک ہے؟" لڑکے کے باپ نے گھبرا کر پوچھا۔

"بدقدمی ہے۔" مولوی نے خشونت آمیز لہجے میں کہا۔ "گھر کو برباد کر ڈالے گی۔"

"کیا کہتے ہیں آپ؟" حمیدے کی ماں گھبرا کر بولی۔

حمیدے نے مولوی صاحب کے پاؤں پکڑے۔ گڑگڑا کر بولا۔ "کوئی تعویذ گنڈا ایسا دے دیجئے جس سے دلہن کے سر سے یہ آفت ٹل جائے۔"

"ہو نہیں سکتا۔" مولوی صاحب فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "آفت کی پڑیا یہ تو خود ہے جب تک اس گھر میں رہے گی۔ تباہی لاتی رہے گی۔"

"جو کچھ خدا کرے گا اس کی مرضی!" دولہا کا باپ بولا۔

"تم سمجھتے نہیں ہو۔" مولوی نے اپنی دونوں آنکھیں حمیدے کی ماں پر گاڑ دیں۔ "یہ دلہن لڑکے کے لئے منحوس ہے۔ جب تک اس گھر میں رہے گی لڑکے کی جان کو خطرہ ہے۔"

اب ماں کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اگر اس کے لڑکے کی جان کو خطرہ ہے تو وہ ایسی منحوس بہو کو اپنے گھر میں کیسے رکھ سکتی تھی۔ بچہ تو اسے اپنی جان سے زیادہ پیارا تھا۔

اس لئے اس نے پھر اپنا سر مولوی صاحب کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"آپ کے ایک تعویذ سے جن اور بھوت بھاگ جاتے ہیں۔ کچھ ایسا کیجئے جس سے یہ چڑیل ٹل جائے اور میری زیناں میرے گھر میں رہے۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" مولوی صاحب سر ہلاکے بولے۔ پھر لڑکے کے باپ اور ماں کو الگ لے جاکے کہنے لگے کہ اگر تم نے آج کی رات میں کر ابھی اس لڑکی کو گھر سے نہیں نکال دیا تو ممکن ہے آج کی رات ہی حمید کی موت ہو جائے۔

اپنے بیٹے کی جان جاتے دیکھ کر حمید کے ماں باپ دونوں دلہن کو گھر سے نکالنے پر تیار ہو گئے۔ مگر اب سوال یہ تھا کہ دلہن کو رات کے وقت نکالیں تو کس طرح، لوگ کیا کہیں گے؟

اس پر مولوی نے انہیں بہت عمدہ تجویز سمجھائی۔ بولا۔ "یہ لڑکی اصل میں چڑیل ہے۔ اسے ہٹانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے لکڑی کے ایک صندوق میں بند کرکے ندی میں بہا دو۔ تم لوگوں کی جان خود بخود بچ جائے گی اور یہ چڑیل بھی بہا کے دفع ہو جائے گی۔"

حمید بہت رویا دھویا۔ گڑگڑایا۔ سر پہ دوہتڑ مارا مگر اس کی کسی نے ایک نہ سنی۔ انہوں نے لڑکی کو رسی سے باندھ کر لکڑی کے ایک صندوق میں بند کرکے ندی میں بہا دیا۔

مولوی تجویز سمجھا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کا گھر گاؤں سے باہر دو ٹیلے کے نیچے واقع تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ کتنی دیر میں عورتوں کا صندوق نالے میں بہتا بہتا اس کے گھر کے قریب پہنچے گا۔ وہ اس وقت وہاں پر اپنے چند قابلِ بھروسہ دوستوں کے ساتھ نالے کے کنارے موجود رہے گا اور گاؤں کے صندوق کو نالے سے نکال لائے گا اور پھر اسی رات وہ اس کشمیری حسینہ کو اپنی زوجیت میں لے آئیگا۔ اس نے گھر والوں کو بھی اس امر کے لئے تیار کر لیا۔ اُن سے کہہ دیا کہ اُسے خواب میں ایک شخص نے بتایا ہے کہ آج رات اس کے لئے قدرتی دلہن بھیجی جائے گی۔ جسے اُسے اپنی زوجیت میں لینا ہو گا۔ یہ خواب سننے کے بعد اس کی پہلی دو بیویوں کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ مولوی دھڑکتے ہوئے دل سے اپنے دوستوں کو لے کر نالے پر چلا گیا۔ اور صندوق کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کیسی شبِ عروسی بے چاری دلہن کے لئے آئی تھی۔ اس کا اسے خواب میں بھی یقین نہ تھا کہ اب وہ بچ سکے گی۔ مگر جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یہ صندوق بہتا بہتا لہروں میں ڈولتا۔ پتھروں سے ٹکراتے راستے میں مولوی کے گھر سے بہت پہلے ایک جگہ کنارے پر آ کے رُک گیا۔ جہاں دو مسافروں نے ایک درخت کے نیچے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ ایک کا نام تارا تھا اور دوسرے کا نام بیگ اور یہ دونوں بھالو کا تماشہ دکھا کر گاؤں گاؤں گھومتے تھے اور اپنا پیٹ پالتے تھے۔

کنارے پر صندوق کو رکتے دیکھ کر قادر اور بیگ دونوں کو تعجب ہوا۔ پہلے تو دونوں ڈرے۔

"دیکھو قادر وہ کیا ہے؟" بیگ بولا۔

"مجھے تو لکڑی کا صندوق معلوم ہوتا ہے۔" قادر نے جواب دیا۔

"اس کو کھینچ کر یہاں لے آئیں؟" بیگ نے پوچھا۔

"کیا معلوم اس کے اندر کیا ہو۔ کوئی جن یا بلا بند ہو۔ رات کا وقت ہے۔" قادر نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔

"میرے گلے میں اپنے مولوی حبیب صاحب کا تعویذ ہے۔" بیگ بولا۔ "مجھ کو کسی بلا کا اثر نہیں ہو سکتا۔ آؤ صندوق کھول کر دیکھیں اس کے اندر کیا ہے۔ ممکن ہے اشرفیوں سے بھرا صندوق ہو۔ اپنی قسمت کھل جائے۔"

دونوں نے لاکھ جتن کر کے صندوق کھولا۔ رسیوں سے لڑکی کو آزاد کیا۔ دیکھ کے حیران ہوئے۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ لڑکی اس صندوق میں بند کیوں ہے؟ پھر ایسی دلربا ماہ پارہ کہ جسے دیکھتے ہی آنکھ جھپک جائے..... نظر نہ ٹکے۔ کیا حسن ہے کیا ادا ہے؟

"تم کون ہو ـــــ؟" قادر نے پوچھا۔

لڑکی ڈر کے سمٹ گئی۔

تب بیگ نے اسے دلاسہ دیا۔ بولا۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم دیکھ بھالے قریب آ رکے

دی۔ ہم تم سے کوئی برا سلوک نہیں کریں گے۔ تم اپنا احوال بتاؤ۔"

تب لڑکی نے ڈرتے ڈرتے ساری بات بتائی۔ اپنی شادی، مولوی کی بدمعاشی۔ بکسے میں بند ہونا۔ وہ ہوس بھری نگاہیں جن سے مولوی اُسے تاڑ رہا تھا۔ زیناں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

قادر اور بیگ نے سوچ سوچ کے زیناں سے کہا: "تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تم کو اپنی بہن سمجھتے ہیں۔ ہم حمید سے چرواہے کو جانتے ہیں اور اس کے ماں باپ کو بھی۔ اور مولوی کی کرتوتوں کا بھی ہم کو علم ہے۔ ہم مولوی کو سزا دیں گے۔ تم دیکھتی جاؤ۔"

زیناں کی جان میں جان آئی۔

قادر اور بیگ نے اُسے پیڑ کے نیچے بٹھایا۔ اپنے بچھڑے کی رسی کھولی اور اُسے اس لڑکی کے صندوق میں بند ہو جانے کا اشارہ کیا جس میں لڑکی قید کر دی گئی تھی۔ جب بچھڑا صندوق میں بیٹھ گیا تو قادر اور بیگ نے صندوق کا ڈھکنا اوپر سے بند کر دیا اور صندوق کو نالے میں بہا دیا۔

اُدھر اپنے گھر کے نالے کے کنارے مولوی بے قراری سے چکر لگا رہا تھا۔ بار بار مشعلیں جلا جلا کر رات کے اندھیرے میں نالے میں بہتے ہوئے صندوق کی تلاش کرتا تھا اور سوچتا تھا یہ صندوق کمبخت آج راستے میں کدھر رہ گیا۔

آخر وہ صندوق بہتا بہتا مولوی کے گھر کے کنارے کے قریب نظر آیا تو مولوی نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اپنے دونوں دوستوں کی مدد سے صندوق کو باہر

نکال کر اپنے گھر لے آیا۔ اپنے کمرے میں لا کر اس نے اپنے دوستوں کو رخصت کیا۔ اور اپنے کمرے کے دروازے کی کنڈی اندر سے بند کر کے اس نے دھڑکتے دل اور پر شوق جذبوں سے کانپتے ہوئے اس صندوق کا ڈھکن کھولا۔

ڈھکن کھولتے ہی اس میں سے بھالو غراتے ہوئے نکلا اور مولوی پر جھپٹ پڑا۔ جولی زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔

کنول بولا: "ایک عرصے سے آدمیوں نے ریچھ کی ناک میں نکیل ڈال رکھی تھی۔ آج ریچھ ذرا آزاد ہوا تھا۔ اب وہ گن گن کے بدلے گا۔ اس نے مولوی کو دبوچ لیا۔ مولوی زور زور سے چلانے لگا۔ سارا گاؤں جمع ہو گیا۔

"بس۔ بس......" جولی ہنستے ہنستے بولی: "آگے مت سناؤ۔"

"سارے گاؤں والوں کو مولوی کی کرتوت کا علم ہو گیا۔" کنول بولا۔

"ریچھ کو زبان واپس مل گئی۔"

"ہا ہا۔" جولی آگے ہنسنے پر تیار نہ تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی: "مگر یہ بتاؤ۔ ریچھ نے مولوی کے سنگ کیا کیا؟"

"بتاؤں؟" کنول نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر جولی کے سارے جسم کو اپنے جسم میں دبوچ لیا۔

"آں کنول اب نہیں۔ نہیں......"

اب وہ دونوں تھک ہار کر لیٹے ہوئے تھے۔ جولی اپنی دو انگلیوں سے اس کے کان کی لو کو آہستہ سے کھینچ کھینچ کر ویسی ہی سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔

"میرے بھالو...... میرے بھالو....."

کنول نے کروٹ بدلی اور جولی کی بانہہ کا تکیہ بنا کے سو گیا۔

جاڑوں کے دن تھے ۔ پہلے بڑے بڑے اولے پڑے ۔ پھر چھوٹے چھوٹے ۔ آخر میں کنکریوں ایسے اولے گرنے لگے پھر بارش آ گئی اور بارش کے ساتھ دھند ۔ اور بارہ کا کہستانی پس منظر بادلوں میں ڈھک گیا ۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی ۔ اسکا تناسب سے ڈرنک کے آرڈر بڑھ گئے تھے ۔

ہم لوگ جن اور لائم پی رہے تھے یعنی میں اور مسز ناتھ ۔ ڈسٹی اور جیولا بالکل صرف جن پی رہا تھا ۔ اسے شراب میں صرف اس کا خالص پن پسند تھا ۔ جن سے ایک خاص طرح کی مہک سی آتی ہے ۔ جو شراب کے طور پر ووڈکا میں نہیں ہوتی ۔ میں اس مہک کو دور کرنے کے لئے خالص جن کے بجائے گملٹ زیادہ پسند کرتا ہوں ۔

وہ سویڈیش لڑکی ایک کونے میں اپنی اسکیچ بک کھولے کچھ اسکیچ کر رہی تھی۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ہمارے ٹیبل پر آ کے سیدھے جولی سے مخاطب ہو کے کہنے لگی۔

"میں انگرڈ ہوں۔ اسٹاک ہوم سے آ رہی ہوں۔"

جولی نے کہا۔ "میں جولی ہوں۔ جولی سکسینہ۔ یہ میرے شوہر ہیں کنول سکسینہ یہ سوم ناتھ زتشی۔ یہ مائیکل پارکنس امریکی مصنف۔"

انگرڈ بولی۔ "میں تمہاری تصویر بنانا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو میری ٹیبل پر آ جاؤ۔"

جولی انگرڈ کے ساتھ اس کے ٹیبل پر چلی گئی۔ اس کے ٹیبل کے پرے اس امریکی کا ٹیبل تھا جس کے سنگ ناچنے سے جولی نے انکار کر دیا تھا۔ نیگرو لڑکی میگی اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا اونی سویٹر پہن رکھا تھا۔ اور اس کے نیچے گہرے نیلے رنگ کا دھاریدار اسکرٹ۔ میگی کی ٹانگیں بے حد سڈول تھیں اور کسے ہوئے نیلے جمپر میں اس کی چھاتیوں کے نکیلے ابھار بے حد نمایاں تھے اور وہ جب گفتگو کرتے ہوئے اپنے سینے کو جھکاتی تو اس کے سینے کی وادیاں گہرائیوں میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔

مائیکل پارکنس سوم ناتھ زتشی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "پتا ہے ہم دونوں نے کیا آج صبح ہم نے تمہاری کہانی کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔ ترجمہ بہت اچھا ہے اور

کہانی بھی اچھی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا تم افسانے بھی لکھتے ہو۔ میں تمہیں صرف ایک وکیل سمجھتا تھا۔"

"وکالت تو میرا پیشہ ہے۔" زتشی بولا۔ "لیکن ادب میری لگن ہے۔ دراصل میں ایک ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

"تو کیوں نہیں بنتے۔ ہمارے ملک میں اچھے ادیب کی بڑی عزت اور دولت ہے۔"

"بن تو گیا ہوں" زتشی بولا۔ "میں اپنی مادری زبان کشمیری ہی میں لکھتا ہوں۔ لیکن میرے افسانے اور ناول ترجمہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں تک پہنچ جاتے ہیں اور بہت داد پاتے ہیں۔"

"تب تو تم ایک اچھے اور مشہور ادیب ہو گئے؟"

"ہاں ایسا ہی سمجھا جاتا ہوں۔"

"تو پھر وکالت چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ اپنی زندگی کو دو خانوں میں کیوں بانٹ رکھا ہے۔ وکالت چھوڑ دو۔ اپنی ساری زندگی ادب کے لئے وقف کر دو۔ جیسے میں نے کر رکھی ہے۔"

"یہاں کے حالات دوسرے ہیں۔" زتشی نے گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ اور چند لمحے چپ رہنے کے بعد پوچھنے لگا۔ "تمہیں [illegible] نے اس کتاب کے لئے کتنا دیا ہے؟"

"اب تک پچیس ہزار ڈالر مل چکے ہیں۔" مائیکل بولا۔ "دو سال سے میں

ہندوستان میں ہوں۔ انہوں نے مجھے کمیشن کیا ہے کہ میں بدلتی ہوئی ہندوستانی تہذیب پر ایک تفصیلی کتاب لکھوں۔ اس کے علاوہ میں ایک ناول بھی لکھ رہا ہوں۔

دونوں کتابیں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں؟" زرتشی نے پوچھا۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔"

"یہ کیسا جواب ہے۔"

"صحیح جواب ہے۔ ناول تو میں لکھ ہی رہا ہوں۔ بدلتی ہوئی ہندوستانی تہذیب کے نوٹس لے رہا ہوں۔ یہ کتاب میں امریکہ جا کے لکھوں گا۔ ایک سال لکھنے میں لگے گا۔"

"اور ناول ——؟"

"ناول تو اسی سال مکمل ہو جائے گا۔"

"ناول کا موضوع کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک باپ ہے اپنی حقیقی بیٹی سے عشق کرتا ہے۔"

"کیا ایسا کرنا ممکن ہے۔" زرتشی نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "میں جب لندن کے ہاسپٹل میں ڈاکٹر تھا۔ ایسے کئی کیس ہمارے پاس آئے۔ اسقاط کے لئے۔ لڑکیوں نے خود اقبال کیا۔"

"بھئی بھئی۔" زرتشی ہنستے ہوئے بولا۔ "موضوع عجیب و غریب ہے۔ گندہ بھی ہے۔ ابنارمل کرنا چاہئے۔"

"ادب میں ابنارمل بات کا مزا آگیا۔" مائیکل مسکرا کر بولا۔

نیبوکوف نے گیارہ بارہ سال کی نابالغ لڑکی لولیتا کا قصہ لکھا۔ دیکھو کتنا مقبول ہوا۔ لاکھوں کی تعداد میں کتاب بک گئی۔ سیدھے سادے رومانس کو کون پسند کرتا ہے۔ یہ رومانس تو ہر گلی کے نکڑ پر دکھائی دے جاتا ہے۔ لوگ کوئی عجیب و غریب چیز چاہتے ہیں اور وہ بھی سیکس میں۔ موراویا نے ایک باپ اور اس کی سوتیلی بیٹی کے عشق کی داستان قلمبند کی۔

"ہاں!" میں نے کہا۔ "تم شاید Ha lia کا ذکر کر رہے ہو۔"

مائیکل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ قصہ بھی بہت مقبول رہا مگر میرا ناول تو اس سے بھی بازی لے جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے مجھے اس کا کتنا معاوضہ ملے گا؟"

زنشی نے سر ہلایا۔ "نہیں!"

مائیکل بولا۔ "اس کے لائبریری ایڈیشن اور پاکٹ بک ایڈیشن اور فلمی حقوق اور ٹیلی وژن کے حقوق سب کی مالیت ملا کر مجھے کل بیالیس لاکھ روپیہ ملے گا۔"

"بیالیس لاکھ ـــ؟ ایک کتاب کے لئے!"

"اور یہ کچھ نہیں ہے۔ میں دوسرے درجے کا ادیب سمجھا جاتا ہوں۔ صف اول کے ادیبوں کو اس سے دگنا بلکہ سہ گنا معاوضہ ملتا ہے۔ گو وشال کو میں اچھے درجہ کا ادیب سمجھتا ہوں۔ اسے اس کے ناول بابا میکر سیرج کے ابھی ساٹھ لاکھ روپیہ سے زیادہ معاوضہ مل چکا ہوگا میں سمجھتا ہوں۔"

"حالانکہ دو سو صفحے سے کم کی کتاب ہے۔ اور اس کا موضوع دلچسپ ہے — جو عصمت چغتائی کے لحاف کا ہے۔" زرتشتی بولا۔ "اور اگر ایمان کی کہی جائے تو عصمت چغتائی کا افسانہ لحاف گرودت ان کے ناول پر بھاری ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں، عصمت چغتائی کو اس کے افسانے پر سو روپے بھی مشکل سے ملے ہوں گے۔"

"بس سو روپے؟" مائیکل نے حیرت سے سر ہلایا۔

"میرے خیال میں تو کچھ بھی نہ ملا ہو گا۔" زرتشتی نے ترش رو ہو کے کہا۔ "کیونکہ جس زمانے میں عصمت نے لحاف لکھا تھا۔ اس زمانے میں افسانے پر معاوضہ دینے کی روایت ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ لیکن گزشتہ دس سال سے افسانوں پر معاوضہ ملنے لگا ہے۔ وہ بھی ہر رسالہ نہیں دے سکتا۔ صرف چند تجارتی رسالے جو فلمی یا نیم فلمی ہوتے ہیں کسی قدر معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک ادبی رسالوں کا تعلق ہے۔ ان کا ہر ماہ چھپنا اور چھپتے جانا ہی ایک معجزہ ہے۔"

"پھر بھی زیادہ سے زیادہ معاوضہ کیا ملتا ہے؟"

"مجھے تو تیس روپے ایک افسانے کے ملتے ہیں۔ بہت ہوا تو پچاس۔ انگریزی کا سے البتہ سو روپیہ کے قریب مل جاتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی ادب اور صحافت کے معاوضے کا معیار دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ مگر میں جیسا کہ میں نے کہا دوسرے درجے کا ادیب ہوں۔ لیکن جن ادیبوں کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ انھیں بھی ہندوستانی زبانوں سے ایک افسانے

کے سو ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں ملتے۔ انگریزی میں سب سے زیادہ معاوضہ ایک آرٹیکل یا افسانے کا تین سو روپے ہے۔ یہ گویا حاتم طائی کی قبر پہ لات مارنے کے مترادف ہے۔

"تم ایک سال میں کتنے افسانے لکھ لیتے ہو۔"

"مہینے میں ایک یا ڈیڑھ افسانے کا اوسط ہے۔ اس اعتبار سے مہینے میں افسانوں سے پچھتر روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔"

"اور ناول؟"

"ناول آج کل ہمارے ہاں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ مگر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی ناول لائبریری ایڈیشن میں پانچ ہزار سے زیادہ چھپ نہیں سکتا۔ عام طور پر ایک ہزار یا دو ہزار کا ایڈیشن نکلتا ہے اور چار سال میں بکتا ہے۔ یعنی اگر بہت اچھا لکھا گیا ہو۔ ورنہ سات آٹھ سال میں ایک ایڈیشن فروخت ہوتا ہے اور اس پر بھی بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آج کل صف اول کے ادیب ادب سے لاکھوں روپے کما رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ادب سے جو کماتا ہے اس سے وہ اپنے بال بچوں کا تو کیا اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔"

"ابھی اس سے تو ایک چڑیا کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا۔" مائیکل ہنس کر بولا۔

"تو گویا آپ لوگ اس حالت میں ہیں جہاں ہم سو سال پہلے تھے۔"

"اس میں کیا شبہ ہے؟" زتشی بیزار ہو کے بولا۔ "اسی لئے جو لوگ صرف ادب پر قناعت کرتے ہیں۔ بالآخر بھوکے مرتے ہیں۔ بمبئی میں ایک ادیب تھا۔ نام ندولال تھا۔ بے چارے کا انتقال ہو گیا۔ اس کے پاس دبنے کو کوئی جگہ نہ تھی قبرستان میں رہتا تھا۔

تو۔ تو مائیکل نے حیرت سے سر ہلایا۔

"یس یس۔" زتشی غصے سے بولا۔

میں ایک اور ادیب کو جانتا ہوں جو افسانے لکھ لکھ کر بھوک اور بیماری سے اندھا ہو گیا۔ کبھی کبھی ہم لوگ اس کی مدد کر دیتے ہیں۔ مگر اب اس کی آنکھیں تو اس کو نہیں مل سکتیں۔ ابھی حال ہی میں ایک بہت اچھے شاعر کا کینسر سے انتقال ہو گیا۔ جی تو بہت چاہتا تھا کہ اسے اس کے علاج کے لئے یورپ یا امریکہ بھیج دیں تاکہ اس کا اچھا علاج ہو سکتا۔ مگر روپیہ کہاں سے لاتے۔

میں نے کہا۔ "زتشی یہ مت بھولو کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔"

"میں کب کہتا ہوں کہ امیر ہے۔ لیکن پھر بھی اس ملک میں ڈاکٹر، وکیل، انجینیر، سرکاری ملازم، کارخانے دار حتیٰ کہ کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے بھی ماہانہ روزی روٹی کا انتظام ہے۔ بونس ہے۔ بھتّہ ہے۔ پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ پنشن ہے۔ ادیب کے لئے کیا ہے۔ فاقہ! اس پر بھی کچھ سرپھرے لوگ اس ملک میں ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ادیبوں کو اپنے

ادب کا معاوضہ روپے کی صورت میں وصول کرنا چاہیئے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کام کرنے والے انسان کو اس کی محنت کا صلہ ملتا ہے۔ اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ مگر ادیب؟ ناں صاحب ناں۔ اُسے تو ہوا پر جینا چاہیئے۔"

زنتشی نے ایک لمبا گھونٹ لیا۔ آنکھیں بند کیں، ہونٹ بند کیے پھر دوسرا گھونٹ لیا۔ آنکھیں کھولیں۔ ہونٹ کھولے اور بولا۔

"اس لیے میں وکالت کرتا ہوں۔ اور فرصت کے اوقات میں ادبی شغل کرتا ہوں۔ اور جتنے بھی مجھ سے ادیب ہیں۔ اپنی روزی کمانے کے لئے ادب کے بجائے کوئی دوسرا دھندا اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ کوئی پروفیسر ہے تو کوئی وکیل۔ کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی انجینیر۔ کوئی سرکاری افسر ہے تو کوئی کسی فرم میں ملازم ہے۔ کوئی فلموں میں گانے لکھتا ہے۔ یا ڈائیلاگ۔ بہرحال صرف ادب پہ قناعت کرکے کوئی ادیب زندہ نہیں رہ سکتا چاہے وہ صفِ اوّل کے ادیبوں میں سے چوٹی کا ادیب ہی کیوں نہ ہو۔ ادب کے سہارے سرکاری ادیب تو زندہ رہ سکتے ہیں جن کی کتابیں اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہو سکتی ہیں۔"

"ایسا نصابی ادب کیا ہوگا۔؟" مائیکل بولا۔

"رس گلے کی طرح میٹھا ادب۔ بے ضرر ہوگا اور ہونا بھی چاہیئے ورنہ نصاب میں شامل کیسے ہو سکے گا؟" زنتشی طنزاً مسکرایا۔ "مگر جب تک ادب میں گہرا ریاض شامل نہ ہو دن رات اس پر محنت نہ کی جائے۔ ادیب جب تک صرف

اس میں ڈوبا رہے۔ ادب کو وہ رفعت کیسے حاصل ہو سکتی ہے جو مثال کے طور پر ٹالسٹائے کے وار اینڈ پیس کو حاصل ہے۔

"ٹالسٹائے ایک کاؤنٹ تھا" زتشی بولا۔ "روپے کی اسے پرواہ نہ تھی کئی برس اس نے "وار اینڈ پیس" کے لکھنے میں صرف کر دیئے۔ سترہ دفعہ اس پر نظرثانی کی۔ بالزاک کو بھی اتنے پیسے مل جاتے تھے رائلٹی سے کہ اس نے پیرس میں اپنی محبوبہ کے لئے ایک محل تعمیر کیا تھا۔ شو وغیرہ کو بھی لکھنے کے لئے مکمل فراغت نصیب ہے۔ ہمنگ وے کے پاس پانچ ہوائی جہاز تھے۔ ذاتی۔ اور ابھی ایک انگریز خاتون کو اس کے ناول کا معاوضہ ایک لاکھ پاؤنڈ ملا ہے۔ ذرا سوچئے ایک لاکھ پاؤنڈ۔ میں گزشتہ سات سال سے ایک اہم موضوع کو لئے بیٹھا ہوں۔ جس پر میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں مگر اس ناول کو لکھنے کے لئے مجھے کم سے کم تین سال چاہئیں۔ تین سال جن میں میں اور کوئی کام نہ کروں۔ سوچتا ہوں اگر تین سال ناول کو دے دوں تو بلاشبہ وہ ایک شاہکار ہو گا مگر پھر سوچتا ہوں ان تین برسوں میں اپنے بعد اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ کیسے پالوں گا اس لئے ہر روز کچہری جاتا ہوں اور جب کبھی فرصت ملتی ہے ایک آدھ افسانہ گھسیٹ دیتا ہوں۔" زتشی نے جام اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں جام خالی کر دیا اور گلاس کو میز پر زور سے رکھ دیا۔

کنول نے کہا۔ "خفا ہونے کی بات تو اس قدر نہیں ہے۔ ہندوستانی

کی بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں میں سے ایک صورت حال یہ بھی ہے مگر بے حد کربناک ہے کہ ہمارے بڑھتے ہوئے سماج نے اپنے ادیب کی اہمیت اور حیثیت کا احساس نہیں کیا ہے۔ لیکن سوچا جائے ابھی تو ہم نوآبادیاتی نظام سے نکل کے آئے ہیں۔ ابھی نیا معاشرہ بنا بھی نہیں ہے۔ انگریزوں کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ہندوستانی ادب کی ترقی اور ترویج کے لئے کوشش کرتے۔ پھر ملک کے بہترین دماغوں کی کاوشیں آزادی حاصل کرنے میں صرف ہو گئیں۔ آزادی کے بعد جو سماج پیدا ہوا اس پر کارخانے والوں۔ زمین داروں۔ ٹھیکے داروں اور پرمٹ کوٹے لائسنس والوں کا قبضہ ہو گیا۔ ایسے ماحول میں ادب کیسے پنپ سکتا تھا۔ میں نہیں مانتا۔ ہندوستان کے سب سے بڑے اشاعتی اور اخباری ادارے کا سالانہ منافع نو کروڑ روپے ہے۔ کیا یہ لوگ اپنے ادیبوں کو اچھا معاوضہ نہیں دے سکتے۔ دوسرے نمبر پر جو صحافتی ادارہ آتا ہے اس کی آمدنی چھ کروڑ ہے اور تیسرے نمبر والے کا منافع چار کروڑ ہے۔ ان لوگوں کے لئے اچھا معاوضہ ہرگز مشکل نہیں ہے کہ کم از کم اس حد تک تو دے سکتے ہیں جس حد تک یورپ کے چھوٹے ملک دیتے ہیں مگر دیں گے نہیں کیونکہ۔ ہندوستان میں ایک تھیوری یہ بھی رائج ہے کہ ادیبوں کو ان کی شایان شان معاوضہ نہیں لینا چاہیے۔ بلکہ بالکل ہی نہیں لینا چاہیے۔ مگر یہی بات ڈاکٹر۔ سائنس داں۔ انجینئر اور دوسرے سماجی پیشے والے انسانوں کے لئے روا نہیں رکھی جاتی۔ صرف ادیبوں ہی کو

فائدہ زندگی کی تلقین کیوں کی جاتی ہے؟"

کنول بولا۔ "میرے خیال میں ایک کوئی ایسا پیمانہ تو ہونا چاہیے۔ معاشرے کے معیار کا یعنی اوسط درجے کا امریکہ والا معیار اگر بے حد بلند ہے تو ہندوستانی معیار بے حد پست ہے۔ معاشرے کا ایک ایسا معیار تو ہونا ہی چاہیے جس سے ایک عام ادیب بھی اوسط درجے کی خوشحال زندگی گزار سکے ورنہ یہاں جو صورت حال ہے اس میں ایک خاص ادیب یعنی ایسے ادیب کی آمدنی پھر بھی سوچو کہ ہندوستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد کس قدر کم ہے اور اُن میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو کتابیں خرید سکتے ہیں؟"

"یہ مت کہو۔" زرتشی بیزار ہو کے کہا۔ "ہندوستان کی آبادی بہت بڑی ہے اس میں تیس فیصدی کے قریب پڑھے لکھے ہیں اور وہ لوگ کتابیں بھی خریدتے ہیں مگر اپنے ادیبوں کی نہیں۔ انگریزی زبان کی کتابیں خریدتے ہیں اور انگریزی ادیبوں کی۔ ابھی اُن کے ذہن سے باہر کی غلامی کا خمار اترا نہیں ہے ورنہ مجھے وکالت کرنے کی ضرورت کیا تھی؟"

مائیکل نے زرتشی کے لیے ایک گلاس اور آرڈر کی۔ زرتشی کہنے لگا "میں تو ایک معمولی سا ادیب ہوں لیکن ایک دفعہ میری ایک کہانی چیکوسلواکیہ میں چیک زبان میں چھپی تھی۔ انہوں نے مجھے اس ایک کہانی کا ڈھائی ہزار روپیہ بھیجا تھا۔ چیکوسلواکیہ کتنا چھوٹا سا ملک ہے۔ کیا ہندوستان اس کے برابر بھی اپنے

ادیبوں کو معاوضہ نہیں دے سکتا؟ جو ادب کے سوا اور کوئی کام نہیں
کرتے ان کے لئے ریاست کیا کرتی ہے؟"

"کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" امیش سکینہ بھی ہم سب لوگوں کی
گفتگو میں حصہ لینے کی خاطر آن پہنچے تھے۔ "ادیب ادب اور خالص ادب پیدا
کرتا ہے۔ ملک اور قوم کی خدمت کا کام کرتا ہے۔ اسے اپنی تخلیق کا مول نہیں
لگانا چاہیئے۔ جناب میں ایک دفعہ روس گیا تھا۔ وہاں میری ملاقات مشہور
روسی ادیب بورس پولی وائی سے ہوئی۔ بورس پولی وائی کو تو آپ جانتے
ہوں گے؟" امیش سکینہ نے مائیکل کی طرف دیکھ کر استفسار کیا۔

"ہاں" مائیکل بولا۔ "ذاتی تعارف تو نہیں ہے۔ لیکن میں نے اس کی کتاب
The story of a real man پڑھی ہے۔ اچھی کتاب ہے مجھے تو
جیک لنڈن کا رنگ جھلکتا ہے۔"

"ہاں ہاں وہی بورس پولی وائی" میں نے اس سے پوچھا۔ "میں آپ کی تحریر
کا عاشق ہوں۔ لیکن The story of a real man کے بعد ایک
عرصے سے آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔" بورس پولی وائی نے جواب دیا۔

"اس کتاب کے اب تک اٹھارہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اور آمدنی کا یہ حال
ہے کہ اب تک صرف پہلے دو ایڈیشنوں کی رائلٹی ختم کر سکا ہوں۔ آخر آدمی کتنا
کھا پی سکتا ہے؟"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔" سوم ناتھ ترشی بولا۔

"اسی لئے میں کہتا ہوں۔" انیش بولا۔ "کہ ادیب کو معاوضہ ضرور ملنا چاہیئے اور اچھا بھی ملنا چاہیئے۔ لیکن اتنا بھی نہیں جتنا ہیرلڈ روبنس کو ملتا ہے کہ اُسے لکھنے کے لئے تحریک بھی نہ ہو۔"

"یوں نہ کہو۔" مائیکل بولا۔ "اُس نے اس کے بعد بھی دو کتابیں لکھی ہیں گو اُن میں وہ زور نہیں ہے جو اس کی پہلی کتاب میں ہے۔ پھر بھی شدتِ احساس کی کمی نہیں اور فنی قدروں پر بھی پوری اُترتی ہیں اور جہاں تک خرچے کا تعلق ہے۔ ہمارے Las Vegas Las میں آ جاتا ہے۔ ایک ہی رات میں اشاعت اور تشہیر کی آمدنی نہ خرچ کرا دیں تو ہمارا ذمہ۔"

سب ہنسنے لگے۔ ترشی بولا۔ "کیا کیا جائے Las Vegas ایسے عظیم الشان جوا خانے اور عریاں کیبرے روس میں نہیں ہوتے۔"

انگرڈ جولی سے باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور اس کی تصویریں بھی بناتی جا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو گونزل سے شادی کر لی۔"

"کس لحاظ سے اچھا کیا؟"

"میرا مطلب ہے۔ عورت کو جلد شادی کر لینی چاہیئے۔ میں اس معاملے میں کچھ پرانے خیال کی لڑکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ عورت کی دلکشی اور حسن کے چند ہی سال ہوتے ہیں۔ پھر وہ جلد ہی مرجھانے لگتی ہے۔"

جولی بولی۔ "لیکن یہی بات مرد کی جوانی کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" انگرڈ بولی۔ "مرد کی جنسی تخلیق کی مدت عورت سے دراز ہوتی ہے۔ تقریباً دگنی۔ وہ بڑھاپے میں بھی بچہ پیدا کر سکتا ہے۔ عورت نہیں کر سکتی۔ عورت کو فطرت نے پھول کی طرح بنایا ہے۔ اسے اگر شادی کرنی ہے تو جلد کر لینی چاہیئے۔ ورنہ کیریر کو اپنانا چاہیئے۔"

"تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" جولی نے پوچھا۔

"نہیں۔" انگرڈ بولی۔ "ہونے والی تھی۔ اس سے ایک بچہ بھی ہوا لیکن بچہ تولد ہونے کے بعد میرا محبوب نیویارک بھاگ گیا۔"

"کہاں ہے وہ آج کل؟"

"گرینیچ ولیج گاؤں میں۔ پاپ آرٹسٹ ہے۔ سنا ہے وہاں بھی کسی لڑکی کے ساتھ ہے جو حاملہ ہو چکی ہے۔"

"تم نے اس کا پیچھا کیا ہوتا۔"

"میری غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ پھر وہ دوسری لڑکی ــــ"

"لڑکیاں تو مردوں کی زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ مرد کو تو شادی کے رشتے

سے باندھ کر رکھنا پڑتا ہے۔" جولی بولی۔

"کبھی کبھی یہ رسّی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔" انگرڈ بولی۔ "جب اس کا دل ہی مجھ سے ہٹ گیا تو۔" وہ چپ ہو گئی۔

بہت دیر تک دونوں چپ رہیں پھر جولی نے پوچھا:

"کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو۔"

"ہاں۔" انگرڈ بے بسی سے بولی۔ "میرا باپ امیر آدمی ہے میں ملکوں ملکوں گھوم رہی ہوں۔ بہت سے دوست بھی بنائے اس عرصے میں کئی مردوں کے ساتھ سو بھی چکی ہوں۔ مگر جانے کیا بات ہے۔ جو بات اس میں تھی وہ کسی میں نہیں۔ دوسرے مرد کی بانہوں میں بھی مجھے اس کی باتیں یاد آتی رہیں۔ یہ ملک ملک گھومنا دراصل ایک طریقہ ہے اسے بھلانے کا۔ مگر کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا۔"

"تو اس کے پاس چلی کیوں نہیں جاتیں؟"

"وہ کیوں نہیں آ جاتا میرے پاس۔ کبھی کبھی رات کی تنہائی میں مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے دل کی آواز اس تک پہنچ رہی ہے۔ کیا تم ٹیلی پیتھی میں یقین رکھتی ہو۔ میں رکھتی ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری آواز اس تک پہنچ رہی ہے۔ ایک دن وہ میرے پاس لوٹ آئے گا۔"

"کیوں آئے گا وہ۔" جولی بولی۔ "جب تک اسے نت نئی لڑکیاں ملتی رہیں گی وہ کیوں آئے گا۔ مرد دراصل بھونرا ہوتا ہے۔"

"اور عورت؟"

"عورت؟ ـــــ عورت ایک بچے کی یا شاید ایک درجن بچوں کی۔ اس بارے میں وہ مجبور ہے۔ شاید فطرت نے اسے ایسا ہی بنایا ہے۔"

"تمہارے بچہ کیوں نہیں ہوا؟" انگرڈ نے پوچھا۔

"ہوگا بھی نہیں۔" جولی نے سر ہلا کے کہا۔

"کیا تم چاہتی نہیں ہو کہ"

"چاہتی تو ہوں۔ مگر ڈاکٹروں نے کہا ہے۔ نہیں ہو سکتا۔" وہ چپ ہو گئی بالکل غیر جذباتی انداز میں اس نے کہا۔

"مگر آج کل کی عورت بھی تو یہ راستہ چاہتی ہے۔"

"آج کل کیا ہر جگہ کی عورت کے دل میں یہ چاہ رہی ہے۔ مگر اُسے موقع نہیں ملا۔ موقع ملتے ہی۔"

وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

جولی بولی: "تمہارے خیال میں عصمت، عفت، پاکبازی کا تصور فضول ہے؟"

"فضول تو نہیں ہے..... کروڑوں عورتیں اس میں یقین رکھتی ہیں اُنہیں سے کتنی یہ یقین رکھنے پر مجبور ہیں۔ کئی ایسی ہیں جو واقعی سچے دل سے۔۔؟ میرے خیال میں اُن کی تعداد بہت کم ہوگی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں ٹائم تھیوری میں یقین رکھتی ہوں۔" انگرڈ بولی۔ "اگر میرا محبوب پانچ سال میرے ساتھ رہتا تو اس کے بعد میں اس سے اوب جاتی۔"

"پانچ سال کیوں؟"

"مجھے ایک سویڈش ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ شادی شدہ مرد اور عورت کے درمیان چاہت کی لہر دراصل دو متضاد برقی لہروں کا سنگم ہے۔ جس سے کشش پیدا ہوتی ہے اور یہ کشش پانچ سال تک قائم رہتی ہے۔ اس کے بعد کشش کم ہو جاتی ہے۔ دونوں متضاد برقی لہریں ایک دوسرے کو نیوٹرل کر دیتی ہیں۔"

"لیکن اس کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں شادی شدہ جوڑے ایسے ہیں جو مسرت آمیز ازدواجی زندگی گزارتے ہیں۔"

"وہ ایک طرح کی مفاہمت ہوتی ہے۔ حالات کے ساتھ۔ بچوں کی وجہ سے۔ مالی مجبوریاں۔ ایک طرح کی عادت۔ سماج کا ڈر۔ مذہب کا خوف۔ بہت سی باتیں اس بندھن کو مضبوط رکھتی ہیں۔ مگر وہ برقی لہر پانچ سال کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر تمہیں گلہ کیا ہے اپنے محبوب سے؟"

"یہی کہ وہ میرے ساتھ پانچ سال تک تو رہتا؟"

"ممکن ہے اس کی برقی لہر تمہارے ساتھ پہلے سال ہی میں نیوٹرل ہو چکی ہو

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"پھر محبت کا کیا مطلب ہے؟ محض ایک برقی رو؟"

"مجھے نہیں معلوم!" انگرڈ نے آہستہ سے انکار میں سر ہلا دیا۔

جولی نے پوچھا: "تمہاری اس سیاحت کے دوران میں جیسا کہ تم نے کہا، تم نے کئی مرد دوست بنائے۔ کیا تمہیں وہی برقی لہر محسوس ہوتی تھی؟"

"ہاں۔ مگر اس شدت سے نہیں۔ کہیں پر کوئی خلا کا احساس رہا۔"

جولی نے کہا: "وہی خلاء کا احساس محبت کے خلاء کا احساس شاید ہو سکتا ہے۔" انگرڈ بولی۔ "کبھی کبھی میں اس کے بعد روئی بھی ہوں۔"

جولی نے ہمدردی سے انگرڈ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دونوں دیر تک چپ رہیں۔ انگرڈ نے اسکیچ کرنا چھوڑ دیا تھا۔

جولی بولی۔ "شاید کھو جانے کی حس ہو جو ہمیں اداس کر دیتی ہے۔ شاید ملکیت کی حس سے مشابہ ہو۔ مجھے دیکھو۔ جب تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے بچہ نہیں ہو گا۔ مجھے بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک طرح کی پریشانی سے تعبیر کیا۔ لیکن جب سے معلوم ہوا ہے کہ میرے بچہ نہیں ہو گا مجھے بچے اچھے محسوس ہونے لگے ہیں۔ بڑی حسرت سے دوسروں کے بچوں کو دیکھتی ہوں۔ کبھی کبھی ان سے پیار بھی کر لیتی ہوں۔ ان کے سوئٹر بن دیتی ہوں۔"

"کیا یہ سوئٹر بھی کسی بچے کے لئے ہے؟"

"یہ بچے بڑے بچے کے لئے ہے۔ اپنے شوہر کنول کے لئے۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتی ہوں کہ کنول بھی ایک بچہ ہے۔ دراصل جو چیز انسان سے کھو جاتی ہے یا اس کے ملنے کا امکان نہیں رہتا۔ اس کے لئے وہ اس قدر پریشان ہوتا ہے۔ اور اس پریشانی کو محبت کا نام دیتا ہے۔ ممکن ہے اگر تمہارا محبوب تمہارے پاس رہتا تو اب تک تم اس سے اوب گئی ہوتیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" انگرڈ ہنس کر بولی۔ "ممکن ہے اس کے چلے جانے سے کہیں میرے دل میں بے عزتی کا احساس رہا ہو۔ اور اسی کو میں نے محبت سے تعبیر کر لیا ہو۔ اس کا علاج ایک ہی ہے"

"کیا؟"

"گروپ میرج ہونی چاہیئے۔" انگرڈ بولی۔ "ہمارے سویڈن میں آجکل گروپ میرج کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں آپس میں ایک گروپ کی طرح رہتے ہیں۔ کوئی عورت کسی ایک کی بیوی نہیں۔ کوئی مرد کسی ایک کا خاوند نہیں۔"

"یہ تو بہت پرانا طریقہ ہے۔" جولی بولی۔ "آج بھی کئی وحشی قبائلیوں میں یہ طریقہ باقی رہ گیا ہے۔ مگر میں اسے دقیانوسی سمجھتی ہوں۔ گروپ کی شادی میں وہ intimacy نہیں رہ سکتی جو دو کے درمیان پیدا ہو سکتی ہے۔ جب

جنسی عمل دو تک محدود ہو جاتا ہے تو اس میں ایک عجیب طرح کی شدت پیدا ہوتی ہے۔ ایک دوسرے سے پیار کرتے وقت دو ہونٹوں کا مخصوص لمس، ملنے کی ترنگ، کان کی لو کی مخصوص شکل تک پیاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ شدت میں سمجھتی ہوں گروپ میرج میں کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔"

"سوال یہ ہے،" انگرڈ بولی۔ "کیا اچھا ہے Intimacy یا Diffusion ـــــ گروپ میرج میں جو ڈفیوژن پیدا ہوتا ہے۔ اس میں بھی کئی اچھائیاں ہیں۔ بچے گروپ کی ذمے داری ہوتے ہیں۔ مالی حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ سیکس کی حسِ ملکیت غائب ہو جاتی ہے۔"

"پھر محبت بھی تو باقی نہ رہتی ہو گی۔" جولی بولی۔

"ہاں۔ تم کسی گروپ سے محبت نہیں کر سکتیں۔ محبت کے لئے کسی ایک اور فقط کسی ایک کا ہونا ضروری ہے۔"

"صرف ایک کا ایک وقت میں،" جولی۔

"اور وقت بدلنے کے ساتھ۔"

"وقت اور حالات اور شدتِ احساس بدلنے کے ساتھ جذبہ بھی بدل سکتا ہے۔ ویسا میں سوچ سکتی ہوں۔" جولی بولی۔ "یہ مرد کے لئے بھی ممکن ہے اور عورت کے لئے بھی۔"

"مرد کے لئے زیادہ،" انگرڈ بولی۔ "عورت کے لئے کم۔ اُسے قدرت نے ٹھہرنے

کے لئے بنایا ہے۔ مرد کو گھومنے کے لئے، عورت کو گھر بسانے کے لئے بچوں کی سالہا سال پرورش کرنے کے لئے۔ اس کے لئے ایک جگہ ٹھہرنا۔ ایک پر قناعت کر لینا مرد کے مقابلے میں آسان ہے۔ شاید میں اسی کو محبت سمجھ بیٹھی ہوں۔"

"لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنسی اعتبار سے تمہارا محبوب دوسرے ان مردوں کے مقابلے میں زیادہ پُرکشش رہا ہو جو تمہاری زندگی میں آئے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" انگرڈ بولی۔

"ہو سکتا ہے، جب کوئی اس سے بہتر مرد تمہاری زندگی میں آئے تم اسے بھول جاؤ۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیا میں آ سکتا ہوں؟"

دونوں عورتوں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ ڈیوڈ گولڈ فیلڈ تھا، جینی کا منگیتر۔ وہ قریب آ کے مودبانہ جھکا۔ مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب طنزیہ تبسم تھا۔ اس نے جینی کو مخاطب کر کے کہا "جب آپ نے میرے ساتھ ڈانس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ لنگڑی ہیں اور اس لئے آپ ڈانس نہیں کر سکتیں۔ میں غصے میں تھا اور میں نے آپ کو لنگڑا کر چلتے دیکھ کر میں ہنسا تھا۔ مگر بعد میں انگرڈ نے مجھے سمجھایا تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے آپ کے لنگ پر ہنسنے کا کوئی حق نہ تھا کوئی بھی لنگڑی عورت قابل معافی ہے۔"

اس نے معافی مانگتے ہوئے اتنی بار جولی کو تنگ کر دی کہ جولی کو غصہ آ گیا اُسے یقین ہو گیا کہ وہ معافی کی آڑ میں اس پر چوٹ کر رہا تھا اور پھر اس کے رنگ کا مذاق اڑا رہا تھا جولی کچھ بولی نہیں مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جب وہ ایک دفعہ پھر مودبانہ جھک کر واپس چلا گیا۔ تو انگرڈ نے غصے سے کہا۔

"بدتمیز آدمی ہے۔ تم نے اُسے چانٹا لگا دیا ہوتا!"

جولی کے سینے کا زیر و بم کہے دیتا تھا کہ وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں مگر ہمت کر کے وہ اپنے آنسو پی گئی۔

رات کو سوتے وقت جولی نے کنول کے گلے میں باہیں ڈال کے کہا۔

"میری ایک بات پوری کرو گے؟"

"کہو۔"

"پہلے وعدہ کرو۔"

"معلوم ہو جائے تو وعدہ کروں۔"

"نہیں پہلے وعدہ کرنا ہو گا۔"

"مجھے ایک لمبا بوسہ دو تو بتاؤں۔"

جولی نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے اور زبان سے زبان اور

نشے سے اس کا لرزتا بدن کنول کے بدن سے لپٹ گیا۔ یہ بوسہ صرف ہونٹوں کا بوسہ نہیں تھا۔ یہ ایک لمبا بوسہ تھا سر سے پاؤں تک لہراتا ہوا جیسے رات میں چاند کی پگھلے اور دو جام شراب سے بھر جائیں اور ساتھ ساتھ اگنے والے دو پیڑ دونا کے سپید تنوں سے اوپر ہری ہری شاخوں کی ڈالیاں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی سورج کی کرنوں کے شال ایک دوسرے پر ڈال دیں اور یہ معلوم کرنا مشکل ہو جائے کہ یہ پتہ کس ٹہنی کا ہے اور یہ ٹہنی کس پیڑ کی ہے اور یہ کرن کس سورج کی ہے اور وقت کا یہ پگھلتا ہوا نرم گرم بلوریں لمحہ کہاں سے آیا ہے؟

یکایک وہ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے مگر برقی لہریں ان کے چاروں طرف گونج رہی تھیں اور ان کے بدن نور کی پھواروں جیسے چھلک چلے تھے۔ ذرا دیر دونوں بے سدھ پڑے رہے پھر جولی بولی۔

"اور اب؟"

"ہاں اب؟" کنول نے پوچھا۔

جولی نے اپنا سر جھٹک کر جیسے اس شیریں لمحے کو اپنے سے دور کرنا چاہا۔ پھر بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم میگی رشیلے سے محبت کرو۔"

کنول اکدم چونک گیا۔ چند لمحے حیرت سے جولی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"تمہارا کیا مطلب؟"

"مطلب صاف ہے۔ میں ڈیوڈ گوڈز چائیلڈ کو زک دینا چاہتی ہوں اور زک دینے کے لئے اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہے کہ میگی تمہارے جال میں پھنس جائے۔ میں کوئی پکی پکی محبت تھوڑی چاہتی ہوں بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم میگی سے التفات ظاہر کرو وہ تمہاری طرف مائل ہوتی دکھائی دے تو اس ڈیوڈ گوڈز چائیلڈ کو جو تکلیف پہنچے گی اس سے مجھے بڑی راحت ملے گی۔"

"مگر تم ویسا کیوں چاہتی ہو؟"

"کیونکہ اس نے آج پھر مجھے لنگڑی کہا اور بظاہر معافی مانگتے ہوئے تین چار بار لنگڑی ہی کہا۔ میں اسے چانٹا مار سکتی تھی۔ لیکن میں اُسے اس سے بھی زیادہ اذیت پہنچانا چاہتی ہوں۔"

"تم مجھے بتا دو میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

"اس کی ہڈی پسلی ایک کرنے میں مجھے مزا نہیں آئے گا جو اس کی منگیتر کو دوسرے کے بازوؤں میں دیکھ کر ــــــ جس طرح سے وہ جلے گا اس سے میرا دل ٹھنڈا ہو گا۔"

"یہ اچھی بات نہیں۔" کنول بولا "بعض اوقات مذاق مذاق میں جو بات شروع ہوتی ہے وہ بھی اسقدر سنجیدہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم محبت کی ایکٹنگ کرتے کرتے کہیں سچ مچ میگی سے محبت نہ کرنے لگو۔"

"نہیں ــــــ مجھے اس کے ساتھ سونا برا نہیں لگے گا لیکن محبت نہیں

کو سکون ملے گا۔"

"مگر بیگی سے الفت جتانے کے بعد کہیں اگر سنگی بیچ پڑ گئی مجھ سے ـــــ

تو اور بھی اچھا ہو گا۔" جولی مسکرا کر بولی۔ "اس سے ٹریجڈی اور جلے گا۔ اور میں اس ہرجائی کو جلا کر خاک کر دینا چاہتی ہوں۔"

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا کہ "بیگی میرے التفات کا جواب التفات سے نہ دے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" جولی بولی۔

"تمہیں کیسے یقین ہے؟"

"اس لئے کہ میں نے اس کی نگاہیں پڑھ لی ہیں۔ جس وقت تم اس کے سنگ ناچ رہے تھے۔ جس طرح تمہاری بانہوں میں گھل گئی تھی جس طرح وہ تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھ رہی تھی۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا اندازہ غلط ہو۔" میں نے کہا۔

جولی بولی۔ "ایسے معاملوں میں عورت غلطی نہیں کرتی۔ تم ہاں کر دو۔ کہو۔ ہاں۔"

"ہاں۔" کنول نے دو بار اس کے ہونٹ چوم کر کہا۔ "اور ایک بار پھر ہاں۔ تمہیں خوش کرنے کے لئے تو میں دنیا بھر کی حسین عورتوں سے محبت کر سکتا ہوں۔"

"مگر یہ سب ہنسی مذاق میں ہو گا۔" جولی نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "سنجیدگی کے ساتھ تو محض جولی کے ساتھ۔..." جولی نے میرا کان کھینچ کر کہا۔

"اگر کہیں تم پیچ پچ ۔۔۔۔ تو ۔۔۔۔"

"تو کیا؟"

"گلا گھونٹ ڈالوں گی!"

کنول ہنسنے لگا..... پھر بولا۔ "میڈم گھبراؤ نہیں۔ کل ہی سے کام پر لگ جاتا ہوں۔"

ڈیوڈ نے سکھ نوجوان کے ساتھ گالف کھیلنے کا پروگرام بنایا تو میگی بولی: "تم جانتے ہو میں گالف سے سخت بور ہوتی ہوں۔"

"تو تم کوئی دلچسپ سی کتاب پڑھو۔ کتابیں پڑھنا تمہارا کام ہے۔ نفسیات پڑھاتی ہو۔"

"میں کل ہرگز کتابیں پڑھنے نہیں آئی۔" میگی نے ڈیوڈ کے ـــــ خفگی برداشت کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا کرو گی؟"

میگی نے عالم اضطراب میں اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ پھر بولی۔ "میرا خیال ہے میں گھوڑے پر ایک لمبی دوڑ لگا آتی ہوں۔"

"کھلن مرگ تک ہو آؤ۔" ڈیوڈ بولا۔ "میں بھی تب تک برج کے گیمز کھیل سکوں گا۔"

میں نے جولی سے کہا۔ "میں نے ابھی سن لیا۔ بیگی کھلن مرگ جا رہی ہے۔"

"موقع اچھا ہے۔" جولی مسکرا کر بولی۔ "تم بھی ہو آؤ۔"

میں نے کہا: "اچھی طرح سے غور کر لو۔"

"کر لیا۔" جولی دانت پیس کر بولی۔ "میں اس حرامی ڈیوڈ کو زک دینا چاہتی ہوں۔"

"اور اگر بیگی نے مجھے منہ نہ لگایا تو......؟"

"ناممکن ہے۔ میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر تم کوشش کرو گے۔"

"ہر عورت اپنے شوہر کے بارے میں اسی قسم کی خوش فہمی رکھتی ہے۔ بہرحال میں جاتا ہوں۔"

کنول نے بھی ایک عمدہ سا گھوڑا لیا اور بیگی کی مخالف سمت دوڑاتے ہوئے نکل گیا۔ دور جا کر اس نے باگ موڑی اور ایک دوسرے راستے سے بیگی سے آن ملا۔ اس وقت بیگی چڑھائی چڑھ رہی تھی اور دیوداروں کی ایک لمبی قطار اس کے جسم پر سایہ فگن تھی۔

بیگی نے نارنگی رنگ کا سویٹر پہن رکھا تھا جس میں سے کریم رنگ کے کھلے

کالر ہوا میں اڑتے نظر آتے تھے۔ اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی چھاتیوں کا زیر و بم بہت واضح ہو جاتا تھا۔ اس نے مٹیالے رنگ کی کارڈرائے کی جودھپور پہن رکھی تھی جو اس پر بہت جچتی تھی اور جس سے اس کی پتلی کمر اور بھاری کولہوں کا ابھار نمایاں ہو چلا تھا۔ کنول نے سوچا۔ اس نیگرو لڑکی سے تو سچ مچ عشق کیا جا سکتا تھا۔ جب دو نسلیں ملتی ہیں تو ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ میگی میں نیگرو قوم کی وحشی لچک اور مضبوطی اور جلد کی چکنی نرمی آئی ہے تو دوسری طرف سفید قوم سے اس کا سفید رنگ، آنکھوں کی نیلاہٹ اور پتلے ہونٹ آگئے ہیں۔ لانبی گردن اور بھرپور چھاتیاں اسے نیگرو قوم نے دی ہیں تو کالے بالوں کا سیدھا پن سفید نسل نے عطا کیا ہے۔ میگی بے تحاشا حسین اور جاذب نظر ہے۔

پھر وہ گھوڑا دوڑا کے آگے بڑھے۔ میگی کے گھوڑے کے ساتھ ہو لیا۔ میگی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو کنول نے ہاتھ ہلا کے کہا۔

"ہائی۔"

"ہائی" وہ بھی ہاتھ ہلا کے بولی۔

"کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"کھلن مرگ!"

"چلو میں بھی ادھر ہی چلتا ہوں۔"

"تو کیا تمہارا ارادہ کہیں اور جانے کا تھا؟" میگی نے پوچھا۔

کنول بولا: "نہیں میں تو ایک لمبی سیر کو نکلا تھا۔ یہیں گل مرگ میں۔ مگر اب
خوب صورت لڑکی کا ساتھ ہے تو چلو کھلن مرگ تک ہو آتے ہیں۔"

کچھ دور تک دونوں گھوڑے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کنول نے کہا۔

"تم بہت مشاقی سے گھوڑا چلاتی ہو۔"

"ہاں مجھے اس کی عادت ہے۔ گھوڑے کی سواری مجھے پسند ہے۔"

اور تمہیں بھی۔۔؟" میگی نے پوچھا

"ہاں۔ مجھے بھی۔۔۔" کنول نے جواب دیا۔ پھر پوچھا: "ڈیوڈ کیوں نہیں آیا؟"

"وہ آج لنچ تک گالف کھیلے گا۔ وہ گالف کے لئے دیوانہ ہے۔ اور میں اس
کھیل کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ایسی خوب صورت لڑکی کو اس نے اکیلے جانے دیا؟" کنول نے مسکرا کر کہا۔
میگی کے خوشنما دانت چمکے۔ کنول نے سوچا۔ یہ سپید خوشنما مضبوط دانت بھی نیگرو
قوم نے اس لڑکی کو دیئے ہیں۔

سفید رنگ قوموں کے دانت اتنے اچھے نہیں ہوتے۔

میگی ہنس کر بولی: "میں اکیلی کہاں ہوں۔ میرے ساتھ بھی تو ایک ہینڈسم مرد ہے۔"

"شکریہ۔ کیا تمہیں ہندوستانی پسند ہیں؟"

"کبھی تو نہیں۔ مگر کوئی کوئی پسند آجاتا ہے۔ عام طور پر ہندوستانی اجنبی لڑکیوں
کے سامنے شرمیلے سے نظر آتے ہیں۔ اور مجھے۔۔۔ اور مجھے۔۔۔

کنول: "تمھیں شاید جرأت آمیزی پسند ہے۔"

"ہر لڑکی کو ہوتی ہے۔" بیگی بولی اور عجیب طرح سے ہنسی۔ پھر پوچھنے لگی: "اور تمھیں لڑکیوں میں کیا پسند ہے۔ شرم یا بے باکی؟"

کنول بولا: "دونوں۔ کبھی شرم، کبھی بے باکی۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ وہ کمرا بیٹھک ہے، ڈرائنگ روم ہے یا بیڈ روم ہے؟"

بیگی نے چونک کر کنول کی طرف دیکھا۔ پھر بولی: "پہلے تم مجھے احمق سے معلوم ہوتے تھے، اب معلوم ہوتا ہے، تم بہت تیز آدمی ہو۔"

"تیز تو نہیں ہوں۔" کنول بولا۔ "ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر میری گھگھی نہیں بندھ جاتی۔"

"تجربے کار مرد کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے۔" بیگی ہنس کر بولی۔

دھوپ میں بیگی کے بدن کا رنگ خوب چمک رہا تھا۔ سپید رنگت نہیں تھی، بھورا بھی نہیں تھی۔ کالی یا سانولی بھی نہیں تھی۔ زیتونی بھی نہیں تھی جیسی کہ اطالوی لڑکیوں کی ہوتی ہے بلکہ ایک عجیب قسم کا کریم کلر تھا جس میں ہلکا سا سنہری رنگ جھلکتا تھا۔ کچھ صندلی اور زعفرانی رنگت کے بیچ کا رنگ، جو رخساروں پر شہابی ہو جاتا تھا۔ جلد بے حد بے داغ اور صاف شفاف تھی۔ کنول غور سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک دھوپ چلی گئی اور بادل گھر کر آنے لگے۔ ہنگام اور

گل مرگ میں موسم اس قدر غیر متعین رہتا ہے۔ ابھی دھوپ ہے۔ ابھی چھاؤں۔ ابھی سورج چمک رہا ہے اور اس کی تمازت جلد پر بری طرح محسوس ہوتی ہے ابھی بارش ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ جب وہ پہاڑی کا ایک بڑا چڑھ کے ایک سطح مرتفع پر پہونچے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی کنول کو جنگلات ڈپارٹمنٹ کا بنگلہ ہمالیائی فر کے پیڑوں کے درمیان گھرا نظر آیا۔ اس نے میگی سے کہا۔ بارش زور پکڑ جانے گی ایسا دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس بنگلے میں پناہ نہ ملی تو بھیگ جائیں گے۔

"چلو وہیں چلیں۔" میگی گھوڑا دوڑاتے ہوئے بولی۔

مگر بنگلے تک پہنچتے پہنچتے بارش کی بوچھار شروع ہو چکی تھی۔ میگی کا بلاؤز اور سویٹر اس کے بدن سے چپک گیا تھا اور وہ بھیگی بھیگی بے حد متناسب معلوم ہو رہی تھی۔

بنگلے کا گیٹ کھول کر وہ دونوں گھوڑوں کی باگیں ہاتھ میں تھامے اندر گئے باہر برآمدے میں انہوں نے گھوڑے باندھے۔ برآمدے میں ایک مالی کھڑا ہوا تھا جو اس سے پہلے باغیچے میں کام کر رہا تھا۔ بارش دیکھ کر برآمدے میں آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر کنول نے پوچھا۔

"صاحب کہاں ہیں؟"

"کون کرنل صاحب؟"

"ہاں کنول صاحب۔"

"وہ نیچے گلمرگ گئے ہیں۔"

"تو بنگلہ تو کھولو۔ ہم باہر برآمدے میں کھڑے کھڑے بارش کی تیز بوچھار سے بھیگ جائیں گے۔ کنول صاحب سے ملنے آئے تھے۔ جب تک وہ آئیں ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

مالی نے رعب میں آ کر بنگلہ کھول دیا۔ دونوں اندر گھس گئے۔

دو کمرے آفس کے تھے۔ ایک ویٹنگ روم تھا۔ دوسرے ونگ میں ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم سے ملحق بیڈ روم تھا۔ اور ایک باتھ روم۔ میگی باتھ روم میں گھس گئی۔ گیلا سویٹر اتار کے واپس آئی پھر سے ایک کرسی پر پھیلا دیا۔ پھر بولی۔ "میرے بلاؤز کا بیک زپ گیلا ہو کے پھنس گیا ہے۔ کھلتا نہیں ہے۔"

کنول نے کہا۔ "میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔"

بڑی مشکل سے اس نے زپ کھولا۔ میگی نے بلاؤز اتار کے اسے بھی سکھانے کے لئے دوسری کرسی پر ڈالا۔ اب وہ صرف برا پہنے تھی۔

کنول نے میز کی دراز دیکھی پھر ایک الماری کھولی۔ اس میں اسے وہسکی کی بوتل مل گئی اور چند گلاس۔ ایک تپائی پر پانی کا جگ رکھا تھا۔ اس نے دو گلاس میں وہسکی ڈالی۔ میگی کا بدن سردی سے کانپ رہا تھا۔ وہ خوش اندا

پی گئی۔

بیڈروم دیکھ کر بولی: "آدمی خوش ذوق معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا دوست ہے؟"

"میں تو اُسے جانتا بھی نہیں۔"

"اگر وہ اس وقت آجائے۔"

"تو کیا ہوا۔ بارش میں بھیگے ہوئے جوڑے کو باہر تو نکال نہیں دے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہسکی کے پیسے لے لے گا۔ میرے خیال میں خوش ذوق آدمی بے حس نہیں ہوگا۔"

"مجھے اور وہسکی دو۔" میگی بولی۔

"میرے خیال میں تم اُسے نیٹ پی جاؤ۔" کنول نے کہا۔

"نہیں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔"

دوسرا پیگ پینے کے بعد میگی بولی۔ "ہاں۔ اب گرمی آئی ہے بدن میں۔"

کنول اس کے برا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کہ تمہیں یوں دیکھ سکوں گا اس کی خواہش ضرور تھی۔ امید نہ تھی۔"

"کیسی لگتی ہوں؟"

"میری توقع سے زیادہ۔"

"میں ناگیلے کپڑوں سے بہت گھبراتی ہوں۔" میگی بولی۔ "مجھے دوبارہ نمونیا ہو چکا ہے۔"

"تم نے ٹھیک کیا۔ گیلا سوئٹر اور گیلا بلاؤز اتار دیا۔ اب اس بیا کو بھی۔"
بیگی نے مسکرا کر اپنی بھری بھری چھاتیوں کو دیکھا پھر شرما کر منہ پھیر لیا۔
کنول بولا۔ "مجھے معلوم نہ تھا۔ اتنی جلدی مجھے تم سے عشق کرنے کا موقع ہاتھ آجائے گا۔ حالانکہ آیا میں اسی ارادے سے تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"یعنی ایک خاص قسم کا بھرپور عشق۔"

بیگی پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر جب کنول نے اسے سب بات بتائی تو دھیرے دھیرے ہنسنے لگی۔

"عجب اتفاق ہے۔"

"کیا؟"

"میں بھی آج صبح کچھ اس طرح کی باتیں سوچ رہی تھی۔"

وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔
بیگی نے تشریح کی۔ "...... میں بدن کا غصہ سمجھ سکتی ہوں۔ دنیا میں ایک روگ ہے۔ غصہ یہ حملہ کرنے کی۔ وہ کبھی اس سے نہیں چوکتا اور اسی نے ہر جگہ اپنے دشمن بنا لیتا ہے مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہے جو لوگ اسے سبق سکھانے پر آمادہ ہو گئی تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی عجیب بات تو کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا؟"

آج صبح انگرڈ نے مجھے بتایا کہ کل رات کو کسی وقت کسی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب اس نے دروازہ کھولا تو باہر ڈیوڈ کھڑا تھا شب خوابی کے لباس میں۔ وہ انگرڈ کے کمرے میں آنا چاہتا تھا اور اس سے محبت کرنا چاہتا تھا۔

"ایسے ہی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کل رات ہم دونوں کچھ زیادہ پی گئے تھے۔ میں تو بے خبر سو گئی تھی۔ ممکن ہے ڈیوڈ نے ایسا کیا ہو کیونکہ انگرڈ نے بتایا کہ ڈیوڈ نے بے تحاشہ پی رکھی تھی۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟ انگرڈ نے منیجر کو بلانے کی دھمکی دی تو ڈیوڈ واپس چلا آیا۔ انگرڈ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔ مگر مجھے کچھ معلوم نہیں، میں بے خبر سو رہی تھی۔ مجھے آج معلوم ہے کہ جب رات گئے ڈیوڈ نے میرے پہلو میں آ کر مجھے جگانے اور مجھ سے پیار کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر مجھے بے حد نیند آ رہی تھی اس لئے میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔ صبح جب انگرڈ نے مجھے رات کا حال بتایا تو مجھے سخت غصہ آیا۔ میں ڈیوڈ کو سزا دینا چاہتی تھی۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیسے؟ اس لئے یہی بہتر سمجھا کہ آج دن بھر اس سے دور رہوں۔ مگر تم نے مجھے اس سے بہتر ترکیب سجھا دی ہے۔"

پیگی زیر لب ہنسنے لگی۔

"تو ہم دونوں اس تجویز پر متفق ہیں؟" کنول نے پوچھا۔

"بلاشبہ۔"

"یعنی اس جھوٹ موٹ کے عشق کے مظاہرے پر!"

نیگی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ بولی۔ "بہت مزا آئے گا۔ جب ڈیوڈ کے سامنے..... وہ بے تحاشا مجھ سے محبت کرتا ہے۔ برداشت نہیں کر سکے گا۔"

"مگر اگر...؟"

"وہ بہت پی گیا تھا رات کو آپے میں نہ تھا۔ ایسے موقعوں پر بھی مزا لیا کر سکتے ہیں۔"

"تو آؤ۔ اس جھوٹ موٹ عشق کی ریہرسل کر لیں۔" کنول نے ایک انگلی اس کی لمبی گردن کے خم پر پھیری پھر اس انگلی سے اس کی تھوڑی کو اونچا کیا۔

نیگی نے منھ پھیر لیا۔ اور گردن جھٹک دی۔ گردن جھٹکنے سے سر کے بال ایک رخسار سے شانے تک کو ڈھانپتے چلے گئے۔ کنول نے اس کے بالوں کو رخسار سے ہٹا کر کہا۔

"مگر یہ سب جھوٹ ہو گا۔"

پھر اس نے نیگی کے ہونٹوں کو چوما۔

اور یہ بوسہ بھی جھوٹ تھا۔

نیگی کی سانس تیز تیز چلنے لگی۔ کنول نے اسے اپنی باہوں میں لے لیا۔

اور یہ باہوں کا عمل بھی جھوٹ ہے۔

جال دار برا میں سے اس کی چھاتیوں کے کنول جھلک رہے تھے۔ کنول نے بھینچ کر بیگی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

وہ بولا۔ "یوں بغلگیر ہونا بھی جھوٹ ہے۔"

بیگی اس کی باہوں سے نکل گئی۔ بولی۔ "یوں جھوٹ بولتے ہوئے کہیں سچ نہ ہو جائے۔ تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ لاؤ وہ بلاؤز مجھے دو۔ شاید سوکھ گیا ہوگا۔"

سوکھا تو نہ تھا مگر اب ایسا ہو گیا تھا کہ پہنا جا سکتا تھا۔ برا کے اوپر بیگی نے اپنا بلاؤز پہن لیا۔ سویٹر ہاتھ میں لے لیا کیونکہ ابھی گیلا تھا۔ بولی "چلو باہر برآمدے میں چلیں۔ بنگلے کا مالک اگر آ جائے گا تو کیا کہے گا۔"

"اور وہ جھوٹ موٹ کی محبت؟"

"دیکھو مسٹر ست نیو۔" بیگی بولی۔ "ٹیڈی کیا یہاں موجود ہے؟ آج رات کو ڈانس پر تماشا کریں گے۔ ایں؟"

"اچھا"

وہ دونوں جب باہر برآمدے میں آئے تو بارش تھم چکی تھی اور دھوپ نکلنے لگی تھی۔ گھوڑوں کی باگیں کھول کر وہ دونوں سوار ہو گئے۔ کنول نے بیگی کا سویٹر اپنی گردن سے باندھ کر پیٹھ کے پیچھے لٹکا لیا۔ مالی سے کہنے لگا۔ "مالک آئیں تو کہنا بڑے صاحب آئے تھے۔ سلام کہہ دینا۔"

کنول نے مالی کو دو روپے دیئے۔ مالی خوش ہو گیا۔

میگی نے پوچھا "یہ بٹ صاحب کون ہیں؟"

"میں نہیں جانتا" کنول بولا۔ "مگر ممکن ہے کول صاحب کے کوئی دوست بٹ صاحب ہوں اور اگر نہ بھی ہوئے تو یاد کرنے کی کوشش تو کریں گے کون بٹ صاحب آئے تھے۔"

وہ دونوں جب گلمرگ پہنچے تو دھوپ چھاؤں کا موسم تھا۔ تھوڑا اوپر راستے میگی کا بلاؤز بالکل سوکھ گیا تھا اور سویٹر بھی اس نے سویٹر پھر سے پہن لیا۔ پھر ان دونوں نے دو سلیج (Sledges) لے لئے اور دیر تک پھسلتے رہے۔ ایک دفعہ دونوں کے سلیج ٹکرا گئے اور وہ دونوں سلیج سے باہر نکل کر برف پر لوٹ پوٹ ہو گئے پھر دونوں بڑے مہذب طریقے سے ایک دوسرے سے معافی مانگ کر الگ ہوئے کیونکہ گلمرگ پر آج کافی بھیڑ تھی۔

کوئی ساڑھے بارہ ایک بجے کے قریب میگی کو سخت بھوک لگ آئی۔ بولی "سخت غلطی کی۔ سینڈوچ تک ساتھ لے کے نہیں آئی۔ خیال تھا۔ جلد لوٹ جاؤں گی اور لنچ کے وقت واپس ہوٹل میں پہنچ جاؤں گی اور اب بھوک سے برا حال ہے۔"

"دیکھو یہاں کچھ بندوبست کرتے ہیں" کنول بولا۔ "آج تمہیں ہندوستانی کھانا کھلاتے ہیں۔ کبھی کھایا ہے؟"

"نہیں۔"

ذرا نیچے ایک پنجابی کا ڈھابہ تھا۔ اس سے کنول نے گوبھی، مولی اور آلو کے پراٹھے تیار کرنے کو کہا۔ گرم گرم مکھن دار پراٹھے جب بالائی والے دہی کے ساتھ میگی نے کھائے تو زبان چٹخارے لیتی رہ گئی۔ "ارے یہ تو بے حد لذیذ کھانا ہے۔" بے اختیار کہہ اٹھی۔ "میں نے اور ڈیوڈ نے استنبول میں اس طرح کا ترکی کھانا کھایا تھا۔ پھر ایک دفعہ یونان میں مگر اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔"

"اور اس دہی کی بالائی۔۔؟" کنول نے پوچھا۔

"تمہارے ہونٹوں کا سا مزا تھا اس میں۔" میگی نے سرگوشی کے لہجے میں کنول کے کان میں کہا۔ "تو ایک دفعہ پھر اس لذت کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"شٹ اپ!" میگی تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھ کر کہنے لگی۔ پھر اپنی انگلی کی ایک پور جس پر بالائی لگی تھی اپنے منہ میں لے کر اسے چوستے ہوئے بولی۔

"بے چارہ ڈیوڈ!"

"کیا تمہیں ڈیوڈ پر رحم آرہا ہے؟"

"مجھے سبھی مردوں پر رحم آتا ہے۔ جو بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔" میگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سہ پہر میں جب وہ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے ہل ٹاپ ہوٹل کے پیچھے میں پہنچے تو کنول نے اپنے گھوڑے سے اتر کر میگی کا گھوڑا تھاما اور میگی اچک

شانے کا سہارا لے کر نیچے اتر آئی۔

بار کی بلوریں دیوار کے ادھر ڈیوڈ بڑی بے چینی سے میگی کی طرف دیکھ رہا تھا مگر میگی نے اس سے آنکھ نہیں ملائی۔ وہ دونوں کنول اور میگی شانے سے شانہ ملائے بار میں داخل ہوئے۔

جولی ایک کونے میں سوئٹر بن رہی تھی۔

"ہلو" میگی نے لاپرواہی سے ڈیوڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دن کیسے گزرا" ڈیوڈ نے زیر لب گالی دی۔ میگی سنی ان سنی کر گئی۔ بڑے پیار سے بولی۔ "ڈارلنگ میں کنول سے چند ہندوستانی اور نیگرو کلچر کی چند مشترکہ خصوصیات پر بحث کرنا چاہتی ہوں تمہیں دلچسپی ہو تو تم بھی شامل ہو سکتے ہو۔"

"ہم بہتر میں جانیں دونوں کلچر" ڈیوڈ بڑبڑایا۔

میگی نے بڑی بشاشت سے کہا۔ "کنول معلوم ہوتا ہے میرے نیگرو کو تمہارے کلچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس لئے آؤ کہیں اور بیٹھ کر بات کریں پھر تم واقعے میں جیسی ہو بار کے کنارے اونچے اونچے اسٹول دیکھ کر بولی۔ "آؤ وہاں بیٹھ کر بحث شروع کریں۔"

پھر دونوں نے بار کے دو اونچے اسٹول لئے اور ان کو ایک دوسرے کے قریب سرکا کر بیٹھ گئے۔

جولی کنکھیوں سے کبھی انہیں اور کبھی ڈیوڈ کو دیکھ لیتی تھی اور ڈیوڈ کو دیکھ کر

زیرِ لب مسکرائی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" میگی نے پوچھا۔

"تم کیا ہو گی؟" میں نے میگی سے پوچھا۔

"مارٹینی لوں گی۔"

میں نے بار مین سے دو مارٹینیز کے لیے کہا۔

مارٹینی سپ کرتے ہوئے میگی بولی: "دراوڑ لوگوں کی زندگی کے کچھ رسم و رواج ہم افریقی نیگرو لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ان دونوں خطوں کی تہذیب ایک تھی۔ اگر ایک نہیں بھی تھی تو دونوں تہذیبوں میں لین دین ضرور ہوتا ہوگا۔ کچھ ہمارے رسم و رواج یہاں سے وہاں گئے کچھ وہاں سے یہاں آئے۔ مثال کے طور پر موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی کھدائیوں سے جو ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں وہ صرف دراوڑ لوگوں کی ہڈیاں نہیں ہیں۔ نیگرو لوگوں کی ہڈیاں بھی نکلی ہیں۔"

"موہنجوداڑو کے لوگ خاص النسل تھے۔" میگی میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولی۔ "ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کے جسم کی ساخت میں کئی خصوصیات نیگرو نسل کی پائی جاتی ہیں۔"

کنول بولا: "زمانۂ قدیم میں افریقہ اور ہندوستان اور آسٹریلیا تک حبشی تہذیب اور حبشی نسل چھائی ہوئی تھی۔ یہ لوگ دراوڑوں سے پہلے یہاں آباد تھے۔ اس زمانہ میں کہتے ہیں آسٹریلیا ایک جزیرہ نہ تھا۔ ایشیا سے جڑا ہوا تھا۔

"ہاں،" میگی کنول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "آج بھی آسٹریلیا کے اصلی باشندوں اور تامل ناڈو کے رہنے والوں کی۔ زبان میں کئی مشترک الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اور یہ نسلی قربت تہذیبی اور لسانی اشتراک کے بغیر ممکن نہیں ہے"۔—

"ہندوستان میں کبھی کوئی خاص نسل نہیں رہی۔" کنول بولا۔

میگی نے مارٹینی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "مگر میری مارٹینی کا عجیب سا ذائقہ ہے۔ اسے ذرا چکھ کر تو دیکھو۔"

میگی نے اپنا گلاس کنول کے منہ کی طرف بڑھایا۔ زیوڈو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ کنول نے میگی کا گلاس اپنے منہ سے لگا لیا۔ ایک گھونٹ لے کر اور اسے اپنی زبان سے آہستہ سے چکھتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "مجھے تو مزہ ٹھیک لگتا ہے۔ بالکل ٹھیک۔"

میگی اپنا گلاس واپس اپنے منہ کے قریب لائی۔ اور دوسرا سِپ خود لیتے ہوئے بولی۔ "ہاں تو ٹھیک ہی ہوگا۔"

یکایک کھٹکا سا ہوا۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ زیوڈو ٹائم کا رسالہ بغل میں دابے تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

جولی اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہاں تو بحث کس مرحلے پر پہنچی ہے۔" کنول نے پوچھا۔

"بڑے نازک مرحلے پر۔" میگی زور سے ہنس پڑی۔

رات ہل ٹاپ کا ڈانس تھا۔ آج ہوٹل کے منتظمین نے ڈائننگ ہال کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ اور خاصا اہتمام کیا تھا۔ کیونکہ آج ہوٹل کی چوتھی سالگرہ تھی۔ آج سے چار سال پہلے یہ ہوٹل مرگ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ آج سیاحوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ اور ممکن تھا کہ منتظمین نے بہت سے لوگ سری نگر سے بھی خاص اس موقع کے لئے مدعو کئے ہیں۔ ڈیوڈ اپنے کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ پہلا ڈانس یقیناً میگی نے اُسے دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد دوبارہ دو بار کنول کے ساتھ ناچی تھی۔ اور اب تیسری بار ناچنے جا رہی تھی۔

جول بڑے اطمینان سے اپنی میز پر بیٹھی تھی۔ اگرچہ ڈیوڈ بھی کسی یہودی سیاح کی باہوں میں تھی۔ میگی اور کنول ایک دوسرے کی باہوں میں جھول رہے تھے۔ میگی کی آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں جیسے نیلے آسمان سے تیسرے پہر کا اندھیرا ڈوب جائے۔ اس سحر آمیز روشنی میں جول نے کنول کے لئے ایک عجیب جذبہ دیکھا۔ میگی جیسے کنول کی باہوں میں گھل گئی تھی۔ وہ ایک نے کی طرح لچکتی تھی اور ایک دھن کی طرح شروع سے آخر تک مکمل تھی۔ مگر کنول کی باہوں میں پہلے ناچ کی گت بہت دھیمی تھی۔ جیسے جذبے کی ابتدا ہو۔ پھر فضا تیز ہوئی۔ جیسے سمندر بپھرنا شروع ہو۔ اب میگی کی دونوں باہیں کنول کی گردن میں تھیں اور وہ اپنی اونچی ایڑی سے جاپ ڈانس نمبر پر اس فضا تیز گت پر دھمک جاتی تھی۔ ٹھیک سمر پر اور دونوں باہیں کنول کی گردن میں ڈالے ہوئے اسکی

آنکھوں میں آتشیں چمک اور اس کے بدن میں جیسے لاوا پھوٹ نکلا تھا۔ آخر تھی وہ ایک گرم دیس کی رہنے والی۔ اس کے لہو میں بول رہا تھا اور وہ ناچتے ناچتے اپنا سینہ کنول کے سینے سے لگائے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈالے ناچ رہی تھی۔ اور کنول کے ہاتھ نے اس کی پتلی کمر کا پیار احاطہ کر لیا تھا۔ اس طرح کہ وہ دونوں ایک جسم و جان معلوم ہوتے تھے۔ جولی نے اس وقت یہ تو نہیں دیکھا کہ ڈیوڈ کا ردِ عمل کیا ہے۔ ہاں شک و حسد سے وہ خود جل اٹھی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے گرم پگھلتے ہوئے سیال لہو میں دیا سلائی دکھا دی۔ اور جب میگی نے اپنی دونوں بانہیں کنول کی گردن میں ڈال دیں اور اس کے بدن کے لمس پر ڈولنے لگی تو وہ برداشت نہ کر سکی۔ چند منٹ تو اپنی کرسی پر بیٹھی کسمساتی رہی پھر وہ یکدم اپنی میز سے اٹھی اور ڈانس فلور پہ پہنچی سیدھی میگی اور کنول کے پاس اور دو جنونی ڈانس کرتے ہوئے جوڑوں کو نظرانداز کرتے ہوئے تہذیب اور سلیقے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے زور سے میگی کے دونوں ہاتھ جھٹک دئے اور کنول کو میگی سے کھینچ کر ڈانس فلور سے باہر ڈائننگ ہال سے باہر لے گئی۔ میگی حیران اور ششدر کھڑی رہ گئی۔ مگر اس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ مگر کنول کو کھینچ کر لے جاتی جولی پر اس وقت سینکڑوں نگاہیں جمی تھیں۔ میگی نے غم بیزاری کے عالم میں اپنے کندھے اچکائے۔ دونوں ہاتھ یوں جھٹک دئے جیسے معاملہ ہمیشہ کے لیے صاف

...سان کر دیا ہو اور پھر بڑے اطمینان سے ڈیوڈ کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

جولی کنول کو کھینچ کر اپنے سوٹ میں لے گئی۔ اس نے دھکا دے کر کنول کو بیڈ پر گرا دیا۔

کنول نے ہنس کر کہا۔ "مگر ڈارلنگ تم نے تو......"

"مگر میں نے اس قدر قریب اس قدر ننگا ہو کر ناچنے کو تو نہیں کہا تھا۔"

جولی آتش بار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ تو سب جھوٹ تھا" کنول نے احتجاج کیا۔

"دیکھو جھوٹ نہیں تھا۔ میں نے میگی کی نگاہوں میں ایک خطرناک جذبے کو ابھرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ جذبہ جھوٹ نہیں تھا۔ سچ تھا۔ سچ سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ وہ لاوے، حباب، آگ اور شعلے کی طرح خطرناک تھا۔"

"تم نے اپنی حماقت سے سارا کھیل بگاڑ دیا۔"

جولی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ بیڈ پر کنول کے پاس گر گئی۔ اور سسکیاں لے کر بولی۔

"کنول مجھے اپنے گھر لے چلو۔ دلی میں میں ہندوستان کی سیر نہیں کرنا چاہتی۔ میں تمہارے گھر میں ایک ہندوستانی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تم یہاں سے لے چلو۔"

کنول نے گلاس خالی کر کے بیڈ کے نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر اسے اسکی ضرورت محسوس ہو گی۔ اب اس نے ایک ایک کر کے ان چار دلی برسوں کو اپنے پاس بلا لیا جو اس نے دلی میں گزارے تھے۔ وہ چار سال جگل اور کنول کی شادی شدہ زندگی کے بہترین سال تھے۔ سول لائنز میں ایک پرانا گھر تھا۔ آدھا مغلئی آدھا انگریزی طرز کا بنا ہوا جیسے کنول کے باپ نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں بنوایا تھا۔ زنانہ حصہ مغلئی طرز کا بنا ہوا تھا۔ دالان در دالان ۔۔۔ شہ نشین اور کوٹھڑیاں اور بیچ میں ایک کھلا آنگن جس میں کیکٹی اور مولسری چڑھتی تھی۔ ایک جامن کا پیڑ تھا۔ دو آم کے پیڑ تھے ان تینوں پیڑوں کے گرد پکے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ اس آنگن کے دو حصے کر دیئے گئے تھے۔ ایک اونچی

چبوترے پر چھوٹا آنگن۔ چھوٹے چبوترے پر چھوٹا آنگن تھا۔ یعنی بڑے آنگن کا زیریں حصہ۔ جہاں ایک طرف بیری کا جھاڑ تھا۔ اور ایک طرف کپڑے سکھانے کی الگنی جھولتی رہتی تھی۔ زیریں آنگن میں زیادہ تر ملازمائیں اور نوکرانیاں کچھ کام اور زیادہ گپ شپ میں مصروف نظر آتی تھیں اور گھر کی عورتیں بڑے اور اونچے آنگن میں آم کے پیڑ یا جامن کے پیڑ کے نیچے چبوتروں پر نظر آتیں۔ یا جب دھوپ زیادہ ہوتی تو اندر دالان میں پردے کھنچوا کر اور خس کی ٹٹیاں لگوا کر ہانپنے لگتیں۔ مردانے میں ایئر کنڈیشنر لگ گئے تھے اور بڑی بہو جی نے بھی اپنے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگوا لیا تھا۔ اور جب کنول کی بڑی بہن کملا اپنی سسرال سے میکے آتی تھی تو وہ بھی اپنے بچپن کے کمرے میں سوتی تھی جس میں اس نے پتاجی سے کہہ کر ایک ایئر کنڈیشنر لگوا لیا تھا پھر جب چھوٹی بہو یعنی کنول کی اماں بہو بن کر آئیں تو ان کے کمرے میں بھی ایئر کنڈیشنر لگوا دیا گیا۔ مردانہ تو پہلے ہی سے ایئر کنڈیشنڈ ہو چکا تھا مگر وہ اب دھیرے دھیرے مردانے سے زنانہ میں گھس رہا تھا مگر مزاحمت کے بغیر نہیں۔ اماں جی نے اپنے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگوانے کی سخت مخالفت کی تھی۔

"مجھے تو خس کی ٹٹی ہی میں اچھا لگے ہے۔ اس کی سوندھی سی سردی۔ اس اجاڑ گھوڑے مانس ہیر کنڈی میں تو جاڑا لگے ہے مجھے۔ تم کو ہیر کنڈیشن مبارک .... میرے لئے تو خس کی ٹٹی ہی اچھی"......

اتنے میں بڑی بہو بی دالان تک ننگے سر آتے ہوئے اماں کو دیکھ کر آدھا گھونگھٹ کاڑھ لیتی اور اس کا ایک سرا دانت سے دباتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کمر دھنی کو کولہے پر ٹھیک کرتی ہوئی آ کر کھڑی ہو جاتی اور سر جھکا کر پوچھتی۔

"اماں کتھا کہاں ہے؟"

میں کیا جانوں۔ جگریا سے پوچھو۔ کنول کی اماں چاندی کی ہمن کٹی میں گلوری ڈال کر اسے کوٹتے ہوئے بولتیں۔ اماں کے دانت دکھتے تھے۔ اس لئے اب وہ پان کو کوٹ کے کھاتی تھیں۔

مگر بہو جگریا سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔ حالانکہ جگریا اس وقت اماں کے قدموں میں بیٹھی ان کے پاؤں کے تلوے سہلا رہی تھی۔ جگریا کی عمر ستر برس کی تھی۔ ننھی بچی تھی تب یہیں کی تھی۔ جگریا اس گھر میں اس خاندان کی تیسری پشت دیکھ رہی تھی۔ تھی تو وہ نوکرانی۔ مگر گھر میں سکہ اسی کا چلتا تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر اماں بھی کوئی بھی کام نہیں کرتی تھیں۔ بڑی بہو بی اور کملا تک اس سے دبتی تھی۔

جگریا نے منہ پھیر کر پیچھے آنگن کی طرف آواز دی: "اے گوریا۔ ناس پیٹی جانے کتھے کو جوش نہیں دیا ابھی تک کیا......"

تب اس سے پہلے کہ گوریا کوئی جواب دیتی آم کے پیڑوں کے پیچھے گلی کے

دروازے سے جولی آسمانی ساڑھی پہنے، تھوڑا سا گھونگھٹ کاڑھے، ہات میں چاندی کا ایک کٹورہ لیے اماں کے پاس آ گئی اور جھجکتی شرماتی آواز میں بولی۔

"اماں میں نے ذریا کو منع کر دیا تھا۔ رات کو میں نے کٹے کر جوش دیکر زردہ رمیں جما دیا تھا دیکھئے اچھا بنا ہے؟"

اماں بولی۔ "میں کیا جانوں جگریا سے پوچھ۔"

جگریا نے چاندی کا کٹورہ اپنے ہات میں لے کر اسے دیکھا۔ سونگھا۔ قریب کے پاندان سے چاندی کی ایک چمچی نکال کے اس میں سے کٹورے سے ذرا سا کھا نکال کے زبان سے چاٹ کر بولی۔ "اوہم۔ رنگ بھی اچھا ہے ——— ذائقہ بھی اچھا ہے۔ مہک بھی عمدہ ہے...... تو بڑی سیانی ہو۔ چھوٹی بہو۔ کتنی جلدی کھانا پکانا سیکھ گئی ....."

اماں نے جولی کا منہ پیار سے چوم لیا۔ "شاباش۔ تو تو دن بدن سگھڑ ہوتی جا رہی ہے۔ اب کے کرسمس پہ تو میں تجھے نیا جھومر بنوا کر دوں گی۔"

جولی نے اماں جی کے پاؤں چھوئے اور پازیب کھنکھناتی جولی گھوریاں بنانے کے لیے چلی گئی۔ ان کے ذکر سے جولی کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ ان چار سالوں میں جولی نے ہندوستانی معاشرت کے سارے آداب سیکھ لیے تھے۔ صرف اس کی آنکھیں اور اس کا رنگ اور اس کا تلفظ اس کے انگریز ہونے کی چغلی کھاتے تھے۔

دونوں ہر اعتبار سے جولی نے اپنے آپ کو ہندوستانی رنگ میں ڈھال لیا تھا۔ اس کے دیکھے مزاج اور کلچر کو اپنا لیا تھا۔ ہندوستان آ کر سب سے پہلے اس نے اصرار کیا تھا کہ اس کی شادی ہندو رواج سے ہو۔ انگریزی لباس ترک کر کے اس نے ساڑی، دھوتی، قمیض، شلوار پہننا شروع کر دی تھی اور کرتک چوڑی کرتی تھی دہلی میں رہ کر اس نے یہاں کی عام بول چال کی زبان بھی اچھی طرح سے سیکھ لی تھی اور نوکرانیوں اور ملازماؤں سے اس نے بہت سے محاورے اور لطیفے بھی سیکھ کر اپنی زبان میں داخل کر لیے تھے۔ اس کے کوشش ہوئے گھونگھٹ، ماتھے کی بندیا اور پاؤں کے لچھے ہونے کے انداز سے پہلی نظر میں کوئی یہ اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جولی کوئی انگریز عورت ہے۔

صرف اس کا نام تبدیل نہیں ہو پایا تھا۔ اماں جی کے اصرار پر کنول کی ماں کو جولی نام بہت پسند آیا تھا۔ بالکل ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں بگاڑا جائے؟ اور بگاڑا کے دونوں بازو کو ایسے پھیلا کر ایک آنکھ تھوڑی سی بند کر کے اور دوسری ذرا زیادہ کھول کے سوچا تھا اور پھر فیصلہ دیا تھا۔

آں؟ ہاں... ٹھیک تو ہے۔ جولی... منھ پہ آسانی سے چڑھ جاتا ہے۔ جولی... نہیں تو انگریزی ناموں کی پہچان بڑی ٹیڑھی ہوتی ہے۔ بڑی بہو کو دیکھئے کیسے ہو انگریج لیڈی ڈاکٹر آوے تھیں پچھلے سال۔ کتنا مشکل نام تھا لڈیا کتھا ولسن... لڈیا کتھا بڑے بھلا کوئی نام ہے۔

Lydia Catholic بڑی بہو نے آہستہ سے کہا تھا۔ ٹھیک ہے تم!

آپ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ٹیا کتنا برا ہے۔ لٹیا ڈبو دی اس نام نے...... پر جولی تو بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے منہ میں شہد گھلتا ہے۔ یہ جولی! اس کا بالم جُلیمو!!

جس طرح سے بات بنا کے مُگری نے جولی اور جُلیمو کی تلمیح باندھی۔ اس کے بعد کسی کے لیے کچھ کہنا نامناسب تھا۔ سب کھلکھلا کے ہنس پڑے اور جولی کا نام ہندوستانی معاشرت میں داخل کر لیا گیا۔ کنول نے سوچا۔ ہندوستانی کلچر کی اپروچ ہمیشہ سے پریگمیٹک رہی ہے ورنہ یہ کلچر اب تک زندہ کیسے رہتا۔ مصری کلچر فنا ہو گیا۔ بابلی اور یونانی کلچر بھی۔ آج جو کلچر مصر میں رائج ہے۔ اس کا فرعونوں کے زمانے کے کلچر سے روایت ٹوٹ چکی ہے۔ کوئی تار سلامت نہیں رہا مگر ایودھیا آج بھی رام کے زمانے کا کلچر سنتا ہے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر آج بھی مغل کلچر کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ موہنجوداڑو ختم ہو گیا اور آریوں کا خمیر بے داغ بھی۔ مگر شو اور ناگ۔ اندر۔ برہما اور وشنو ــــ مختلف کلچروں کے نمائندے ایک ہی کلچر میں شیر و شکر ہو کر ایک ہی pantheon کا حصہ بن گئے ہیں۔ کیرالہ کے گاؤں کے گرجا دیکھ کر آج بھی پہلے مندروں کا شبہ ہوتا ہے۔ باہر مندر ہے۔ اندر صلیب ہے۔ یہ جذب و انجذاب کا عمل ہمیشہ سے اپنے کلچر میں چلتا آیا ہے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں۔ جذب و انجذاب کا یہ دھیما دھیما مصالحتی انداز اور رنگ آمیزش اُس پورے خطے میں ملتا ہے۔ اُس انڈو ایشیائی خطے میں جہاں کسی زمانے میں ہندوستان کی

معاشرت پھیلی تھی۔ یعنی لنکا۔ برما۔ ملایا۔ کمبوڈیا۔ انڈونیشیا۔ انڈوچائنا اور تھائی لینڈ۔ اس پورے خطے کے کلچر میں معاندانہ مزاحمت کے بجائے باہمی مفاہمت کا انداز ملتا ہے لیکن ہم اس خطے سے کٹے ہوئے ہیں۔ ہم آئرش لینڈ سے دوستی کریں گے لیکن وہ اپنے ہمسائے جن کی آتما ابھی تک ہندوستان کے اعتقاد قریب ہو۔ ان سے دور دور رہیں گے۔ یا ان کو حقیر کی نظر سے دیکھیں گے۔ یہ انداز فکر بھی ہندوستانی نہیں ہے۔ سراسر یوروپیا ہے۔ کیونکہ یوروپ انتہا پسند ہے۔ چینیوں کی طرح۔ مگر ہم بھی انتہا پسند نہیں رہے۔ کسی نہ کسی طرح ہم نے ہمیشہ توازن کو حاصل کر لیا ہے۔ ان پڑھ جگریا نے جس طرح جولی کو اپنا لیا ہے۔ اور لٹریا کتھبرٹ کو رد کر دیا ہے وہ اس کی غیر شعوری لسانی مزاحمت اور اسکی پرگمیٹک۔ پروچ کی دلیل ہے۔ پرگمیٹک اپروچ کو اپنی زبان میں کیا کہیں گے!
کنول نے سوچا وہ اپنی ماں سے پوچھے۔ ماں فوراً کہہ دیں گی میں کیا جانوں جگریا سے پوچھو اور جگریا بے چاری کیا جانے۔ وہ ان لفظوں سے نا آشنا ہے۔ لیکن ان کے معانی سے نہیں۔ پرگمیٹک؟ ـــــ ہیں۔ کیا بکتے ہو۔ پراگ بے پہاگ جی تو میں پچھلے جنم میں انسان کو آئی۔ یہ پراگ متیا کیا بلا ہے۔ میں پراگ جی مہاراج کی سیتا کو جانوں۔ مجھ سے ایسے مذاق نہ کیا کرو منے۔ کنول چونکہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس لئے جگریا ابھی تک اسے پیار سے منا کہتی تھی۔ پیدا ہونے پر سب سے پہلے جگریا نے اسے نہلایا تھا۔ وہ اسے ڈانٹ سکتی تھی۔ منا اپنا سا

منہ سے کہہ چلا گیا۔ "مَنّا۔ میں مَنّا ہوں، جو ہندوستان سے لے کر انگلینڈ فرانس امریکہ تک میری پلاسٹک سرجری کی دھوم ہے اور میں ابھی تک مَنّا ہوں۔۔۔۔ مگر وہ جگریا سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ تو محض ایک مَنّا ہے۔

جب اماں جی جولی کے حسن کی حد سے زیادہ تعریف کرتیں یا اس کے سگھڑاپے کی بڑائی کرتیں تو کنول شوخی سے کہتا۔ "مگر اماں جی آپ اصل میں میری تعریف کر رہی ہیں اسے تو میں نے بنایا ہے۔ سر سے پاؤں تک۔ وہ تو یہ دو کوڑی کی نہیں تھی۔ آپ نے اسے اسپتال میں دیکھا ہوتا جب یہ موٹر حادثے کے بعد بستر پہ پڑی تھی بالکل ڈھیلی اور اس کی ٹوٹی ہوئی پنگھوڑی کی طرح سا جو آج بھی جگریا کی کوٹھری میں رکھی ہے۔ جس کی کوئی شکل ہے نہ ناک نقشہ۔ جیسے اماں جی کو بھی کنول کی بات کا یقین نہ آتا تھا۔ آپریشن ہو سکتے ہیں، ہڈی جوڑی جا سکتی ہے اور کی کھال تھوڑی سی نکال کے اندر لگائی جا سکتی ہے یہاں تک تو انھوں نے بھی سنا تھا۔۔۔۔ یہ یہ۔۔۔۔ تو جب یہ کہتا ہے کہ یہ پتلے پتلے ہونٹ میرے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تلوار کی دھار سی ناک، یہ سیپیوں جیسے کان اور یہ ناشپاتی جیسی تھوڑی۔ یہ موم بتی جیسی لمبی لمبی انگلیاں۔۔۔۔ یہ تو بھگوان نے بنائی ہیں۔ یہ میں کیسے مان لوں۔۔۔۔

"ماننے کی بات نا ہی ہو گئی۔" جگریا نے فتویٰ دے دیا۔

"بوا جی۔۔۔" کنول جگریا کو بچپن سے بوا جی کہا کرتا تھا۔ "تم کو بھروسہ ہے؟

پر کھنا ہو تو چھ مہینے میرے اسپتال میں چل کے رہو تم کو پھر سے بیس برس کی بنا دوں گا۔ مجھوں سے بھی زیادہ سُندر۔ تمہاری موٹی کمر کا سارا فالتو گوشت اور چربی نکال کے ایسی پتلی کر دوں گا کہ جب تم مارکیٹ میں بھاجی لینے جاؤ گی تو بلوہ ہو جائے گا۔"

"چل جھوٹے۔۔۔" اماں پیار بھرے شکایت آمیز لہجے میں بولیں۔ "ایک بہو کا لنگ تو نکالا نہیں گیا تم سے اور سے شیخی بگھار رہے ہو میں تو جب مانوں تم ذرا تم میری بہو کا لنگ ٹھیک کر دو۔"

اماں جی کو دو ہی شکایتیں تھیں ایک تو بہو کا لنگ۔ وہ دور نہیں ہوتا تھا۔ وہ بدستور لنگڑا کر چلتی تھی۔ ساڑھی میں بہت حد تک اس کا لنگڑا پن چھپ جاتا تھا۔ پھر بھی۔ یہ خامی تو اپنی جگہ پر تھی۔ دوسری شکایت اماں جی کو یہ تھی کہ بہو کے بچہ نہیں ہوتا حالانکہ کنول نے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ اس موڑ کے جانے کے بعد بہو کے بچہ نہیں ہو گا۔

مگر اماں جی کسی طرح ماننے کے لئے تیار نہیں تھیں کہ ایسی سُندر اور پیاری بہو کے بچہ نہیں ہوگا۔ "بہت دیکھنے میں بڑے بڑے ڈاکٹر۔ پنڈت دیا کشن کی بیوی کے بھی بچہ نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا۔ اٹھائیس برس کی عمر ہو گئی تھی۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر بھی ڈاکٹروں کو دکھلا لیا۔ کچھ نہ بنا۔ آخر ہندو واڑے کے سادھو نے بھبھوتی دی۔ کیوں بھگوا یاد ہے؟"

جگریا نے یاد کرتے ہوئے ایک میٹھی مسکان سے کہا: "توں وے ہیٹھے پلنگ کے پر بچہ رکھا ہوا تھا۔ یہ انگریزی ڈاکٹروں کی جگہ ان کا ہات بھی ہلک دیتے ہیں۔ وہ جب دینے پر آجاویں ہے۔" میں کہتی ہوں" یکایک جگریا کو کچھ یاد آیا۔ "سنا ہے مرزاؤں کے محلے میں برکت پور سے ایک پیر آیا ہے۔ بہت پر شفا ہاتھ ہے اس کا۔۔۔"

"تو کل چھوٹی بہو کو لے چلیں گے۔" اماں جی نے حامی بھری۔ کنول وہاں سے جلدی کھسک گئی کیونکہ اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ اماں جی اس طرح جہاں کہیں کسی پیر فقیر۔ سائیں سادھو کی سن گن ملی فوراً۔ جولی کو گھونگھٹ کاڑھ کے لے جائیں اور کنول کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جولی کیوں خوشی خوشی ایسی جگہوں پر چلی جاتی ہے۔ اور ہنسی خوشی دھاگہ۔ چٹکی۔ تعویذ۔ دم کیا ہوا غلیظ پانی، بھرا ہوا کٹورا جوڑے دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لیتی ہے اور چٹ کر جاتی ہے۔ کوئی ہندوستانی لڑکی ایسا کرے تو سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر ایک انگریز ماڈرن لڑکی۔ لندن کی دنیا دیکھے ہوئے۔ اسے افسوس ہوتا تھا۔

"اگر تمہارا معدہ کھولا جائے تو کم سے کم دو سیر راکھ اس میں سے نکلے گی اور ڈھیروں کاغذ۔ اتنی راکھ اور تعویذ کے کاغذ تم چاٹ چکی ہو۔ ایک دن سے تمہارا یہ آپریشن بھی کرنا پڑے گا!"

کنول نے جولی سے کہا اور جولی جواب میں صرف کھلکھلا کے ہنس پڑی تھی۔

"ہیں! تمہیں واقعی یقین ہے کہ تمہارے بچہ ہو گا؟"

"نہیں۔"

"پھر یہ دھاگہ کیوں باندھتی ہو؟"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔ اماں جی کا دل بھی خوش ہو جاتا ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا۔ تم اس حد تک اپنے آپ کو ڈھال لو گی۔ تم بالکل کہیں آتی جاتی نہیں ہو۔ ملک بھی تم سے چھوٹ گیا ہے۔ یہاں پر انگریزی عورتوں کی ایسوسی ایشن ہے۔ کئی بار وہ تمہیں بلا چکی ہیں۔ ہمارے کلچر میں رچ بس جانا بہت اچھی بات ہے۔ مگر من کو وشال رکھنا چاہیے۔ کل ہی ایشین [illegible] کا مشہور ناول [illegible] اسٹیج کر رہے ہیں۔ ڈوڈلی نقش کا [illegible] انگریزی ترجمہ ہے۔ بہت عمدہ ہو گا۔ چلتی ہو۔ دو ٹکٹ....؟"

"ناں...." جولی جلدی سے سر ہلا کے بولی۔ "کل تو میرا منگل کا برت ہو۔"

کنول نے غصے سے پیر پٹک دیا۔ جولی اسے منانے کے لئے جلدی سے اس کے سینے سے لگ گئی۔ اور لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے روٹھی آواز میں بولی "اماں جی کہا جو تو پہ مجھے مجبور سے رہنا ہی ہے۔ تم مجھے نتھ بنوا دو۔"

"نتھ؟" کنول حیرت سے چیخا۔

"ہاں میں نتھ پہنوں گی۔" جولی نے اس سے کہا۔ "اماں جی مجھے جنگ پورہ ایک شادی میں لے گئی تھیں۔ وہاں میں نے دلہن کو نتھ پہنے ہوئے دیکھا تھا۔"

ویسی میں بھی پہنوں گی۔ کرواچوتھ کے روز اور چاندی کی تھالی میں گھی کا دیا جلا۔ گلاب۔ زعفران۔ چاول ملا کر تمہارے ٹیکا کروں گی۔ پاؤں چھوؤں گی۔ آرتی اتاروں گی اپنے سوامی کی۔"

کنول ہنس کر بولا: "میرا خیال ہے تم بالکل بھارتی ناری بن چکی ہو۔"

جولی اس کے سینے سے لگتے لگتے بولی: "میرا خیال ہے میں پچھلے جنم میں ہندوستانی تھی۔"

کنول نے جولی کو لپٹا کر پیار کر لیا۔ وہ جولی کی اس قلب ماہیت پر حیرت زدہ تھا مگر خوش بھی تھا۔ یہ چار سال ان کی ازدواجی زندگی کے بہترین سال تھے۔ جب محبت کی ڈالیاں پھولوں سے بھر گئی تھیں اور جولی کے سنہرے بال کمر تک آنے لگے تھے۔ اور وہ اس کا منہ اپنے بوسوں سے بھر دیتا تھا کہ وہ فرط جذبات سے بے بس ہو کر ہانپنے لگتی اور اسے کہنے لگتی: "بس کرو، بس کرو اتنی خوشی مجھے مت دو۔" اور کنول اس کے سنہرے بالوں کے بادبان کھول کر کہتا: "اے کشتی۔ تیرے سنگ کہیں بہت دور جانے کو جی چاہتا ہے۔ کسی جزیرے کے ساحل پر بیٹھ وہ گیت گانے کو جی چاہتا ہے جو جھاگ کرتی ہوئی سمندری لہریں ساحل کا منہ چوم کر گاتی ہیں۔ اونچے اونچے ناریل اپنے ہرے ہرے جھنڈے ہلا ہلا کر تالی بجاتے ہیں اور خوبصورت پالینیشن طوطے ہوا میں پنکھ پھیلائے محبت کرنے والوں پر شریر بچوں کی طرح آوازے کستے ہوئے سروں کے اوپر سے

گزر جاتے ہیں۔

یکایک جولی اس سے الگ ہوتے ہوئے کہتی۔ "لو میں تو بھول ہی گئی اماں نے کہا تھا سامنزی کے لئے مٹھائی تیار کر دوں۔ وہی کیک کا فریج میں رکھا باسی ہو رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جانے دو مجھے۔ تم مٹھائی پیو گے؟

مٹھائی نہیں۔ ہاں کچھ ۔ ۔ ۔ یا آئس کریم ۔ ۔ ۔ ناشتے سفینہ کھیل اطالوی ورژن آف لینڈ کا ریستوران یاد نہیں آتا ہے کیا جولی تمہیں کبھی یاد نہیں آتا ہے ——

کبھی یاد نہیں آتا ہے۔ یاد یاد میری"

"آتا ہے آتا ہے۔" جولی نے مسکراتے ہوئے اپنی کہنیاں اور گھٹنوں کی ایک عجیب سی اشتہا سے کر کہا مگر ایک ریستوران کی طرح نہیں۔ کیا ... شراب خانے کی طرح نہیں۔ ایک منظر وہاں کا یاد آتا ہے۔ جہاں تم مجھے ملنے کے دروازے کے باہر کھڑے ہوتے۔ اور مجھے سہارا دے کر اندر لے گئے تھے اب یاد کرتی ہوں۔ آرلینڈ کو قدرت کا منظر پہنچے نظر آتا ہے اور کانوں میں گھنٹیاں بجتی ہیں۔

کنول جولی کے بستر سے اٹھا اور پھر ڈریسنگ کیبنٹ کی طرف گیا۔ اب رات تقریباً ختم ہونے آئی تھی کھڑکی سے سپیدۂ سحر جھلکنے لگا تھا اور بستر پر لیٹی ہوئی جولی کے چہرے کے خد و خال نمایاں ہونے لگے تھے۔ تاریکی چونکہ ابھی بالکل غائب نہیں ہوئی تھی۔ اور اجالا پوری طرح سے آیا نہیں تھا۔ اس لئے

جولی کا چہرہ آدھا سلیٹی رنگ میں اور آدھا اُجلے رنگ میں نظر آتا تھا۔ اس نے دوسرا ڈرنک بنایا اور بستر کے قریب کھڑا ہو کر جولی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سلیٹی رنگ کے سائے تھے، راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آج کتنی شاموں کے بعد وہ آرام سے سوئی تھی۔ ہولے ہولے نیچے سڑک پر لندن کا ٹریفک شروع ہو رہا تھا۔ جولی نے ایک تھوا بیدہ انداز میں کروٹ لی اور اس کی ایک ٹانگ پنڈلی سے نیچے پاؤں تک ننگی ہو گئی۔ ایسی ٹانگ بے حد متناسب تھی۔

کنول کو یاد آیا، آج سے ڈیڑھ دو برس پیچھے دلی کی گرمیوں کی ایک گھٹی ہوئی حبس شام میں کینسر اسپتال کی لیبارٹری میں کام کرتے ہوئے یکایک اسے اس لنگڑی ٹانگ کو ٹھیک کرنے کی ترکیب سوجھ گئی تھی۔ تجربے تو وہ برابر کر رہا تھا جب سے دلی آیا تھا۔ مگر اسے اب تک کسی تجربے پر اطمینان نہ ہوا تھا۔ آج وہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر خوشی سے اچھل پڑا۔ گھر جا کر جب وہ جولی کو بتائے گا کہ اس کی یہ لنگڑی ٹانگ بھی ٹھیک ہو سکتی ہے تو وہ کتنی خوش ہوگی۔ وہ اور اماں جی اور بجیا اور خود اس کے پتا...... لیکن سب سے زیادہ جولی..... اب وہ دوسری عورتوں کی طرح چل سکے گی۔ دوڑ سکے گی کھیل سکے گی۔ اب اس کا جسم بالکل متناسب اور مکمل ہو جائے گا۔

مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جولی پر اس خبر کا اثر بالکل اس کی توقع

کے خلاف ہوا۔ خوش ہونے کے بجائے وہ افسردہ ہو گئی۔

"مجھے اس بات کا ڈر تھا۔ کسی دن تم کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لو گے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں یہ آپریشن نہیں کرانا چاہتی۔"

میں بالکل حیرت زدہ ہو گیا۔ "تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم اپنے ہوش و حواس میں ہو؟"

"بالکل... میں جیسی ہوں، ویسی ہی ٹھیک ہوں۔ بالکل..... خوش ہوں۔ یہاں مجھے تمہارے گھر میں بالکل خیال ہی نہیں ہوتا کہ مجھ میں کسی طرح کی کوئی خامی ہے۔ رہنے دو اس آپریشن کو....."

"نان سنس۔ یہ آپریشن تو تمھیں کرانا ہی ہو گا۔ کس قدر میرا جی چاہتا ہے۔ تمہارے بیڈمنٹن اور ٹینس کھیلنے کو۔ تمہاری وجہ سے میں نے یہ دونوں کھیل چھوڑ دیئے ہیں۔"

وہ چپ رہی۔ سر جھکائے ہوئے۔

"جولی؟"

"ہاں....." اس نے سر اٹھا کے میری طرف دیکھا۔

"کیا ہے... کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں... یونہی مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا پگلی؟ تم نے اس زمانے میں اتنے آپریشن سہہ لیے۔ جب تم موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہی تھی۔ اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بالکل معمولی آپریشن ہے۔ تین مہینے میں ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

تین مہینے بعد میں نے ایک چمکتی ہوئی صبح میں اپنی کوٹھی کے وسیع مغربی لان میں لے جا کے اس کی پٹی کھولی۔ بید کی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی زعفرانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے اور اس کی پشت پر لان کی باڑھ میں سرخ رنگ کی بوگن ویلیا بیلیں ہوئی تھی اور گملوں میں سفید کارنیشن چمک رہا تھا۔ میں لان کے دوسرے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اور ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا۔ "آؤ"

وہ اپنی کرسی سے اٹھی۔ دونوں پاؤں پر اس نے پورا بوجھ دیا۔ ٹھٹکی چند قدم ہولے ہولے چلی۔ پھر کچھ تیز۔ پھر یکدم دوڑتی ہوئی ہاتھ پھیلائے خوشی سے روتی ہوئی وہ میری بانہوں میں آ گئی۔ اس کا سارا جسم مسرت اور محبت سے کانپ رہا تھا اور وہ میرے کندھے پر منہ چھپائے رو رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔ "میں مکمل ہوں۔ میں مکمل ہوں۔۔۔ کنول۔۔۔۔ میں مکمل ہوں۔۔۔۔ آخر کار۔۔۔۔"

یہ اس کا پہلا ردعمل تھا۔ دوسری بار۔ جب میرے پتا جی نے اس کی صحتیابی کی خوشی میں ایک بڑی پارٹی دی اور اس سے پوچھا۔ وہ کیا چاہتی ہے تو اس نے سوچ سوچ کر کہا۔

"مجھے ایک سوئمنگ پول چاہیے"۔

میں اس کی فرمائش سن کر مسکرا دیا۔ مجھے یاد آیا۔ لندن میں فرصت کے اوقات میں جولی کو تیراکی بہت پسند تھی۔ وہ جب بھی موقع ملے بکنی پہن کر کسی سوئمنگ پول میں گھس جاتی تھی۔

ہمارا گھر بہت بڑا تھا اور اس کے اردگرد باغ بھی بہت پھیلا ہوا تھا۔ یہ پرانے زمانے کا مکان تھا جب لوگ رہنا جانتے تھے۔ آج کل تو بس لگتے ہیں۔ کبھی فلیٹ میں ٹھس گئے۔ کسی بورڈنگ اور کسی کوٹھڑی میں اپنا سر چھپا کے بیٹھے۔ آج کل بس ٹکنے کو جگہ چاہیے۔ رہنے کا زمانہ گزر گیا۔

چنانچہ میں نے مغربی پارٹ کے ایک بڑے لان کو کھدوا کر وہاں نئے ڈھنگ کا ایک سوئمنگ پول بنوا دیا۔ ایک ہفتے تک جولی اس سوئمنگ پول سے نہیں ہٹی۔ اپنے دن کا بیشتر حصہ یہیں گزارتی تھی۔ یہیں ڈبکی لگاتی تھی۔ یہیں ناشتہ کرتی تھی۔ بالکل پاگل ہو گئی تھی وہ اس سوئمنگ پول کے لئے۔ گہرے آسمانی رنگ کی بکنی میں وہ پول میں تیرتی ہوئی آسمانی اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ اس کا موزوں متناسب جسم معلوم ہوتا تھا کسی خراد پر ڈھالا گیا ہے ...... تم کوئی نقص اس میں نہیں دیکھ سکتے۔

نہانے کے بعد تولیے سے جسم صاف کر کے وہ ایک کھلا بلاؤز اور اسکرٹ پہننے لگی۔ اس سے مجھے آرام ملتا ہے۔ نہانے کے بعد ...... اسکرٹ کے ساتھ اونچی

ایڑی کا جوتا آیا۔ سینڈل کم ہونے لگے۔ نہانے میں اکثر اس کے لانبے لانبے سنہری بال گیلے ہو جاتے تھے۔ حالانکہ وہ سر پر ایک شفاف ٹوپی پہنتی تھی۔ مگر پانی پہنچ ہی جاتا ہے۔ اب اسے اپنے لمبے بالوں سے الجھن ہونے لگی۔

ایک دن اس نے اپنے لمبے بال کٹوا دیئے۔ وہاں جی نے برا مانا اور بگڑیا پر تو جیسے غشی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ مگر وہ دونوں خاموش رہیں۔

ہوتے ہوتے جولی نے زنانے میں جانا کم کر دیا۔ سگرٹ پینے کی وجہ سے وہ دوسری ہندوستانی عورتوں کی طرح آم یا جامن کے پیڑ کے چبوترے پر پلنگ پر پھسکڑ مار کر بیٹھ نہ سکتی تھی۔ پیڑھی پر بیٹھ کر مٹھا نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے سامنے ہی اکثر اس کے ہاتھ کا بنا ہوا مٹھا پیتے تھے۔ اب یہ فرض پہلے کی طرح پھر اماں جی سرانجام دینے لگیں۔ بہت ہی غیر محسوس طریقے پر جولی اور گھر کی دوسری عورتوں میں ایک ان دیکھی دیوار سی ابھرنے لگی۔ کوئی کسی سے کسی امر کی شکایت نہیں کرتا تھا۔ مگر ایک دن جولی نے کنول سے کہا۔

”میرا گروہ مردانے ہی میں ہو جائے تو ٹھیک ہے۔ زنانے میں ہر وقت بے کار کی بک بک رہتی ہے۔ بہت باتیں کرتی ہیں تو اسے گھروں کی عورتیں کتنا وقت برباد ہوتا ہے۔“

کنول نے پلکیں اٹھا کر غور سے جولی کی طرف دیکھا۔

جولی نے اپنی نگاہ اس سے نہیں ملائی۔ بولی۔ ”میں کچھ کام کرنا چاہتی

ہوں۔ مگر میں پڑے پڑے سڑنے لگی ہوں۔"

"تو پھر سے برٹش وومن ایسوسی ایشن جوائن کر لو۔"

جیسے جولی کنول سے یہی بات سننے کی منتظر تھی۔ دوسرے دن وہ مسز ٹیگ ہارٹ سے ملنے چلی گئی جو برٹش وومن ایسوسی ایشن کی سیکریٹری تھی۔ اس وقت لنچ بھی اس نے وہیں کھایا۔ اماں جی دیر تک اس کا کھانا لئے بیٹھی رہیں۔ دوپہر کے بعد کوئی تین بجے کے قریب جولی کا ٹیلیفون آیا کہ اس نے لنچ لے لیا ہے۔ اس کا انتظار نہ کیا جائے۔

جب جولی نے روز صبح سویرے گھوڑے کی سواری شروع کر دی تو بڑی بہو کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے دبے الفاظ میں اماں جی سے شکایت کی "یہ چھوٹی بہو کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟"

اماں نے تنک کر کہا۔ "میں کیا جانوں۔ پوچھ جگریا سے؟"

دھیرے دھیرے جولی کی انگریز سہیلیوں نے ہمارے گھر پر آنا شروع کیا۔ جولی ان کے لئے الگ پارٹیاں دینے لگی تھی۔ جس میں اماں جی، بڑی بہو جی، جگریا اور دوسری باعزت ملازمائیں شریک نہ ہو سکتی تھیں۔ بیڈمنٹن اور ٹینس کے میچ برابر ہوتے تھے۔ اور سوئمنگ پول میں تیراکی کے مقابلے۔ انگریز اور امریکی عورتوں نے مل کر نئی دلی میں جو فیشن پریڈ کی تھی اس میں جولی اول نمبر پر آئی تھی۔ برٹش ویمن

ایمی سوویشن کے ریفرینس وال میں ناچنے کے مقابلے میں جولی اور میجر گراس وینٹ کا
جوڑا سب سے اچھا سمجھا گیا۔

میجر گراس اسپتال میں آنکھوں کے علاج کے لیے ایک علیحدہ شعبہ کھلوا رہا تھا بڑے پیمانے پر۔ دوسرے یورپی سفارت خانوں کے لوگ بھی اس کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ ان سب کے علاوہ وہ شو کے موقع پر مولیئر کا مشہور ڈرامہ Bourgeois gentilhomme جسے انگریزی میں کھیلنے کی تجویز کی گئی تھی۔ Dorimene کا پارٹ جولی کو دیا گیا۔ جولی اس عزت افزائی پر بہت خوش تھی۔ دن رات محنت کر رہی تھی اب اس کا زیادہ وقت ریہرسل ہال میں گزرنے لگا۔ میجر گراس وینٹ اس ڈرامے کا ڈائریکٹر تھا۔ بہت ہی لائق مگر کسی قدر سخت گیر۔ کبھی کبھی میں دوپہر کو یا شام کو ہسپتال سے فارغ ہو کر جولی کو اپنے ساتھ لے لیتا تھا وہ گہرے انہماک سے اپنے پارٹ کی ادائیگی کر رہی تھی اور ڈرامے اور اس کی دیگر تفصیلات میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔

"پہلے تین راتوں کے سامنے ٹکٹ بک چکے ہیں۔"

"کون ہیروز؟"

"میری ماں نے یہ ڈرامہ پیرس میں دیکھا تھا۔"

"کون ان میں تھا؟"

"میری گراس وینٹ اور کون تھا" جولی میری طرف متعجب ہو کر دیکھنے لگی تھی

یعنی میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں جو بیچر گراس ویسٹ کا پہلا نام نہیں جانتا... ہیری کہہ رہا تھا کہ اس ڈرامے میں Domino کا پارٹ ایک مشہور فرنچ ایکٹریس نے کیا تھا۔ نام بھی بتایا تھا اس نے مجھے اس وقت یاد نہیں رہا اور ہیری کہہ رہا تھا کہ اس فرنچ ایکٹریس نے بھی اس ڈرامے میں اس مہارت کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ جو ہیری ادا کاری سے نمایاں ہے۔"

"[illegible]"

"کیا بات ہے؟" جولی گھٹنوں کے پیچھے پر جھکتے ہوئے بولی "تم کچھ خوش نہیں معلوم ہوتے ہو۔"

"نہیں۔ میں بالکل خوش ہوں۔ اگر میں اس وقت گاڑی نہ چلا رہا ہوتا تو تمہیں چوم لیتا۔"

خیریت گزری کہ اس بار جولی نے میرے لہجے کو طنز نہیں سمجھا یا اس کے پلے نہیں پڑا یا وہ اسے پی گئی کچھ بھی ہو۔ اس نے اپنا بازو میری کہنی سے ٹکا لیا اور دوسرے بازو سے اپنے بالوں کو ٹھیک کرتی رہی۔

گو اتوار کے روز جولی اماں جی سے کہہ گئی تھی کہ وہ ٹھیک چھ بجے واپس گھر پہنچ جائے گی وہ ریہرسل کے لئے بھی نہ جا پائی۔ ڈرامے کے دن قریب آ رہے تھے اور کل گویا فل ڈریس ریہرسل ہے۔ اس لئے اس کا جانا بہت ضروری ہے۔ ویسے کیا نے ہر بات دکھ لیا ہے۔

یہ جھوٹ تو اس لیے کہا کہ جب مجھے پتہ چلا کہ اس کے لیے اس ریسرچ میں جانا بہت ضروری ہے اور دس دن بعد کام کرنا ہو گا تو میں نے خود اسے بیٹ جمرگ ناشیر کر لینے کی صلاح دی اور خود میں نے ہی اماں جی سے اس خبر کو چھپا لیا اور جمیل کو تاشقند کر کے بھیج دیا۔

شام کے چھ بجے سے اماں جی جمیل کا انتظار کرنے لگیں۔ آٹھ بجے کے قریب اس کا ٹیلی فون آیا۔ کنول نے ریسیو کیا۔

"ڈارلنگ۔ میں کسی طرح نہیں آسکتی دس بجے سے پہلے۔ ریسرچ چل رہی ہے اور میری تمہارے کام سے متعلق نہیں ہے اور ابھی کئی ٹیسٹ ہیں اور کل گیارہ بجے ختم ہو گی ہے۔ اماں جی کو کسی سے بتا دو۔ میں دس بجے سے پہلے نہیں آسکتی۔ تم سے ہی ہمارا ہو جائے گا دوں گی ...... بائی ....!"

ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔

کنول اماں جی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے اماں جی کو بتانے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھیں۔ وہ چپ چاپ منہ موڑ کر نہانے میں چلی گئیں۔ کنول اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے ریسرچ ورک کا مطالعہ کرنے لگا۔ اسی میں نو بج گئے۔ دس بج گئے۔ ساڑھے دس بج گئے۔ پونے گیارہ بجے کے قریب اماں کنول کے کمرے میں آئیں۔ بیچ بیچ بگڑیا پوجا کی تھالی اٹھائے ہوئے۔ تھالی میں آٹے کا دیا۔ گھی سے بھرا ہوا چندن

کیسری چاول، گلاب اور گنگا جل۔ کچھ پیلا سیب۔ ناشپاتی اور تھوڑی سی مٹھائی۔
اماں کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے۔ ایک ڈبے پر لال مخمل منڈھی تھی۔ اسے کھول کر
اماں جی نے مجھے بتایا ۔۔۔ یہ جہانگیریاں میں نے چھوٹی بہو کے لئے بنوائی تھیں۔
کروا چوتھ کے لئے۔ پھر انھوں نے دوسرا ڈبہ کھولا اور اس میں ایک بنارسی ساڑھی
بلاؤز اور چنّی وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ زیور بھی نیا تھا۔ کپڑے بھی نئے تھے۔ اماں جی
اپنی بہوؤں کو کروا چوتھ کے دن سب کچھ نیا پہناتی تھیں۔ انھیں منڈپ لے جاتی
تھیں۔ پھر گھر آ کے چاند کی آرتی اتاری جاتی تھی اور سب کچھ چھوٹ جائے لیکن
کسی بیاہتا استری سے کروا چوتھ کا تیوہار نہیں چھوٹ سکتا۔ کیونکہ کروا چوتھ پوجا کا
تیوہار ہے۔ سندور اس کے اپنے سہاگ کا پرتیک ہوتا ہے ۔۔۔ جیوتی کو یہ سب معلوم
تھا۔ وہ ہر سال بڑے چاؤ اور شوق سے یہ تیوہار منایا کرتی تھی۔ اس کا منانا بھی
ایک بہت بڑا شگن ہے ۔۔۔

"پتی پوجا کا وقت تو گزر گیا ہے" ــــــــــــــــــــ شکوہ جس نے
جو آئے۔ اسے یہ کپڑے اور زیور دے دینا اور کہنا ماں جی بھی لیٹ کر سونے سے
پہلے بھگوان کو ساکشی کر کے پتی پوجا کرے ۔۔۔ یہ نیا زیور بھی پہنے اور سیندور کی
بھی ۔۔۔" اس وقت بھابی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"سمجھ گئی ہوں گی اماں جی ۔۔۔" کنول نے اپنی ماں کو اطمینان دلاتے ہوئے
کہا۔ "وہ بے چاری دوپہر میں ہی پھنس گئی ہو گی۔ نہیں تو کبھی کی اب آ چکی ہوتی۔"

کرنے ہوا میں اسے کہہ دوں گا... وہ تو خود اس تہوار کو بڑے شوق سے مناتی ہے۔ یہ جہانگیر والی چادر کتنی خوبصورت ہیں وہ تو انہیں دیکھ کر ہی خوش ہو جائے گی۔"

مگر کنول کی بجائے اس کا ماں جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جیسے آنسو پی کر اپنے بیٹے سے اپنے دل کے جذبات چھپاتے ہوئے اس کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ اور گھوم کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے جگریا بھی چلی گئی۔

کنول نے سب چیزیں اٹھا کے سنگھار ٹیبل پر رکھ دیں۔ پھر اپنے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ اور کپڑے بدل کے اور بتی بجھا کے گرم گرم لحاف میں لیٹ گیا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اور وہ بہت تھکا ہوا تھا اسے جلد نیند آ گئی۔ کوئی دو بجے کے قریب اسے اپنے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کروٹ لئے لیٹا تھا۔ جگریا کا ہاتھ اس کے کندھے سے سرک کر اس کے سینے پر آ گیا۔ دوسرا ہاتھ اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

"سو گئے کیا؟"

"کیا وقت ہو گا؟"

"دو بج رہے ہیں... واقعی بہت دیر ہو گئی ڈارلنگ۔ مگر کیا کروں۔ یہ میرا کوئی ایک بیٹے محترم ہوئی۔ اب جاگ کے یہیں بستر پر بیٹھی ہوں۔ رات کس قدر ٹھنڈی ہو گئی ہوں۔ نیند سے گری پڑتی ہوں۔"

کر رہا ہو تو کوئی بات نہیں کی اس نے... شاید دھیان سے اتر گیا ہو گا۔

مگر میں بھی کیوں یاد دلاؤں۔ کنول نے سوچا۔ وہ میرے مطالعے کے کمرے سے آتی رہی ہے۔ بیڈروم تک آنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ یقیناً اس نے مطالعے کے کمرے میں آکے روشنی کی ہوگی۔ سنٹر ٹیبل پر پھیلی ہوئی ساڑھی۔ بلاؤز کو دیکھا ہوگا تحفے کے ڈبے کو بھی۔ ان چیزوں پر اس کی نظر ضرور پڑی ہوگی۔ اس کے بعد بھی اگر اسے کرواچوتھ کا یاد نہیں ہے تو میں کیوں یاد دلا کے اپنی ہیٹی کراؤں۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گی اسے۔۔۔ کنول کو غصہ آنے لگا۔۔۔۔

جگل کا ہاتھ اب اس کے بالوں سے نکل کر اس کے ماتھے کو ٹٹول رہا تھا۔ ماتھے سے نیچے اگر وہ آنکھوں پر آگئیں تو اس کی انگلیاں کنول کے آنسوؤں سے بھیگ جائیں گی۔ ہے رام۔ ایسا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو۔ جگل کی انگلیاں میری آنکھوں پر نہ آئیں۔ ورنہ اس کی انگلیاں بھیگ جائیں گی اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں رو رہی ہوں۔۔ رام اس کی انگلیوں کا رخ پھیر دے۔۔۔۔

جگل کی انگلیاں ماتھے سے پلٹ کر اس کے کانوں کی لو پر چلی گئیں۔ وہاں سے اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر۔۔۔ جگل آہستہ سے بولا۔ گڈ نائٹ ڈارلنگ۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔۔۔

وہ اطمینان کا ایک لمبا سانس لے کر اپنے دونوں بازو اس کے سینے پر رکھ کر سو گیا۔ مگر کنول دیر تک جاگتی رہی۔ آہستہ سے اس نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور پھر دیر تک جاگتی رہی۔

جولی کو یاد آیا کہ ولٹ شائر میں اس کا ایک چچا رہتا ہے۔ حالانکہ ایک بار جولی اور کنول نے ولٹ شیر ڈاؤنز میں دو دن پکنک کے گزارے تھے۔ مگر اس بار جولی نے وہاں اپنے کسی انکل کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اب وہ اپنے چچا سے خط و کتابت کرنے لگی پھر لندن میں اپنی دوسری سہیلیوں سے۔ واچوتو کے واقعے کے کوئی چھ ماہ بعد اس نے کنول سے کہا میں انگلینڈ جانا چاہتی ہوں۔ میرا چچا بیمار ہے۔ تم بھی چلو۔ تم بھی بہت عرصے سے انگلینڈ نہیں گئے ہو۔ کیا تمھیں لندن یاد نہیں آتا۔

"پچھلے چار سال تو تمھیں بھی لندن نہیں یاد آیا تھا۔ نہ اپنا چچا۔ نہ اپنی لندن کی کوئی سہیلی۔" کنول نے طنز کیا۔

"اب یاد آتا ہے۔ سب کچھ۔"

"کیوں؟"

"کہہ نہیں سکتی۔ لندن جانا چاہتی ہوں۔"

"تو جاؤ۔ میں ہوائی جہاز سے تمہاری سیٹ بُک کیے دیتا ہوں۔"

"تم نہیں جاؤ گے۔"

"میں اس وقت ایک بہت اہم ریسرچ میں مصروف ہوں۔ پھر مجھے اسپتال سے اتنی جلدی چھٹی نہیں ملے گی۔ تم ہو آؤ۔ کتنے دن کے لئے جانا چاہتی ہو؟"

"صرف پندرہ دن کے لئے۔"

پندرہ دن گزر گئے۔ بیس دن گزر گئے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ دو مہینے

گزر گئے۔ پھر جولی کا ایک خط آیا۔ "فوراً لندن آجاؤ۔ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

میں خط لے کر لندن پہنچ گیا۔ کینسنگٹن گارڈنز والے دو کمروں کے فلیٹ میں۔ جہاں جولی رہتی تھی۔ اس فلیٹ میں جولی نے سب سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اب واپس ہندوستان نہیں جائے گی۔ اگر میں اس سے پیار کرتا ہوں تو مجھے یہیں انگلینڈ میں اس کے ساتھ رہنا پڑے گا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ میں ساڑھی نہیں پہن سکتی۔۔۔"

"چار برس تک تم نے ساڑھی پہنی۔"

"اس وقت تک میں مکمل نہ تھی۔ ادھوری تھی۔ جونہی میرا لنگ دور ہوا، مجھے احساس ہونے لگا کہ ساڑھی ایک آہستہ خرام لباس ہے۔ میری حرکت میں حائل ہوتا ہے۔ تم جانتے ہو۔ یوروپی عورتیں ہندوستانی عورتوں سے دگنا تیز چلتی ہیں۔"

"چل کر کہاں جاتی ہیں۔ بچے تو نو مہینے میں ہی جنتی ہیں۔ آج تک کبھی نہ سنا کسی انگریز عورت نے نو مہینے کے بجائے چوتھے مہینے بچہ جن دیا ہو۔"

"انگریزی لباس زیادہ آرام دہ ہے۔"

"آخری ڈیڑھ برس میں تم انگریزی لباس ہی پہنتی تھیں۔ وہاں بھی کے

اعتراض کے باوجود میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔"

"مجھے جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہی نہیں ایک مدت سے۔"

"میں نے کہا۔ تم تو اس سسٹم میں ڈوب گئی تھیں۔ مندر بھی جاتی تھیں۔ کچن میں بھی کام کرتی تھیں۔ برت بھی رکھتیں تھیں۔ پوجا بھی کرتی تھیں۔ چار سال تک تمہاری پوری زندگی ایک ہندوستانی عورت ایک خوش مزاج ہندوستانی بہو کی طرح گزری۔ ہر وقت اماں جی کے کولہے سے لگی رہتی تھیں تم..... پھر اچانک کیا ہو گیا؟"

"میں ٹھیک سے بتا نہیں سکتی۔ لگتا ہے جیسے کہیں پر وہ مجبوری کی زندگی تھی۔ میں لنگڑا رہی تھی۔ مکمل نہ تھی۔ لندن ——— میں ہر شخص کی نظر مجھ پر رحم اور ہمدردی سے پڑتی۔ دہلی میں نہیں۔ تمہارے گھر پر نہیں۔ تمہارے زمانے میں جیسے میں جیسے صدیوں سے بہت دور تھی۔ لیکن جس دن میں مکمل ہو گئی میرے پہلے دن پھر سے جاگ اٹھے۔ ایک ایک کر کے مجھے زیادہ حرکت۔ زیادہ کام زیادہ تیز رفتار اپنے پاس بلانے لگے۔ شاید تمہارا کلچر ایک لنگڑا کلچر ہے۔ آہستہ رو ہے۔ بہت دھیرے سے آگے بڑھتا ہے۔ یا شاید آگے ہی نہیں بڑھتا ہے۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک ایک ہی منزل پہ ٹکا رہتا ہے۔ جب تک میں لنگڑی تھی۔ سب ٹھیک تھا۔ میں وہاں رچ اور بس گئی تھی۔ مجھے کچھ برا نہیں لگتا تھا۔ مگر جب تم نے مجھے دوسرا پاؤں دے دیا تو دن بدن بے چین ہوتی گئی۔ لندن کی تیز رفتار

زندگی مجھے اپنے قریب کھینچنے لگی ۔ ذرا ایک لمحے کے لئے سوچو کہ جب میرے —
دونوں پیر سلامت ہیں تو میں گھٹنوں یا من کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر انتظار کیوں کرتا
رہوں ۔ بال روم میں ڈانس کیوں نہ کروں ۔ زندگی بہت مختصر ہے اور میں جب وہ
زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں جو صرف یورپ میں ممکن ہے ۔۔۔۔

"بھرپور زندگی ؟ — میں سوچنے لگا ۔ جولا ، بھرپور زندگی سے تمہارا کیا
مطلب ہے ۔ کیا زیادہ چلنا ہر وقت بے چین اور مضطرب رہنا ۔ ایک بے چین
تتلی کی طرح ایک خواہش سے دوسری خواہش کے گرد طواف کرنا ۔۔۔ کیا یہ بھی
بھرپور زندگی ہے ؟ شاید وہ بھی بھرپور زندگی بسر کرتی تھیں جو زیادہ حرکت نہیں
کرتے ۔ مجھے اپنی اماں جی یاد آنے لگیں ۔ سال میں آٹھ دس بار سے زیادہ وہ گھر سے
باہر نہیں نکلتی ہوں گی ۔ ان کی ساری زندگی زنانے کے آنگن میں ہی گزر جاتی ہے
ہے ۔ انھوں نے کبھی ٹینس نہیں کھیلا ۔ گھوڑے کی سواری نہیں کی ۔ کوئی مطلب جوائن
نہیں کیا ۔ گاڑی وہ نہیں چلا سکتیں ۔ پرائے مردوں کے سنگ وہ نہیں ناچ سکتیں ۔
مگر کیا تم کہو گی کہ انھوں نے بھرپور زندگی نہیں گزاری ہے ؟ وہ محبت جو گھونٹ گھونٹ
کی آڑ میں ہے ۔ وہ پیار جو خدمت میں ہے ۔ وہ فلسفہ جو تلسی کے دیوی میں ہے ۔
وہ زندگی جو زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لئے وقف ہے ۔ اس کا تم اپنے
یورپ کی زندگی سے کیسے مقابلہ کرو گی ۔ دونوں الگ الگ categories
ہیں ۔ ایک سمندر کی بے پناہ لہر ۔ دوسری آنگن میں مسکراتی پھلواری ۔ ایک آگ

کی طرف جھکتی ہے۔ دوسری چھپا کی طرف اٹھتی ہے۔ محبت میں ایک کے ہاتھ گردن کی طرف
بڑھتے ہیں۔ دوسرے کے پاؤں کی طرف جھکتے ہیں۔ ایک جسم میں سفر کرتی ہے۔
دوسری متوازی کیفیت میں چلتی ہے۔ میں ایک کا دوسری سے مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں۔
دونوں مختلف کیفیتیں ہیں۔ مختلف درجے ہیں۔ زندگی بتانے کے دو مختلف رنگ
ہیں اگر مقابلہ کرنا ہی ہے تو ساٹھ برس کی عمر میں کرو۔ ساٹھ برس کی ایک اوسط
یوروپی عورت کو اماں جی کے سامنے لاؤ۔ اور پھر مقابلہ کرو۔ پھر جو زندگی کا
فیصلہ وہاں پر ہوگا۔ یوروپی عورت ایک پرانی شکستہ کھوکھلا سنگار کی طرح
دکھائی دے گی جس نے جوانی میں بہت تیز سفر کیا ہو۔ اور اب جیسے یوروپ کے
بے حد مصروف زندگی کے کباڑ خانے میں ڈال گئی ہے اور اماں جی آج گھر کے
آنگن کے وسط میں تلسی کے دیوی کی طرح کھڑی ہیں جس کے ارد گرد آم اور جامن
کے پیڑ ہیں۔ جہاں رات کی رانی کھلتی ہے۔ جہاں گھونگھٹ کا ڈھے پاؤں چھوتی
ہیں۔ دیواروں پر لوکی کی بیلیں جھولتی ہیں۔ جگریا کے بیچ گوری دبائے کھڑی
ہے۔ اور اماں جی چاندی کے گلاس میں متھا بھر کر اور گلاس کو ذرا اونچا کر کے
اور گھونگھٹ کو ذرا سا نیچا کر کے کہتی ہیں۔ "ان کو دے آؤ۔ جگریا!" وہ
آج بھی اتنی عمر گزر جانے پر اپنے خاوند کا نام نہیں لے سکتیں۔ میں کیسے ان کا
مقابلہ کر سکتا ہوں اس یوروپی عورت سے جو دن میں دو سو دفعہ اپنے خاوند کو
ڈارلنگ کہتی ہے۔ اور کبھی ایک دفعہ بھی نہیں۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کون

بھرپور ہے۔ کون اتنا بھرپور نہیں ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تم ابھی کوئی فیصلہ کرنے میں حق بجانب ہو۔۔۔"

"حق بجانب ہوں کہ نہیں یہ تو میں نہیں جانتی اتنا ضرور جانتی ہوں کہ کیا ٹھیک ہے اسے معلوم کرنے کے لئے میں سات سال تک انتظار نہیں کر سکتی شاید تم بھی نہیں کر سکتے۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ پیار سے مطلب میرے اپنے ڈھب، رنگ اور مزاج کا پیار ہے۔ اگر تم ضد کر کے مجھے واپس دلی لے گئے تو میں مر ہی جاؤں گی۔ ہو سکتا ہے پھر بھاگ آؤں۔ وہاں میرا دل نہیں لگے گا۔ یہاں تمہارے بغیر خوشی نہیں ملے گی۔ سوچ لو۔۔۔"

کیا سوچوں۔ جولی کو چھوڑنا بھی مشکل ہے۔ جولی سے رشتہ بھی تو عجیب سا رشتہ ہے۔ صرف خاوند بیوی ہی کا رشتہ نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے جولی میرے بدن کا ایک حصہ ہو۔ جولی جانتی ہے۔ اس کے بدن میں میرے بدن کی ایک پسلی شامل ہے۔ جو میں نے آپریشن کے ذریعے اسے دی ہے۔ شاید اسی طرح آدم کی پسلی سے حوا پیدا ہوئی تھی۔ میں حوا کی بیٹی کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔۔۔

دو تین دن سوچنے کے بعد میں نے جولی کو بتا دیا کہ میں لندن میں پھر سے کام شروع کرتا ہوں۔ سینٹ جارج اسپتال میں مجھے وہی پرانی ملازمت مل گئی اور میں جولی کے ساتھ رہنے لگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جولی میرے ساتھ

دلی رہتی۔ مگر مجھے امید تھی کہ جولی کا یہ فیصلہ عارضی فیصلہ ہو گا۔ برس، دو برس جس میں اسے دلی واپس چلنے کے لئے رضامند کر لوں گا۔

مگر اس کے ارادے پورے نہیں ہوئے۔ وہ راستے جو دلی میں ایک دفعہ الگ ہوئے تھے۔ پھر ساتھ رہنے سے بھی دوبارہ مل نہ سکے۔ ہوتے ہوتے جولی الگ اپنے راستے پر چلنے لگی۔ کنول الگ اپنے کام اور اپنی ریسرچ میں ڈوبتا گیا۔ جولی کی

کیس کی کامیابی نے اس کے ذہن اور فکر کو اپنے من پسند موضوع کی طرف اور بھی راغب کر دیا تھا۔ اس کی دلچسپیاں کچھ گمبھیر اور سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ وہ جولی کے شوخ اور کھلنڈرے دوستوں کو پسند نہیں کرتا تھا اور جولی اس کے بور ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کو۔

کبھی کبھی اپنی طبیعت پر جبر کر کے وہ جولی کے دوستوں میں چلا جاتا۔ وہ ایک خوش شکل وجیہہ، صحت مند مضبوط آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ ان سے ان ہی کے محاورے میں گفتگو کرتا۔ شگفتہ، شوخ، چنچل، سطحی گفتگو، تیز بیلو پش کاروں، ہنگامی میوزک کے ریکارڈوں اور پک نک کی چھچھوری حرکتوں میں حصہ لیتا۔ مگر بہت جلد اکتا جاتا۔ چند منٹوں کے بعد وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ پاتا۔ اس زندگی کی گرامر ہی الگ تھی۔

وہ اپنے ڈاکٹر دوستوں اور سائنس دانوں کے گھروں میں بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ مگر ہمیشہ ایک فرق سا رہتا۔ ایک غیر محسوس امتیاز۔۔۔ جیسے وہ کبھی عبور نہیں کر سکتا تھا۔ تمام محبت۔ تمام شفقت تمام دوستداری کے باوجود کبھی کسی کی کوئی خفیف سی حرکت گفتار کا لہجہ، نگاہ کا انداز، جنبش کا رخ اسے جتا دیتا تھا کہ وہ ایک آؤٹ سائڈر ہے۔ وہ کبھی اندر نہ آ سکے گا۔

ہر exclusive تہذیب کے ساتھ رہتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ چند گز تک تو وہ اندر آنے دیتی ہے۔ اس سے آگے جانے کی کوشش کرو تو مزاحمت کرتی ہے۔ باہر جھٹک دیتی ہے۔ ہر exclusive تہذیب بظاہر extrovert معلوم ہوتی ہے۔ دلکش۔ فراخ دل۔ مگر اندر سے ایک سیپی کی طرح بند۔۔۔

"There is a hard core in side like earthe mantle which nothing can pierce - my boy — nothing can."

تم انگلینڈ میں پچاس برس رہو گے پھر بھی اجنبی رہو گے۔ اپنی انگریز بیوی کے لئے بھی اجنبی۔ جیسی کلفٹ نے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے اس سے کہا تھا۔

جب وہ اس سے ایک روز ملنے گیا تھا اور مشورہ لینے گیا تھا۔

"تمہاری غلطی یہی رہی۔ کیسے اس تم نے جوڑی کا رنگ ٹھیک کیا۔ تمہاری ساری کی ساری جبلتیں اسی ایک دن سے شروع ہوتی ہیں۔ اگر وہ زندگی بھر انگلش رہتی

تو زندگی بھر ہندوستان میں رہتی۔"

"آپ کا کہنے کا مطلب ہے کہ ہندوستان میں صرف لنگڑی عورتیں رہ سکتی ہیں؟"

جم زور سے ہنسا۔ "مجھے تم بالکل غلط سمجھے ہو کنول۔ میں تمہیں ایک بالکل دوسری ہی بات سمجھا رہا تھا۔ جب تک وہ ادھوری تھی۔ وہ کسی اجنبی سے اجنبی وطن میں رہ سکتی تھی۔ مگر مکمل ہونے کے بعد۔"

"نال برائے.... کیا تم یہ نہیں جانتے کہ جونہی کوئی چیز مکمل ہوتی ہے۔ اپنی ابتدا کو لوٹتی ہے۔ یہ بیک کا سمک لا ہے۔"

"جہنم میں جائے تمہارا کاسمک لا۔" یکایک کنول کو غصہ آگیا تھا۔ اور اس نے شراب کا جام آتش دان میں کھینچ مارا تھا۔ اور جم بجائے خفا ہونے کے بجائے ہنس پڑا تھا۔

اکتوبر میں اسے دسہرہ یاد آیا تھا۔ نومبر میں دیوالی۔ دسمبر میں جب لوگ کرسمس منا رہے تھے۔ وہ کناٹ پلیس میں گھوم رہا تھا۔ اسکی جیبیں چلغوزوں اور بھنے ہوئے پستوں سے بھری تھیں۔ اس کا دل چاٹ کھانے کو چاہ رہا تھا۔ لندن کی سرد دسمبری بھیگی شاموں میں چاٹ کھانے کو کس کا جی چاہے گا؟ اس کے لئے چمکتی دھوپ کی ضرورت ہے۔ نیلے آسمان کی۔ اور شوخ رنگ ساڑھیوں کی....

پھر بھی وہ رہتا۔ شاید من مار کر رہتا۔ جیسے اب رہتا تھا۔ مگر رہتا تو وہ کیونکہ ہر رات کو جولی گھر پر آجاتی تھی۔ اپنے انداز میں اس کے لئے پرخلوص تھی۔ اپنے طریقے سے وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ چاہتی تھی اور خیال کرتی تھی۔ نیا سال انہوں نے اکٹھے منایا تھا۔ رات بھر خوشی سے ناچتے اور پیتے رہے تھے۔ صبح کو سو گئے تھے۔ سہ پہر میں اٹھے تھے تو کنول کو اپنے بستر کے تکیے کے نیچے جولی کا خط ملا۔ "میں دو دن کے لئے ہیسٹنگز جا رہی ہوں۔ ضروری کام ہے۔ تم پریشان نہ ہونا۔ آکے سب بتا دوں گی۔

تمہاری جولی۔"

دو دن گزر گئے۔ پانچ دن گزر گئے۔ جولی نہیں آئی۔ سات جنوری کو جم نے اسے بتایا کہ اس نے جولی کو ایک رنگین پارٹی میں پیرس میں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً ہیسٹنگز نہیں گئی تھی۔ یا ممکن ہے ہیسٹنگز سے پیرس چلی گئی ہو۔ بہت عمدہ پارٹی تھی۔ بے حد متمول امیر زادوں کی پارٹی تھی اور جولی ان سب میں شہزادیوں کی طرح بنی سنوری سب کی توجہ کا مرکز تھی۔

جم کا استہزائیہ لہجہ۔ اسکی نگاہ کی خفیف حقارت۔ اس کی ہنسی کا انداز خون کھولا دینے کے لئے کافی تھے۔ کنول چپ ہو گیا۔ اس کا رد عمل دیکھ کر جم فوراً ہی خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی خاموشی کہے دیتی تھی کہ اگر وہ چاہے تو جولی کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہے۔

سب جرم چلا گئیں تو بار بار اس کے کہے ہوئے طنزیہ جملے اپنے آپ کو کنول دل میں دہرانے لگے۔ جولی ہر ماہ اپنی کار بدلتی ہے۔ پھر دوسرے ماہ اسے پھر اس نے فیشن کے مطابق ڈریس ـــــ اس تیز رفتار پر آن بہ لحظہ بدلتی ہوئی زندگی میں صرف شوہر نہ بدلا جائے۔ یہ تو حماقت ہوگی۔۔۔ اور جولی میں ہزار عیب ہوں۔ مگر وہ احمق نہیں ہو سکتی!

کنول اتنا گرا ہوا اور غضب ناک تھا کہ جرم کے جبڑے توڑ سکتا تھا اور اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر سکتا تھا۔ اس پر بھی اگر وہ خود خاموش رہ گیا تو اس لئے کہ جولی کی طویل غیر حاضری اسے خود شدید الجھن اور وسوسوں میں ڈال دیتی تھی۔

پھر کنول نے ایک فیصلہ کیا۔

اور جس روز اس نے یہ فیصلہ کیا۔ اسی رات جولی واپس گھر آگئی۔ رات کے دس بجے فلیٹ کا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ پہلے گھنٹی اور پھر ایک بے حد لمبی دستک ہی سے وہ سمجھ گیا کہ جولی ہے۔ جولی پریشان بال بکھرائے ہوئے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوئی اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول پڑی۔ میں تو ادھ مری ہو گئی ہوں۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ اگر گھر میں کھانے کے لئے کچھ ہے تو فوراً دے دو۔ میں کھانا کھا کے سو جاؤں گی اور صبح تمہیں بتا دوں گی۔

کنول نے اس کے لئے ایک آملیٹ بنایا۔ توس تیار کئے۔ مکھن جام اور جانے جو کچھ تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک بھوکی بلی کی طرح کھاتی گئی۔ پھر وہ بولی

باہیں اُس کے سینے پر رکھ کر سو گئی۔

رات کو وہ آہستہ سے اُٹھا۔ ٹارچ جلا کر اس نے جولی کا سوٹ کیس کھولا۔ ایک کونے میں اسے پیرس کے فوٹو مل گئے۔ اس خوبصورت، رنگین پارٹی کے۔ جولی نشے میں جولی دوسروں کی باہوں میں۔ جولی چومتی ہوئی کسی دوسرے کو..... یقیناً وہ اب اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔

باقی ساری رات اس نے جولی کے بستر پر بیٹھ کر گزاری۔ یا ٹہل کر یا پی کر۔ اس نے جولی کے ساتھ اپنی بیتی ہوئی زندگی کا ہر زاویہ سے ریویو کیا۔ پھر بھی وہ اپنے فیصلہ کو بدل نہیں سکا۔ وہ اپنے دائرے میں چل رہا تھا۔ مگر جولی ایک Tangent کی طرح اس کے محور سے اکھڑ گئی تھی۔

There is a tangent in a parabola, in a parabola, in a rabola, bola, bola one bola.

سب ختم ہے
اس آخری کھیل نے
بے درد ترکیب کو مکمل کر دیا۔
نقاب الٹ گیا۔
اور خدا کے زخم گن لئے گئے
سب واپس۔

ہر طرف سنگلاخ تجربے کا خلاء رچا گھٹتا ہے
بجھے ہوئے سورج میں زندگی نہیں۔

نہ رہا ایمان۔

نہ کوئی بلندی نہ پستی نہ نشان۔

انتہا میں بھی ختم (David gas - coyne)

اس نے سوئی ہوئی جولی کے ماتھے پر آخری بوسہ دیا اور بے آواز قدموں سے
فلیٹ کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

ختم شد

سید احتشام حسین کا نام اردو کے ان ممتاز نقادوں میں سر فہرست آتا ہے جنہوں نے جدید اردو تنقید کی رہنمائی کی ہے۔

اور

احتشام صاحب کے

اعتبارِ نظر

۲۱ اہم ترین مضامین کا مجموعہ ہے۔

صفحات : ۳۰۰

قیمت : ۴½ روپے

نظریاتی تنقید پر اردو میں اس قدر کم کام ہوا ہے کہ اسے تقریباً نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن

جدید اردو تنقید، اصول و نظریات

کے ذریعہ ڈاکٹر شارب ردولوی نے اس کمی کو بڑی حد تک دور کیا ہے
اردو میں اپنے قسم کی پہلی تصنیف قیمت ۱۵ روپے صفحات ۵۰۰ بڑا سائز

نصرت پبلشرز ۔ وکٹوریہ اسٹریٹ ۔ لکھنؤ ۳

جدید ادبی تنقید میں ایک قابل قدر اضافہ

فلسفہ اور ادبی تنقید نئے تنقیدی مسائل پر

ڈاکٹر وحید اختر

کی ایک تصنیف جس میں جدیدیت اور جدید ادب پر
سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آج کے ادبی و تنقیدی مسائل
کو سمجھنے کے لئے ایک ناگزیر دستاویز قیمت ۱۲ روپے

کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے

(۱) نظریاتی مباحث

(۲) جدیدیت اور جدید ادب

(۳) تنقیدی مطالعہ

تاجران کتب کو خاص رعایت

- قیمت پیشگی بھیجنے پر براہ راست خریداروں کو ڈاک خرچ نہ ہوگا
- ۵ روپے پیشگی بھیجکر ادارہ کی کوئی تمام کتب طلب کرنے پر ڈاک خرچ ۲۵ فیصدی کی رعایت

ملنے کا پتہ: نصرت پبلشرز۔ وکٹوریہ اسٹریٹ۔ لکھنؤ ۳

ماہنامہ "کتاب" کی ۳ یادگار اشاعتیں

جو ہمیشہ زندہ رہیں گی

افسانہ نمبر قیمت ۶/-

۳۱ افسانے، ۲ ناولٹ، ۳ ڈرامے، ۴ مضامین اور ۲ منکر انگیز سمپوزیم
۳۰ تصاویر، صفحات ۲۳۴

سالنامہ ۱۹۶۶ء قیمت ۳/-

اس یادگار نمبر میں آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، فراق گورکھپوری
ڈاکٹر محمد حسن، مجید امجد، قاضی عبد الستار اور بہت سے دوسرے فنکاروں
کی تخلیقات شامل ہیں

سالنامہ ۱۹۶۷ء قیمت ۶/-

اس یادگار نمبر میں ہندستان اور پاکستان کے صفِ اول کے فنکاروں کی
تخلیقات کے علاوہ جدید شاعری پر ایک پُر مغز سمپوزیم شامل ہے جس میں
ہند و پاک کے سارے ہی اہم نقادوں اور شاعروں نے حصہ لیا ہے۔

نئی ہندی کہانی نمبر قیمت ۲/-

اُردو افسانے نے ہندی افسانے کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ اس نمبر سے لگا سکتے ہیں

علی عباس حسینی نمبر قیمت ۲/-

اس نمبر میں حسینی صاحب کی بہترین کہانیوں کے انتخاب کے علاوہ ان کے فن اور زندگی پر متعدد مضامین شامل ہیں

منتخب افسانہ نمبر قیمت ۵ روپے

اُردو افسانہ نگاروں نے ۱۹۶۲ء میں کم و بیش ۲ ہزار افسانے تخلیق کیے جن میں سے رام لعل اور عابد سہیل نے ۱۲ افسانے منتخب کیے۔

مراٹھی کہانی نمبر قیمت ۲/-

اس نمبر میں مراٹھی کی ۲۰ نمائندہ کہانیوں کے علاوہ مراٹھی ادب پر فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ مرتب نے خود پیش کار کے اس کارنامہ کو علمی اور ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔

ماہنامہ کتاب ۔ کپور مارکیٹ ۔ لکھنؤ ۳

کیسے کاٹوں رین اندھیری

واجدہ تبسم

(حیدرآبادی ماحول پر لکھا گیا ایک ناول)

واجدہ تبسم

کیسے
کاٹوں
رین
اندھیری

UNIVERSITY LIBRARY
ALLAHABAD

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اوّل : فروری ۱۹۷۶

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : دس روپے

مطبوعہ : اعلیٰ پریس بلیماران

846-4
714

ناشر

مسیحی بک سنٹر دریا گنج نئی دہلی ۲

3478558

آج قدیر میاں کی شادی تھی —

سامنے ہی سجے سجائے برآمدے میں زیتون پڑی ساں ساں سو رہی تھی — اماں بی نے جو بھاگتی ہوئی، بھنڈار والی کوٹھری کو جا رہی تھیں۔ اس کی کمر میں ایک لات رسید کی —

"ارری چھنال تیری نیند کو کوئی وقت ہے — ؟ یہاں کھاٹ دیکھی بس وہیں بچھنے کو بیٹھی — میں کہوں میراثنوں کو کس نے دلوایا —؟"

صحن کے پرلی طرف سے میراثنوں کی ڈھولکی پھر تیز آواز اونچی ہوئی ہے

ہریالا بنا سہرا بنڑی بیاہے

صحن میں شطرنجیوں پر سفید چادریں بچھائی گئی تھیں جو بچیوں، عورتوں اور نوکروں کے آنے جانے روندنے سے میلی ہو گئی تھیں۔ بچے ادھر بھاگ رہے تھے ادھر عورتوں، لڑکیوں کے گروں میں دھما دھم مچی ہوئی تھی — دس دس بارہ بارہ برس کے چھوکرے جن سے کوئی پردہ نہ کرتا تھا۔ گھر سے اندر اندر سے

باہر بکسیاں پھیرے کر رہے تھے۔

"امی اماں — ابا کہتے ہیں پہلے میری اچکن نکال دو — تمہارا سنگار تو وقت لے گا۔"

"اماں اماں سنو تو — ابا جی کے موزے کہاں ہیں — صندوق میں ہیں؟"

"امی جان — ابا جان کہہ رہے ہیں جلدی سے وہ گھنڈی اچکن نکال دو اور اس کے ساتھ والی ٹوپی بھی بھیجو۔"

"ارے خدایا۔ تو دم تو لو ذرا لو — کیا بھاگی جا رہی ہوں!

وہی سوا تماشہ ہو گیا ہے یہ تو۔" امی جان نے جواب دیا۔

"وہ دیکھو میاں — سامنے ہی تو صندوق کھلا ہے — وہیں سے کھول کر دیکھو ذرا آپ ہی رکھ جائیں گے موزے جوتے۔"

"ارے لو اور سنو — میرا سنگار وقت لے لے گا۔ اور تم جو صبح سے اپنی داڑھی مونچھ ہی کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟"

نعیمن مشتری تھی انہیں نے بھاگی حمام کر — گندی یا لی نہانے میں جا لیا۔

"اری۔ اتنی ساری تو لڑکیاں ہیں، وہ تو کہہ کر اتنی سی مشتری اٹھائے بھاگ رہی ہے — چل جا بیٹھا میں انہیں لے آؤں۔"

نعیمن نے دیکھا تو بیچ بیچ حمام پر بھیڑ ہو رہی تھی۔ مانجھے کے پہلے جوڑے ابھی تک سبھی لڑکیاں اپنوں کے جسموں پر تھے — بیبی دھوم مچی تھی پیار دل بیٹھے تھے۔ پھر دلہا میاں کو بھی دو بیچ چوکی پہ بٹھایا گیا۔ ادھر ادھر

سے چار بہنیں سر پہ چھت گیری کا پلہ پکڑے کھڑی ہو گئیں — پانچ سہاگنوں نے مل کر پیلے تو سر پہ دودھ چھڑکوایا — پھر تھوڑی تھوڑی کر صندل لگا کر ابٹن ملنا شروع کیا — بس لڑکیاں ہی تاک میں تھیں۔ ادھر ابٹن کی تھالی کو ہاتھ لگا اور ادھر دھوم مچ گئی — کسی کا ناک، کسی کا منہ، کسی کے ہاتھ تو کسی کے پاؤں — لڑکے لڑکیاں، بیاہے بن بیاہے بس آپس میں گتھ گئے — ابٹن، مہندی، صندل، جو جس کے ہاتھ پڑا بس ایک دوسرے کے منہ پر ملا جانے لگا۔

خورشید بیگم نے حد کر دی — اتنا سارا صندل لے کے اماں بی کے منہ پر مل دیا۔ سارے دالان میں ہنسی کی دھوم ہو گئی —

"ارری بے شرم میں کیوں؟ مجھے بنانے میں کون سا مزہ ہے؟"

"اے واہ — مزہ نہیں تو اور کیا — اب ذرا سا اور جوان دیکھو بس کتنے تم سے عاشق ہو جائیں گے — بھلا دیکھو تو سہی پیلی پیلی ہلدی، صندل سے منہ کیسے نکھر آیا ہے؟"

اماں بی اور خورشید بیگم کا رشتہ تو ممانی بھانجی کا لگتا تھا مگر عمروں میں زیادہ فرق نہ تھا اور خورشید بیگم تھیں منہ پھٹ اور دل لگی باز — اماں بی چپ کر رہیں —

"ہاں ہاں — اب یہی تو عاشق ہونے کے دن ہیں — تبھی نہیں سنتی پوتے نواسے سامنے کھیلتے ہیں اور صبح ہوئی نہیں کہ چلیں غسل خانے کو۔"

خورشید بیگم دوہری ہو گئیں — ہنسی سے منہ تپ رہا تھا۔ لال کی لالی بھی بکھر گئی — بات نبھانے کو بولیں —

"اور کیا تمہارے پیچھے گندے جانور نہیں پھرتے — روز نہانا صحت کیلئے فائدہ مند ہے نا!"

"روز نہانا فائدہ مند ہے کہ . . . . . ."

انھوں نے جھٹ اماں بی کا منہ دبا دیا ——

"کچھ تو لحاظ ہو —— کوئی حد ہے نا!"

مگر تب ہی کیچڑ میں پتھر پھینک کر چھینٹے اڑانے میں تو مزا عوض تھی۔ وہ بیچاری منگیتر کی گت بن گئی تھی — کئی ایک ایسی ہی تھیں کہ جن کی منگنیاں طے ہوئی تھیں — ان کے منگیتر وغیرہ بھی ان کا دوپٹہ بھی نہ دیکھا تھا — کی جھلک تو دور رہی۔ اب جو ہمیں پتا ہی تھی کہ کالون ہونے والے تھے۔ پتے بوٹے چھپا کر دیے کہ تو تی چڑیاں اب کہاں ہیں — چڑیاں ان بڑوں کی نظریں بچائیں اور جھٹ سے لڑکیوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ جیسے چھپے چھپے پکڑ رہا ہے ملبوس — ہری ہری چوڑیاں ہاتھوں میں مہندی اور چاندی کے چھلے —— انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور جھٹ سے ہاتھ ملایا — پیچھے سے دونوں بازو پیچھے کر کے دوالی کے گلے پڑ گئیں — دیکھتی ہے لڑکو میاں گرم گرم سانسیں تیجتی ہے میں گھسا کر لیا۔

"ہٹے بھئی — بڑے بے شرم ہیں!"

"ارے اٹھنے دو ہیں بھئی۔ بے شرم کا ہے سے ہونے لگے!"

"ہمیں نہیں لگتا ایسا اچھی صندل!"

ASSTT. LIBRARIAN

"اچھا اچھا ابھی سمجھ لیں گے تی"

رو کے لڑکیاں؟ پیسے مل گئے تھے جیسے کھچڑی پکانے میں مسور کی دال چاول ——

انہوں نے کان کے قریب منہ لا کر اندر دبا کر کہا — ہنگام کے بعد دیکھ لینا بیٹے

ہنگام کے بعد ان کی شادی پڑی تھی —

عابد میاں — موم کی اک لڑکیوں سے خوش بائیں۔ سب کو کسی الجیل نے ٹوک دیا۔

"ارے جا — ذرا خبر تھے آ سیاں کی"

یہ وصیت ہے ان کے پاس جا پڑی — پیلا جھمٹا ان کے بھی پیلا کرتا پہنے تھا۔ رنگت ایسی کہ شراب اور میدہ شرمائیں۔ وہ پیلا پیلا جھمٹا — لال لال ہاتھ۔ پٹا جھپکانا پڑے — کہ کیسی شرم ان کا یا لحاظ ——

عابد میاں نے خوب خوب ان کے اچھّن لے دیا — سانسوں، سانس — آپی گھبرائی، جھینپی جھینپی، جھپٹ سے سہیلیوں کے جھرمٹ میں آن ملی۔

رضو سے چپکا نہ رہ گیا — ہنس کر بولی —

اکھیاں بولیں من کی بات
گجرا جھمکا
آنچل ڈھلکا
سانسیں بولیں من کی بات۔

سعیدہ نے گھبرا کر دیکھا۔ گوری اماں نے جھٹ کہہ دیا —

"اب تو ہو گئی ناں ہم سے ملاقات — کیا پا لیا ہے؟"

"ہم نے کیا دیا اور کیا لیا —" پھر وہی بے تکلف ہنسی سے دہری ہو گئیں اور سعیدہ کٹ کٹ مری —

"اچھا یہ بات نا ہے؟" سعیدہ کے بھائی نے گوری اماں کی بات پکڑ لی تھی۔ وہ جھٹ سے اپنی بھابی کو ستانے، بھائی کا ہاتھ پکڑ کر لائی —

"لو بھائی میاں — چودھویں کا چاند جھم جھما رہا ہے — اب بھر لو اسے اپنے دل میں —"

گوری اماں کی آنکھیں اٹھیں، اور جھکیں تو بس جھکی ہی رہ گئیں — ایک جھلک میں اس نے دیکھ لیا تھا — بڑی جامہ دانی کی اچکن — چوڑی دار پاجامہ اور زری کے اونچے سے صافے میں، وہ تو کوئی سجیلا شہزادہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ بدن کا سارا لہو جیسے دو نینوں میں سمٹ کر رہ گیا —

سعیدہ نے اسے دھکا دیا —

"اب جاتی کیوں نہیں سیّاں کے پاس؟"

انیس میاں لڑکیوں کے پورے غول کو بے تاب نگاہوں سے گھورے جا رہے تھے — مسکراتے ہوئے —

"ارے بھئی — انہیں تو غول کے غول اور بیاہ کے گھڑے کی چاہت ہو گی — بھلا یہ خیال اچھا ہی آپ نے ڈالی ہی وہ شے؟"

گوری اماں کا جی چاہا — جھٹ سے قدموں میں جا گرے —

• ایسے شہزادوں کے شہزادے ہوں تو ساری دولت ساری دنیا نچھاور ہے ۔۔۔ میں تو یونہی چلی آئی تھی ۔۔۔ " اس نے نظر بچا کر سعیدہ کو بے بسی سے دیکھا جس نے ..... بے حیائی سے آنکھ لڑا لیا تھا ۔۔۔ سعیدہ چپکے سے بولی۔

اکھیاں برلیں سن کی بات!

گوری ماں نے جھٹ سے شیخ جی کے سینے کی اوٹ میں اپنا منہ کر لیا اور ادھر زمیں بیچارے دم چھوڑ بیٹھے ۔۔۔

ادھر شادی شدہ جوڑے تھے کہ کمرہ مچاتے ہیں کنواروں کو بھی مات دے رہے تھے ۔۔۔ ننگے ننگے مذاق ۔۔۔ بے ہودہ فقرے ۔ ساری لعنتیں ان کے پاس جمع ہو گئی تھیں ۔ بار بار اماں بی کو کہنا پڑتا ۔۔۔

• اے کمبختو ۔۔۔ کچھ کرے کچھ کریں کا تو خیال کرو کچھ سے دالان کو کس کا خیال کرنے چلا تھا ۔۔۔

• پانچ بجے تک گاڑیاں لگ جائیں گی " مردانے صحن کی طرف سے کوئی پردے کے قریب آ کر چلا کر بولا ۔۔۔ اور پورے زنانے میں ہڑبونگ مچ گئی ۔۔۔

• ارے سنتے ہو کتنا وقت ہو گیا ہے ۔۔۔ " وہ تین گھنٹے ہی تو باقی رہ گئے ہیں ۔۔۔ "

• اے اللہ اتنی جلدی کیسے تیاری ہو گی ۔ ہم نے تو ابھی منہ بھی نہیں دھویا ہے ۔۔۔ "

• میں نے تو ابھی چوٹیاں گوندھے ۔۔۔ کمبخت اتنے لانبے الجھے گئے ہیں کہ دو گھنٹے تو اسی میں ..... ٹوٹ جائیں گے "

"ہائے بی — میرے کورے دوپٹے میں ابھی پوری گوٹ بھی نہیں ہے۔ میں کیا اوڑھوں گی — ؟"

مغلانی بی کا، ناک کی ڈنڈی میں دم تھا۔ کپڑوں کا ڈھیر ان کے آگے بازو لگا ہوا تھا —

"یہ دیکھنا میری کرتی پر اگلی ٹانکا لگانا ہے۔"

"ابی تم نے صبح سے کیا ہی کیا ہے؟ کرتے کے ساتھ کا یہ لنگا رہ گیا ہے۔ بکیاں نہیں لگیں، کیا بے ڈھب لگے گا، تجھ جیسے کیا جانے پر سادہ لنگا اوڑھ لیا ہے؟"

"یہ الماس اور یہ بہو یہ آٹھ ساٹھ لگانا ہے بی — تم نے سانپ گنا تھا ابھی — مجھ اتنی سستی کہے گی ہے — جلدی کا کرو، جلدی۔"

حویلی میں بڑے سرکار کی دیا سے کبھی کبھار مداری بھی آ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ کے سانپ بے بھی جیسے مردے۔ دانت وہ پہلے ہی نکال لاتا۔ مداری کا ہاتھ ساٹھی میں تیز چلتا تھا۔ بچہ کی کھڑے دوپٹے پر ٹکتے سر ہلاتے جو ٹانکا جاتی پاس تک نہ جھلکتی — ابی نے بات بتائی تھی کہ میں نے بی بی باشت سے گنا تھا، بی سے ہیرے تیرے ہاتھوں گی۔

اب جب کبھی مداری آتا کبھی تماشہ ہوتا ایک طرف۔ بڑے کا آنے میں دم آ جاتا —

"ارے میاں ذرا سانپ چھوڑتا ہم اسے گنیں گے۔"

"جی حضرت — تماشہ ختم ہو گیا تا — پہلے سانپ ادھر دو۔"

بی بی کا کام تھا اگر کبھی گر ہی دو لگا لیں کہ جو لی کی آ سبھی میں نہ ہو

تو کھرر لگاتے لگاتے ، ادھر کا رنگ اُدھر گھل جاتا ___ مگر مغلانی بی اس غضب کی ہوتی کہ بڑے بڑے بیروں والے بھی ان سے پچھاڑ پچھاڑ کر رکھتے ۔ مایکے کا نام روشن تک اُچھال دیتیں ۔

حویلی میں بیسیوں پیروں کی بھی ترغیب کی ہوتی ۔ جب دیکھو تب مغلانی بی پیر کر بیٹھی ہیں ۔ سامنے لال پیلے ، نیلے ہرے کپڑوں کا ڈھیر لگا ہے اور انگلیاں چل رہی ہیں ۔

"آڑو بادام ٹھپیاں لگائی جاتی ہیں ۔"

"یہ گوری بی کا کرتا ہے ۔"

"یہ بڑی بی بی کی چولی ہے ۔"

"یہ اماں بی کا غرارہ دوپٹہ ہے ۔"

"یہ چھوٹی اماں کا گھیردار کرتا ہے ۔"

"رقیہ اماں کی آرسی انگشتری ہے ۔"

اماں بی نے ایک بار جب مداری آیا تو ان سے کہا ___ ذرا ادھر آ ، پھر کے بالیاں سانپ کی کون کون سی ہیں ___ تم بھی سن لو نا ___ کیا پتہ بچے بچی تو بابا پھر تو بھرا ہو جائے ۔

اس دن مداری کا تماشہ تو آیا چولہے بھاڑ میں ___ مغلانی بی کا اپنا تماشہ ہو گیا ___ اب لاکھ لاکھ مداری کرتا ہے ___

اماں بی اس کے سر پیچھے دانت پیس رہی ہیں ۔ آج تو کھائے جا رہی ہیں ___ مگر وہ بیچ کے ناچے جا رہی ہیں ___ مداری تھا زندہ دل ___ اس نے مغلانی بی کو خوب گھیرے

دیکھا تو زور زور سے ڈگڈگی بجا دی اور بولنے لگا —

"ناچ بندریا — ناچ بندریا"

معاً پیر تن تنا گئیں اور لگے ہاتھوں سانپ گن ہی ڈالا۔ مغلانی بی کا ہاتھ تو تیزی سے چل رہا تھا، کیونکہ سر ہی ڈھیر رہ گئے تھے کہ ختم ہونے میں نہ آ رہے تھے۔

"بیبیو — تم اپنے منہ ہاتھ دھو لو — سب جلد بجے مجھ سے اپنی اپنی پنساری لے کر چل جانا —"

گرم مسالوں اور ابٹنوں کی خوشبو پورے گھر میں پھیل گئی۔ لڑکیوں کی ساری شرم ایسے موقعوں پر ہوا ہو جاتی تھی۔ یا تو یہ حال کہ کسی نے کسی کے سامنے دوپٹے کو ذرا سرکنے نہ دیا تھا، اب یہ ہوا کہ ایک ہی حمام میں کھل کھل میں اٹھا گھس بھری ہیں۔ گردن کان ال دھو رہی ہیں تو شرم بھی منہ دھو رہی ہیں۔ کہیں تو گردن مل رہی ہے تو کہیں بازو ملے جاتی ہے — کوئی ہاتھ گھس رہی ہے تو کسی نے جھانواں لے کر پیر کھرچ ڈالے —

مذاق بھی ہو رہے ہیں — چھیڑ چھاڑ بھی جاری ہے —

"قسم اللہ کی گوری ہاں — تمہاری پیٹھ ایسی چمک رہی ہے کہ بس منہ دیکھ لو میں تو بس سوچتی ہوں — ہاں بی تمہارا اللہ ہی حافظ ہے"

"شش — بگلٹ کدھر کی ہے"

زبیدہ بیگم تیس کر گورے گورے ہاتھ بیسن سے رگڑتی بیٹھی تھیں —

"بھئی یہ ہاتھوں کی شامت کیوں آ گئی ہے؟"

"اے واہ — اس شامت کی بھی ایک ہی رہی — میرا کتنا سانولا اجالا کالا ہے"

ہاتھ جھلکیں لے کر نہیں ؟

"زریں کچھ نہ کر سکی! آنکھوں سے بجلیاں گرا رہی ہے آپ۔ حلقے باندھ کر کے گرانے والی ہیں۔"

"ثریا بی بی تمہیں دیکھنے تک کی تاب نہیں۔" پیچھے سے ہنسی کی آواز ابھری۔ جس نے ثریا پر فقرہ کسا تھا، سمجھنے والا سمجھ بھی نہ اور ادھر قہقہے بھی اڑ چلے —

"کیوں میرے بیٹھنے کو کیا ہوا ہے؟" وہ تڑخ کر بولی۔

"ہم کیا کہیں بھئی — بیٹھی تو بالکل بیت سادے طریقے سے ہو لیکن تم بھول رہی ہو کہ تمہارے گلے کے سارے بٹن کھلے ہوئے ہیں اور تم بار بار جھک جھک کر گنگال سے پانی بھرنے رہی ہو — ہائے ہائے مر گئے ہم تو اس انداز پر تمہارے۔"

"ہائے اللہ" ثریا نے اپنے گریبان پر نظر کی اور خود ہی شرم سے لال ہو گئی —

خورشید بیگم نے آ کر غسل خانے کا دروازہ دھب دھبایا۔ "ارے لڑکیو۔ ہنسی مذاق ختم کرو اور باہر نکلو۔ پوری کی پوری بیگمات اندر گھس گئی — وہاں بی جلاد بھی ہیں کہ وقت پر تیار نہ ہوئیں تو گھر کی چوکیداری کرنی پڑے گی۔"

"ہائے اللہ تو کبھی ہمیں عقلمندی پڑتی ہی نہیں کیا؟" گل بانو نے بڑبڑا کر پوچھا۔

حویلی کے غسل خانے بھی کیا تھے — بڑے بڑے ہوا دار جیسے — اور بھر گنگال۔ جھجھولیاں، لگن، سماوار، تسلے — ڈھیر کے ڈھیر رکھے ہوئے اور سب میں پانی بھرا ہوا کہ کسی کو تکلیف نہ ہو پہنچے — مگر ہم سب کی لڑکیاں

گھسی پڑی تھیں اور پیٹ تک نہ چلتا تھا—

- اپنا تو چلتے ہیں بھئی — گوری ماں نے چادر لپیٹتے ہوئے کہا—

- جھوٹ جائے اللہ کرے چادر — شگفتہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ بولی۔

- ارے جا — کدھر کی آنکھ رہی ہے — گوری ماں اور بھی مضبوطی سے چادر سمیٹ کر بولی۔

- اور جو کوئی دیکھتا تو — ثریا نے منہ چڑھا کر کہا۔

- جو کوئی ہوتا تو یہ خود چادر اٹھا کر پھینک دیتی — گل بانو نے بالکل سنجیدگی سے کہا—

- توبہ ہے توبہ — تم نے تو شرم لاج سب بیچ کر کھا لی ہے — شادی کیا کی نہیں ہوئی اور مذاق دیکھو تو کیسے بے ہودہ ہوتے ہیں۔

- اچھا جی — یہ آپ تو سب سے چلی ہیں — بھول گئیں کیا وہ دن جب صادق اخبار والا سکھاتی گھڑی تھیں تو آپ نے کیا کہا تھا— ...

- جھوٹی — بالکل جھوٹی — میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ گوری غضب کی تھی — بیچاری رہ جاتیں۔ تو تم نے کیا سنا ہے؟

دبی دبی اور اونچی اونچی ہنسی کی آوازوں سے غسل خانہ گونجنے لگا۔

گوری ماں نے غسل خانے کی درز سے جھانکا۔

- سامنے کوئی ہے تو نہیں — اس نے نسیمن سے پوچھا جو بھاگے بھاگے بی اماں جی کی تو اندر ہی تھی—

- ارے ارے — اس بے چاری کا حال تو دیکھو — بوڑھے گوری ماں

نے دروازہ کھول دیا اور خوشی سے بے حال ہوتی ہوئی بولی —

"بے چاری کب کی بیٹھی انتظار کر رہی تھی؟ بہت تھک گئی — اماں بی گرم گرم چائے لیے بیٹھی ہوں گی —"

نسرین بھی کم نہ تھی — ہنس کر بولی — کوئی تو ابھی بجے نہیں —

بس عصر میں ہی عصر میں ہیں شے

"برداشت کرو عصر تک —"

دروازہ کھلتے ہی پورا آنگن روشنی کی خوشبو سے بھر گیا — اماں بی نے خاص طور سے جو ... انہیں منگوا دیا تھا — شیر میں انہیں تو روز پچھے — وہ ایک صورت کا کیا رکھنا — ؟ ان کے رنگ روشن کر سنوارے بنانے کی ضرورت بھی کیا تھی مگر اماں بی کا حکم ہی کیا پوچھنا انہیں سے ان کو پیار کر دیا جاتا ... وہ یہ سب کچھ شادی کے کئی دن قبل سے ہو رہا تھا شادی کا وقت آنے سے تک — وہ پچ پچ کر دن ہی شمار رہتے — [illegible] ان کا رنگ کھلتا ہوا سا رہ گیا تھا — جوان جسموں سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہوئے — بال الجھے الجھے انہیں کھول کھول — پنڈلیاں چادروں سے کچھ ڈھکی ہوئی کچھ کھلی بچھی ... سارا دیوان خانہ مہک اٹھا یہ خوشبو عرف الشیں سے مصالحوں کی بو نہ تھی — الگ دھکمسے مہک اٹھ رہی تھی —

"گوری بی — اب تم نے یہ بال کیوں دھو ڈالے — ! جب معلوم ہے کہ لمبے گھنے بال ہیں — اب بیٹھی رہو تم — کھٹے لگ جائیں گے اور گتھیاں نہ سلجھیں گی" خالہ بی نے تنبیہ شروع کر دیا —

"ارے خالہ بی آپ دیکھیے تو سہی — میں دیکھتے دیکھتے تیار ہوئی جاتی ہوں"

مسی، افشاں اور کاجل، سرمے کی ڈبیاں ہاتھوں ہاتھ ہونے لگیں —

آئینوں کے لئے چھینا جھپٹی ہونے لگی —

"توبہ ہے خدایا — ذرا صلاحیت ہو تو — سبھی ایکدم سے سنگھار پر ٹوٹ پڑے — کوئی کپڑے بدلو، کوئی سنگھار کرو، سبھی ایک ساتھ سنگھار کیسے کریں گے بھلا — آئینے کوئی بھی نہ ہوں گے"

"واہ یہ اچھی سنائی — اماں بی نے شہر سے ڈھیر سارے آئینے منگوائے ہیں!"

"تو مردانہ بھی تو کچھ کم نہیں ہے اسے"

کھڑے آڑے ترچھے — کرتیاں اب ٹھیک کرتے کرتے — اور دیگی پیلی جگہ کو ڈھونڈ لیا — زینت دلہن کا مرحلہ پھر بھی باقی ہی تھا —

میراثنیں جو خود بھی تیار ہو رہی تھیں اب کچھ دیر کو ڈھولک لے کر چھت پر جا بیٹھیں۔

زور زور سے تھپ تھپا کر وزیرن میراثن نے گلا پھاڑنا شروع کر دیا —

"سکھی ری کوئی ڈولی جو آئے دوار"

اونچی اونچی آوازیں ہر طرف دھوم دھڑکے سے والہ بھی ہنگامہ سا مچانے لگیں —

اتنے میں کسی نے بیچ میں مچا دی —

"وقت بالکل کم رہ گیا ہے — ڈولیاں آنے ہی والی ہیں"

"تو یہ مسی کی ڈبیا کدھر پھینک دی"

"اے ہے بات ہی کدھر ہے"

اب ہنسی مذاق کی بجائے چیخنا شروع ہو گیا —

پھر دولہا کو دیکھ کر — دوسرے دن کا تازہ ہی سب سے سامنے

کیا دھرا ہے پلنگ کی پٹی پر ۔

"افشاں تو ساری ختم کر دی — توبہ ہے ایسا بھی کیا ساون لگا ہے جیسے اُنہی کو دلہن بننا تھا آج ۔"

بابل کی گلیاں چھوڑنی پڑتی ہے
ہو گی نہ مجھ سے سہار
سکھی ری ڈولی کھڑی ہے دوار

گوری ماں کا ہنستا مسکراتا چہرہ جیسے کھنچ گیا — ثریا نے پیش کر بولی۔

"ثریا — یہ کتنا عجیب گیت ہے — مجھے بڑا رونا آتا ہے ۔"

تیز و تیکھی بھری آواز پھر آئی ۔

سکھی ری ہو گی نہ مجھ سے سہار

"یہ ان کو بھی بہت آتا ہے — بابل کی گلیاں پیاری ضرور لگتی ہیں لیکن چھوڑنی تو پڑتی ہی ہیں — لاکھ کرتی کہ جب کریستیاں آئیں تو سکھی ری مجھے اپنے گھونگھٹ کے پیچھے چھپا لینا ۔ اماں کی آنسو بھری آنکھیں مجھ سے دیکھی نہ جائیں گی — بھیا کی دل خراش دہاڑ کی مجھے سہن نہ ہو گی — بہنوں کی آنسو بھری اور خاموش اکھیاں میں نہ دیکھ پاؤں گی مگر پیا کے نگر جانا کس سے چھوٹا ہے ؟

بڑے بڑے رئیس کر دیا ہیں تو جہیز میں ہیرے دے دیں، جواہر دے دیں وہ بھی تو ایسا نہیں کر سکتے کہ ڈولی پھیر دیں ۔"

خورشید بیگم یہ سب کچھ ایسے انداز میں کہہ رہی تھیں کہ لڑکیوں کے دل کٹے جا رہے تھے —

" اور ہوتا یہ ہے کہ جس دُلہن میں میٹھے آنسو ٹپکتے ہیں۔ دل کانپتا ہے
رہی اتنی عزیز ہو جاتی ہے کہ . . . ان کی رچی آنکھیں جھپکنے لگیں تو مسکرا
کر بولیں ——

" نادان لڑکیو —— آج تو خوشی کا دن ہے کہ ہمارے گھر دلہن آ رہی
ہے —— آج تو ہنسنے کا دن ہے نہ کہ رونے کا —— ؟"

ادھر گیت کے ختم ہوتے ہی دوسرا شعر لہرا رہا تھا ——

گھوڑے پہ سوار میرا بنڑا چلا ——

پانچ بجے ہیں آدھ پون گھنٹہ رہا ہو گا کہ نوکروں نے اطلاع دی۔
" بڑے دروازے سے گاڑیاں لگنی شروع ہو گئی ہیں "

اماں بی نے آج وہ ساج سجائے تھے کہ جانے کب کی بھی جھگ
جھگ کرتے جو ڈبے چھپوا دیئے —— گاڑیوں کی لائن جو شروع ہوئی تو حویلی
سے لے کر باغ والی کچہری تک ختم ہونے میں ہی نہ آئی —— اور حویلی سے
کچہری کا فاصلہ دو میل سے بھی زیادہ کرتا تھا —— یہ تو یہاں پتھر ہیرے
کے ہیروں کی طرح ٹپکتا تھا۔ اس کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی —— دس کی جگہ سو
اٹھائے جاتے۔ سو کی جگہ ہزار —— اور پھر اماں بی کا ہاتھ کہ پیسے کو کبھی ہاتھ
کے میل سے بڑھ کر اہمیت نہ دی۔

سو، گھوڑے گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں —— سفید سفید نسل
کی —— ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی تھیں —— سفید سفید، اونچی اونچی ٹانگیں۔
مضبوط کھر —— سب کی پیٹھوں پر سنہرے جھولے —— تیجے اور

گھوڑے سجے جگمگاتے — گلے میں گھنگھرو — پاؤں میں گھنگھرو۔ کمھیاں ملاتے میں نفر نفر سے ٹھمریاں بلاتے تو چھن چھن جھنکار ہو جاتی — یوں لگے رنڈی ناچ رہی ہو — گاڑیوں کی چھتوں پر سرخ چھت گیرے — ان میں ریشمی سفید پھندنے لٹکتے ہوئے —

دولہا میاں کی گاڑی کا رنگ سب سے الگ تھا۔ گاڑی کا چپہ تو تھی گھنگرو والی ارغنی سی لگی تھی — یہ ارغنی کی ارغنی — وہ رتھ اور سفید لمبے لمبے جھنڈے آگے پر چاندی کے گھنگرو تھے۔ وہ بھی اپنی جگہ دولہے ہی نظر آتے تھے۔

اماں بی کا تو کہنا تھا کہ دولہا ہاتھی پر سوار جائے مگر کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ — حویلی پر جو ہاتھی جھومتا تھا وہ کالے رنگ کا تھا — یہ بھلا کب خوبصورت — آغا میاں کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو کالے ہاتھی پر نہ چڑھائیں گے سیاہ رنگ بد ہوتا ہے —

اماں بی نے کہا بھی کہ "اتنا ہی ارمان ہے تو سفید ہاتھی کیوں نہ خرید لو" کریم بخش اور خود اماں بی کے چھوٹے بھائی صمدو میاں شہر شہر پھرے مگر سفید ہاتھی نہ ملا — چڑیا گھر میں تھا ضرور مگر وہ نہ مل سکا — غرض بات بگھی پر ہی پڑی — بگھی بھی مگر اپنے نام کی تھی۔ اماں بی کے ہاتھوں کا سارا کام تھا بھلا کیا کمی رہ سکتی تھی —؟

دھوم دھام اتار کر دیواروں سے لگ گئیں تب کہیں جا کر ساری بیبیوں کا سجنا سنگھار ختم ہوا — دلہن تو اپنی جگہ رہی ہر لڑکی دلہن کا بدل معلوم ہو رہی تھی — گھنگھروں کی جھر جھر جگمگاہٹ — کپڑوں کی چھماہٹ۔ اور پھر

سنگار۔ آنکھوں کے نیچے افشاں چمکتی ہوئی — چوٹیوں پر ستارے سے جگمگاتے ہوئے — سیدھی مانگوں میں دو رنگ چمکدار ذرے بکھرے ہوئے کہ اندھیری راتوں میں جیسے جگنو اڑے جاتے ہوں — ہونٹوں پر مسّی کی وہ اودی اودی دھڑی — اجلے اجلے دانت کہ لگتا تھا۔ مخمل کی ڈبیوں میں جوہری نے جیسے موتی سجا دئے ہوں — اور جو کنواریاں تھیں انہوں نے پان کھا کھا کر اپنے ہونٹ انگاروں کی طرح دہکا لئے تھے —

اماں بی دانتوں پر منجن گھستی ہوئی جلدی سے حمام کو لپکیں تو خورشید بیگم نے جالیا —

"ارے واہ یہ اچھی زیادتی ہے کہ ہم لوگوں کو تو ڈانٹ ڈپٹ کر تیار کروا دیا اور خود لیکنی پھر رہی ہیں — یہ کوئی دانت گھسنے کا وقت ہے"؟

"ارے نیک بخت — مسّی ڈھنگ سے نہیں جمتی جب تک کہ دانت نہ مانجھ لئے جائیں"

"تو یوں کہئے نا کہ آج آپ اپنی بھی سہاگ رات منا رہی ہیں"

"ارے بے شرم۔ ارے بے شرم — تیری زبان تو دیکھو کہ بڑھتی ہی جاتی ہے —"

"اور کیا — میں نے آپ کا جوڑا اچھی طرح دیکھ لیا ہے سفید جالی کا ٹھپے لگا دوپٹہ — جالی کی سنہری کرتی، چمچماتا اطلس کی ہلکی صندلی چولی اور کمخواب کا چمکیلا صندلیں پاجامہ — یہ سب سامان جان کر لوٹنے کے سامان ہیں کہ نہیں —"؟

بہت ساری نگاہیں ادھر ہی مرکوز ہونے لگیں تو خورشید بیگم آپ ہی آپ گڑ بڑا گئیں ۔۔۔ اماں بی مسکراتی ہوئی اپنے کمرے میں گھس گئی تھیں ۔۔۔

اخلاق میاں بڑے ۔۔۔ کے پاس اپنی بیوی کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے تھے ۔ خورشید بیگم کو اس سے اچھا موقع اور کب ملتا ۔۔۔ وہ اپنے بیٹھے ہوئے بولیں ۔۔۔

" آپ کو اس سے اچھا اور کوئی وقت نہ مل سکتا تھا ۔۔۔ ؟ "

نسبت بیگم نے منہ پھیر کر دیکھا اور حیرانگی سے بولیں ۔۔۔

" کیا ہوا ہے ۔۔۔ ؟ "

" منہ کیوں کھلواتی ہو ۔۔۔ تمہارا لڑکا روز کچھ نہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے ، اب اخلاق بھائی کے منہ پر طمانچہ لگا رہی ہے ۔۔۔ اللہ ان کے تو پیر زمین پر نہیں لگ رہے تھے ۔۔۔ ؟ "

اخلاق میاں حد درجہ سمجھدار آدمی تھے ۔۔۔ نرمی سے بولے ۔

" اور کیا ایسے موقع بار بار آتے ہیں ۔۔۔ مردانے میں آدھے ہی ہیں بھائی ۔۔۔ سمجھیں کیا بات ہے ؟ "

خورشید بیگم پھر کھلا کر ہنسیں اور کھڑی ہو گئیں ۔۔۔

اماں بی تیار ہو کر نکلیں تو سوار ہونے کے لئے دھوم مچنے لگی ۔ گاڑیاں پچاس سے بڑھ کر تھیں ۔ ہر گاڑی میں چار چار ، پانچ پانچ آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا ۔ ایسے معاشرے میں وہ دولہا بننے لگی کر باقاعدہ بیٹے بیٹھے کا منظر کھنچ گیا ۔ بڑے ماموں اور بڑے سرکار نے مل کر یہ طے کیا تھا کہ آگے آگے مرد ۔۔۔

سے ان کی گاڑیاں بھری ہوں گی۔ اس کے بعد وہ بیٹے کی گھٹی اور پھر عورتوں کی
ڈومنیاں ۔۔۔ اور وہ باجے والے باجے بجاتے اور آتش بازی۔ بتاشے اور
پھول جھڑیاں چھوڑتے جائیں گے ۔۔۔ مگر میں سوچتی ہوں اگر کچھ۔ سو جو رہا تھا
تھرے لڑکے ہاتھ پکڑ پکڑ کر نالاؤں [illegible] پھر کچھوں اور ماہیوں کے
آنسوں ڈکیوں کر کھینچ رہے تھے ۔۔۔ ادھر لڑکی کے ہاں میں بات طے ہوگئی تھی
کہ ہیں ایسے موقعوں پر بھی اگر الگ بیٹھے تو مزہ ہی کیا ہے ۔۔۔ وہ تو سب سے
دلہن وال مل جائیں ۔۔۔ جیسے مانجھے کے دن گڑبڑ ہوتی تھی۔
ادھر سے یہ ہوں یہاں چلے گئے ۔۔۔ ادھر سے بڑے سرکار ۔۔۔ کسی کی کیا
سننا تھا۔ اماں بی نے چڑ کر بڑے سرکار سے کہا۔
"ارے تو کیا انتظام بھی تھا کہ نکاح خوانی کا وقت ٹلا جا رہا
ہے ۔۔۔ اور دلہن کی نوبت ہی نہیں آ سکتی"
بڑے سرکار نے نہایت شرمندگی سے کہا ۔۔۔ "ابھی میں کیا کر لیتا
تو سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے پھر رہے ہیں"
اماں بی اور بڑے سرکار کو ایک جگہ دیکھ کر پھر خورشید بیگم کی زبان
میں کھجلی ہونے لگی ۔۔۔ کسی بہانے پاس سے گزر کر دبی آواز سے بولیں۔
"سمان جان ۔۔۔ ابھی نہیں، رات کو ۔۔۔"
اماں بی کے منہ پر ہنسی بکھر گئی ۔۔۔ ہنستے ہنستے بڑے سرکار سے مخاطب
ہو گئیں۔
"ایسے تو کام نہیں نبٹے گا۔ پکار کر کہو دلہن کے جہاں سینگ سمائیں

بیٹھ جائے ـــ یہاں تو یہیں صبح ہو جائے گی "

اس اعلان کا سننا تھا کہ لے دے دے مچ گئی۔ جنسی شور و غل مچا کر بیٹھ گئے ـــ بزرگوں سے منہ چھپا چھپا کر انگلیاں منہ میں دے دے کر سیٹیاں بجانے لگے ـــ گاڑیوں میں ایک ساتھ بیٹھنے کا مزہ یہ تھا کہ گردوں اور جھٹکوں کے جھلے ایک دوسرے پر گر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے دھکے لگتے ہیں۔ اور کسی کے گھٹنے ہیں تو کسی کی پیٹھ اور کسی کی پیٹھ پہ کسی کے گھٹنے ـــ اور کبھی تو غضب ہوتا ہے کہ چوٹیاں آپس میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں ـــ

"کریں کیا بھئی ـــ کمبخت گاڑی کا سفر ہے۔ بیل ہیں کہ ہونٹ سے باتیں کر رہے ہیں ـــ جگہ ہے نہ اتنی کم ـــ جائیں تو کدھر جائیں بارات ہی ختم تھی تو سب سکھیاں بیبیاں اس گاڑی میں ہیں "

کوئی ڈیڑھ گھنٹے دو گھنٹے میں گاڑیاں الٹ پلٹ اور باجے والے نے زور سے نوبت بجائی ـــ اس کے ساتھ ہی زور زور سے شہنائیاں اور ڈھول بجنے لگے منجیرے کھس کھسانے لگے اور تالیاں پٹنے لگیں ـــ پہلی گاڑی آگے بڑھی اور پھر سبھی گاڑیاں حرکت میں آ گئیں ـــ

تدبیر میاں اپنے آپے میں نہ تھے۔ سہرے کی لڑیاں تھیں کہ قدم چومے لے رہی تھیں ـــ بہن نے بڑے ارمان سے سہرا لگایا ـــ لاکھ ادا نا کرتے رہے گر افشاں بھی لگا دی ـــ اپنے ہاتھوں سے اچکن پہنایا تھا ـــ نہلانے دھلانے کی وہ دھوم جو کہ راجے کا دن بھی ماند پڑ گیا ـــ

نانی بی کی تجوری کا منہ کھلا تھا ـــ لڑکیاں بالیاں کچھ بھی چھوڑا

دیتیں تو نیگ مانگنے ہتھیلی پسار دیتیں ـــ اماں بی نے بھی رخصتوں کی طرح
تجوری کا منہ کھلا چھوڑ دیا ـــ ہر رشتہ، چاہے دور کا، جب دولہا میاں کو
اٹھایا گیا تو اماں بی نے کتنے ہی سنہری سکے وار پھینکے ـــ بھائیوں بھابھیوں
اور ماموں نے گود میں اٹھایا اور پلنگ پر لا بٹھایا ـــ اور سجا سنوار دیا تو
ادھر سے بڑے ماموں سہرا لئے آئے ـــ بہن سے بولے۔

"نیگ چھوڑنے والا نہیں ہوں جھلی ماں"

"اے میاں تو کون منہ موڑتا ہے ـــ جتنے میرے مانگنے والے"

"ابھی بولوں گا بتاؤں گا تو بس منہ موڑ لیں گی ـــ ہیرے کا نیگ ہے
ایسا ویسا بھی نہیں ـــ ہر ہر موڑ کے بدلے موتیوں کی لڑی لوں گا اور ہر
جھمکے کا لعل ـــ"

اماں بی ہنسیں ـــ بس اتنا ہی نا ؟

ماموں نے بسم اللہ پڑھ کر پہلے تو دائیں طرف سہرا بکھرایا پھر بائیں طرف۔
پھر بہتر زندگی اور خوشیوں اور ارمانوں بھری زندگی کی دعائیں دیتے ہوئے پیچھے گرہ
لگا دی ـــ

پھر تو کمرے سے بدھیاں اٹھا کر آگے پیچھے پہنائیں ـــ ہاتھوں کے گجرے۔
بازو میں بازوبند اور گلے میں ہار ڈالے کہ منہ چھپ گیا ـــ لباس چھپ
گیا ـــ

نچھاور کے سکوں سے میراثن کی گود بھر گئی ـــ

• ادھر سے گاڑی والے، پیچھے سے اپنے دادا کے چلو سے پیچھے کی

کی آواز آئی اور گاڑیاں دھیمے دھیمے چلنے لگیں۔

ننھاں بی کی گاڑی کے پیچھے والی گاڑی میں مغلانی بی تھیں۔ ان کی نگرانی میں چڑھاوے کے جوڑے بچے تھال رکھے تھے — خود ننھاں بی کی گاڑی میں زیورات کا صندوقچہ تھا۔ اس کے پیچھے والی گاڑی میں بھی خرمے تھے — اس کے پیچھے بادام۔ اس کے پیچھے مصری — کاجو، کشمش، ناریل، گیارہ گاڑیاں تو بری ہی سے لدی تھیں — پھر آگے پیچھے گاڑیوں کا ہجوم تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔

کہاں تو ماموں میاں اور ننھاں بی کا اندازہ تھا کہ گاڑیاں پچیس ہوں گی اور یہاں یہ گت بن گئی کہ محلے ٹولے والوں کی گاڑیاں بھی پوری نہ پڑیں۔

سب سے پیچھے پیچھے گاؤں کے کم ذات لوگ تھے جو شادی کی رونق میں اضافہ کرتے ناچتے گاتے چلے آ رہے تھے۔ رہ رہ کر جس انار چھوٹتے آتش بازی چھوٹتیں اور جنگل کا چپہ بھر جاتی — پھول جھڑیاں اجالا بکھیر دیتیں۔

اب شام کا اندھیرا پڑنا شروع ہو چکا تھا اس لیے گیس بتی والوں نے ہنڈولے روشن کر دیے — گاڑیوں کے آگے بازو دو ہنڈولے۔ ہزاروں کی تعداد جا پہنچی — باجے والے دمادم ڈھول پیٹ رہے تھے۔ گاڑیوں کے اندر شادیاں رچ رہی تھیں۔

دولہن کا گھر قریب آگیا تو جلو میں لگی رونق ہو گئی — سبھوں میں ہل چل سی مچ گئی۔ دور دور تک راستے میں جھنڈیاں، کمانیں اور کاغذ کے بیل پھول سجائے بنائے گئے تھے۔ ننھاں بی کا منہ کھلا دیکھتا ایسے ذوقی اٹھی

جیسے ہی تھی کہ نئے سرے سے جدائی تیکھی پڑ رہی تھی —

دولہن کا گھر آ گیا —

دونوں طرف کے باجے والوں نے مل جل کر شہنائیوں کا شور آسمانوں تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا — گاڑیاں ایک ایک کر کے رک گئیں — یہاں دولہن کے گھر قناتیں لگی ہوئی تھیں — پردے تنے ہوئے تھے مگر کس کا پردہ کہاں کا گھونگھٹ؟ ایسی ایسی دھکم دھکا تھی کہ کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔ سب دولہا کے پیچھے اتر پڑے — مردوں نے تو سنگھار نہیں کیا تھا مگر ان کے منہ تھک کر افشاں سے چمک رہے تھے — مسی کی سیاہی ان کے ہونٹوں تک بھی تو پہنچ گئی تھی — تھکے ماندوں نے وہ ادوانے بیٹھ ہی سہاگ رات منائی —

ڈیرے کے صحن میں سرخ رنگ کی چاندنی بچھی ہوئی تھی — اس کے حاشیوں پر پھولوں کی ننھی برتیاں سجائی گئی تھیں — بیچوں بیچ ایک چاندی کی چوکی تھی — چوکی پر سے ہو کر صحن کو گزرنا تھا — اس کیلئے بیاہ کنواری لڑکیاں جھٹ گھیرا کر کے کھڑی تھیں اور پاس ہی دولہن کی خالہ پھولوں کی چھڑیاں لئے صحن والوں کی تواضع کرنے کھڑی تھیں۔

سب سے پہلے اماں بی آئیں — ان کے منہ کے قریب چھڑا لے جایا گیا — انہوں نے منہ کھولا اور ادھر ہاتھ دور ہو گیا۔ ہنسی کی وہ دھوم کہ حد نہیں —

ابھی بیروں جھٹ سے منہ کھول دیا جیسے کبھی چھڑا ملا ہی نہ ہو گا گناہ کو

اماں بی ہنسنے لگیں —

پھر سے ہاتھ سامنے آیا اور اب کی بار تو اماں بی نے کھلانے والی کی کلائی پکڑ، پورا پنجہ ہاتھ میں لے، انگلیاں منہ میں بھر لیں۔

اس کے بعد دولہے کی خالہ — پھر خورشید بیگم، رانی بیگم، معافی بی، چھوٹی بڑی لڑکیاں بالیاں، سبھی نوازی گئیں۔ پھر بار شربت اور پان کھاتی، خالہ پر دونوں ہیں سارے روپے ڈالتی آگے بڑھتی گئیں — اور جب پرانوں میں اچھی طرح نپٹ لگئی تب کہیں اس وقت حمیدہ خالہ دولہن کے کمرے کے سامنے والے دالان تک پہونچ سکیں۔

مردوں نے بری کے سینی اور تھال باہر ہی باہر اتروا لئے تھے۔ نکاح خوانی شام میں ہونی ٹھہری تھی۔ حویلی کے سارے جوڑوں کی نکاح خوانیاں شام ہی کو ہوئی تھیں — .... خود بڑے سرکار کی نکاح خوانی بھی شام کو ہوئی تھی — سات آٹھ بجے تک نکاح خوانی ہوتی۔ گیارہ بجے جلوہ سے فراغت ہو جاتی اور دولہن سسرال آجاتی۔

باہر باجے والوں کا شور کم ہو گیا تھا کیونکہ نکاح خوانی ہونے والی تھی۔ اندر سے ساری عورتیں چقوں اور پردوں کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں — کوئی کوئی جگہ نہ ہونے کی وجہ سے کرسی کا بھی تھیں کہ دولہے کو دیکھ سکیں۔ اور نکاح خوانی کی ساری کارروائی نظر آسکے — دولہے میاں سہرے تو دولہا میں اور سے حضرت قاضی جی کے بائیں بیٹھے تھے۔ بزرگوار ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ماموں، چچا تایا اور دو چار گھر والے دولہن کی مرضی لینے کو اندر آئے۔ کسی کی

مرضی۔ کہاں ان کی رضامندی — یہاں تو بس آنسو تھے کہ جھر جھر بہے چلے آتے تھے۔
نکاح خوانی پڑھائی گئی اور قبول ہے — قبول ہے۔ قبول ہے کی
آواز کے ساتھ ہی ادھر باجے گاجے والوں نے پھر سے دھن رضا دھن شروع
کر دی اور ادھر دولہن کے گھر سے آہی آہی — سسکیوں کی آواز آنے لگی۔
سولہ سترہ برس جس گھر میں گذارے — جس زمین کے ذرے ذرے سے پیار
کیا — جن آنگنوں اور صحنوں میں جوانی آئی — نکاح کے دو بولوں کے ساتھ
ہی سب کچھ پرایا ہو گیا — ادھر دولہن کی سسکیاں تھیں اور ادھر ان بہنوں
خالہ، پھوپھیوں کی ہچکیاں — اماں بی کے دل میں کھلے خوشی کے پھول
ذرا کی ذرا مرجھائے — انہیں بھی اپنا وقت یاد آگیا — کیسی شام تھی
رو رو کر آنسو نہ تھمتا تھا — ان بہنیں بھی باری باری پاتیں اور آنسو
بہے جاتے — سسکیاں، ہچکیاں پھر تیز تر ہو جاتیں —
آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے پلکے سے غم کے احساس
کے ساتھ پونچھ لیا — آگے بڑھیں اور اپنی نند کو گلے لگا کر بولیں —
"روتی کیوں ہو بی — شاباش ہے تم کو — ابھی کیا دور جاتی ہے۔
لوکی — بھجو کر تو دی ہے نا — میں کیا قیامت گذر گئی ہاں اور کیا ان میں
فرق پڑے گی — "یہ کہہ کر بھاوج والان سے اٹھ کر صحن میں آگئی — یہ دور تھا بھی
کچھ دور کا ہوگی —
تسلی کے دو بول سنتے ہی تو اللہ دی بیگم کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔
اماں بی نے جو کہ اپنی نند کی ڈولی اٹھائی تھی اس لئے مہمانوں کا شور بھی

دو طرفہ ہوا تھا ــــ اب اتنے نزدیک کا رشتہ تھا۔ کوئی کدھر جاتا ــــ؟ سبھی چاہتے تھے کہ دونوں طرف سے شریک رہیں جیسی دولہن ویسا دولہا ــــ

اماں بی نے مصلحت سے سمجھایا ــــ: "ترے بیٹے میں کہوں تمہاری عقل بھی بڑھی ہو گی ــــ" یہ میاں کو طعنہ تھا ــــ ادھر آئے ادھر ہی چلے گئے۔ "آنکھیں پلکیں جدا جدا ہیں ــــ پر آخر کو بھی ایک ہی جگہ جمع ہوتا ہے"

اب چھدا خانزادہ انوری بیگم کے ہاں جمع تھا ــــ وہ بڑے ہونگے اور وہ چہل پہل کہ ادائیں سے بچے چھوٹ گئے۔ نوکروں، نوکرانیوں کی گودوں سے ننھے ننھے لڑکے لڑکیاں تک گھر گئے ــــ

سوا اکبر پہ مہر بندھا ــــ بری کا سامان لٹایا جانے لگا۔ اور باہر لڑکوں میں اودھم مچ گیا ــــ سر پر کلچے جانے لگے اور بری لوٹی جانے لگی ــــ

باہر آدمی سندیسہ لے کر آیا ــــ

"بڑے سرکار کہتے ہیں کہ اب آپ ہی مصحف میں جلدی کر دیں تو اچھا ہے نہیں تو رات کے دو تو یہیں بج جائیں گے"

ادھر انوری بیگم نے کہلا بھیجا ــــ "دولہا بھائی میاں، ابھی سناؤ۔ تو کیا باتیں کر کھانا پینا بھی نہ ہو گا۔ اب شادی منگنی میں باجا ہی نہ ہو تو اور کن کاموں میں ہوتے ؟"

ہر گھر میں ایک نہ ایک حضرت رنڈی کے ناچ کے دلدادہ ہوتے ہیں ــــ اشرف میاں ہر اس شادی میں جہاں رنڈی کا مجرا ہوتا ہے ــــ بن بلائے پہنچ جاتے۔ رنڈی کے ناچ کی بات تو اور ہی ہے۔ بہتوں کو اس کا شوق ہوتا ہے کہ اوسے

تو بچھڑے بھی نہ چھوٹے ۔۔۔ گلی میں آئے دن لونڈوں کا شور مچتا اور ناچ ہوتا کوئی ایک آدھ ڈول، ناچتی گاتی، بھاؤ بتاتی تھرکتی آتی ۔۔۔ ان کے ہاتھ کا فالـ چھوٹ جاتا ۔۔۔ ہر ہر ادا پر لوٹے جاتے اور جیب خالی کرا کے گھر لوٹتے۔

بڑے سرکار کے دو بھتیجوں کے بھتیجے لگتے تھے ۔۔۔ شادی جیسی شادی رچی تھی انہوں نے منہ بولا باہر گیا؟ آنا بائی ناچنے والی تھیں ۔۔۔ برات کے ساتھ وہ کہاں تھے، شہر سے رنڈی لانے گئے تھے ۔۔۔ پانچ سو روپے رات پر اس نے آنا قبول کیا ۔۔۔ سازندوں اور استادجی کا نذرانہ الگ ۔۔۔

ادھر کھانا ختم ہوا نہیں کہ ادھر محفل رنگ پر آگئی ۔۔۔ کار چوب کے شامیانے والی مسند پر مخملیں تکیے سے لگی ادا اس انداز سے بیٹھی تھی۔ گھنگھروؤں کی چھال چھم چھم ریاں جیسا انداز نہ تھا ۔۔۔ بڑی تمکنت اور بھاری بھرکم پن سے بیٹھی تھی جیسے کوئی رانی ہو۔

کسی نے غزل کی فرمائش کی، کسی نے رات جگائی کی ۔۔۔ کسی نے گیت کی، کسی نے ٹھمری کی، کسی نے محض ڈھولک کے گیت کی۔ منچلے بازوں کا مجمع تھا ۔۔۔ اس نے مذاق کا انداز لگایا اور شروع کیا ۔۔۔

جینے کی رات آگئی مرنے کی رات آگئی
تاروں کی میٹھی گرد میں مرنے کی رات آگئی

مرنے کی رات آگئی ۔۔۔ اس ادا سے، جسم کو چرا چرا کر، بل کھا کر، لہروں کے لئے مرنے کی رات آگئی ۔۔۔ اشرف میاں کو یہ بھاؤ تاؤ پسند آیا۔ اور بار بار گوایا اور ہر بار دس دس پانچ پھینک دیتے ۔۔۔

ادھر زنانے میں جلوے کی دھوم ہو رہی تھی — جہیز کا بڑا جھم
گھٹ دس بارہ عورتوں نے مل کر صحن میں نکالا اور اندر سے دولہن کو سنوارا
جانے لگا۔ دولہے کے ہاں کا بھاری سرخ کار چوبی جوڑا — وزنی زیور
اور پھولوں کا گہنا پاتا —

رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ دولہے میاں کو اندر سے بلاوا آگیا۔ باہر
یہ بھی رنگ جما رہا اور اندر آرسی مصحف کے لیے عورتوں کی بھیڑ ہونے لگی۔

دولہے کے قدم رکھتے ہی سالیوں نے شربت پلایا، پان الائچی کھلائی —
دولہن کے چھوٹے ماموں نے اندر سے دولہن کو گود میں اٹھایا اور باہر لائے۔
آمنے سامنے منہ کر کے دولہن دولہا کو بٹھایا گیا — یہ وقت ماں
بہنوں پر کیسا کٹھن گذر رہا تھا کہ اس کاروائی کے بعد سدا کے لیے بہن بیٹی
سے ساتھ چھوٹنے والا تھا —

پانچ سہاگنوں نے گھونگھٹ میں منہ ڈالا اور پھر خورشید بیگم نے دولہا کو
دلہن کا منہ بتایا۔

"بولو چاند ہے کہ نہیں؟"

تدبیر میاں مسکرا کر رہ گئے — واقعی چاند جیسا مکھڑا تھا کہ گوٹے
والوں کی جوت سے گھونگھٹ میں اجالا سا پھیل رہا تھا۔

گاڑی والوں کو کھانا کھلا دیا گیا تھا اور وہ بھی جوتوں کے پاس بیٹھے اپنی
دھوتیاں سنبھالتے، منہ سے رال ٹپکاتے، رنڈی کا ناچ دیکھ دیکھ کر محظوظ
ہو رہے تھے۔

ادھر جہیز نکلنا شروع ہوا اور ادھر بیل گاڑیوں سے جوتے جانے لگے۔
جہیز بھی کیا تھا کہ بس دنیا بھر کی سمیٹ کر دے دی تھی۔ بس چاند تارے ہی
رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی یوں کہ یہیں کی بات نہ تھے ورنہ یہ کمی بھی پوری ہو گئی
ہوتی ۔۔۔ یہ نہ انوری بیگم رہیں نہ تھیں اور پھر اپنے بھائی کے مقابلے تو یوں
بھی کر رہی تھیں کہ خیر بڑی جگہ بیٹی دی تو سسرالیوں میں چاہت نہ رہے گا ان
جایا بھائی کی بیوی نہ ہو ۔۔۔ ایک تو اونچی گھٹنی ہی پڑتی ہے ۔

دلہن کے باپ، حسیم بیگ، چھٹے چھٹے جاتے تھے ۔ وہ دل کہاں سے
لاتے کہ جس بیٹی کو آنکھوں کی پتلی بنا کے رکھا ۔۔۔ جس کو سدا آنکھ کی جوت سے
جانا، اسے ہی پٹے دل سے، اپنی آنکھوں سے، اپنے سے جدا کر دیں۔ ان کی
داڑھی بھیگی کر آنسوؤں سے بھیگی جاتی اور وہ آنسوؤں کو روکنے کی ناکام
کوشش کئے جاتے ۔

اماں نے چلو منہ میں رکھ لیا ۔۔۔ انہوں نے آنسوؤں کو روکنے کی
کوئی ضرورت ہی نہ سمجھی اور بلک بلک کر رونے لگیں۔ سارے بھیتر
گونج کر رہ گئے ۔۔۔ بھائی میاں دنیا دل چھوڑا نہ کیجئے ۔۔۔ دولہن کا ہاتھ
تو دے دیجئے دولہا کے ہاتھ میں ۔

بڑے صبا کے ساتھ دل کو سنبھالے حسیم میاں آگئے ۔۔۔ آواز تھی کہ
کانپے جاتی ۔۔۔ بیٹی کا نازک سا حنائی ہاتھ پکڑ اور داماد کے ہاتھ میں دے
دیتے ہوئے ۔۔۔

میں نے خوشی خوشی لے جاتے ہو ایسے ہی تمام عمر ساتھ نبھانا میاں ۔

ہم نے تو اپنی آنکھوں کا نور سمجھا، تم بھی یہی سمجھنا ۔

پھر بیٹی کی پیشانی چوم کر بولے ۔

"بیٹیا ۔ خدا نہ کرے کوئی مصیبت پڑے، یا کٹھن وقت آئے تو کبھی ہمت نہ چھوڑنا ——— اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا اور جیسے ڈولی چڑھ رہی ہو ایسے ہی ڈولے میں سوار ہو کر اس گھر سے نکلنا ——— اب تو یہی تمہارا گھر ہے"

ادھر میراثنوں نے بابل چھیڑ دیا تھا ——

ہم تو رے بابل کھونٹے کی گئیاں ہانکو جدھر ہنکا جائے رے
ہم تو رے بابل کھیتوں کی چڑیاں رات رہی اڑ جائیں رے
جتنا کر دیئے محلے دو محلے ہم کو دیا پردیس رے
سن بابل مورے

• کلیجے کٹ کٹ کر آنکھوں کے راستے گرنے لگے ——— اور شادی کا گھر جیسے موت کا گھر بن گیا ——

ماموں میاں نے بڑھ کر دولہا سے کہا ۔ میاں دلہن کو گود میں اٹھاؤ اور گاڑی میں بٹھا دو ۔

"گود میں ؟" قدیر میاں ہنس کر بولے ۔

"اور کیا میاں ——— زندگی بھر کا بوجھ اٹھانے کی ہمت ہے تو کیا ذرا سی ہلکی پھلکی دلہن نہیں اٹھا سکتے ؟"

ایک ایک سے لپٹ لپٹ کر وہ روتی رہی ——— اور ماں کا جی آنسوؤں کے ساتھ ساتھ بیٹھا رہا ۔

بسم اللہ پڑھ کر، دولہا میاں نے دولہن کو اٹھایا اور پھول جیسی ہلکی گٹھری کو بگھی میں لے جا کر بٹھا دیا۔۔۔ دولہن کے بڑے بھائی آئے بگھی پر سے صدقہ اتار کر لٹا دیا اور بگھی کی پاٹ سے منہ مل مل رونے لگے۔

ڈھول تا شے ڈھما ڈھم پٹنے لگے اور گاڑیاں حرکت میں آنے لگیں۔

جن گلیوں میں بچپن بیتا کھولی آنکھ جوانی نے
ان گلیوں سے منہ پھیرا ہے سکھیوں کی پٹ رانی نے
جیا منہ کر مل رو میں چھوڑ چلی ماں جائی رے
ہائے کیسی رات یہ آئی ۔۔۔

زکیہ کے کانوں میں دور تک آواز آتی رہی اور اس کا جسم ننھی ننھی سسکیوں اور ہچکیوں سے کانپتا ہلتا رہا۔۔۔

اماں بی نے اپنی گاڑی سب سے آگے رکھوائی۔ گھر میں اترتے ہی۔ انھوں نے سب نوکروں کو جمع کر کے، دالان میں پھول بچھوائے، مسند اور تکیہ لگوایا۔۔۔ دولہن کی منہ دکھائی ہونے والی تھی ۔۔۔

دولہن نے گھر میں قدم رکھا اور مبارکبادیاں بکھر گئیں۔ رات کے ڈھائی ہو رہے تھے۔ اماں بی نے کہا ۔۔۔

"بھئی جلدی جلدی اگر منہ دیکھو ۔۔۔ کیا پہلی رات ابھی ہنگاموں میں ہی گزر جاتی ہے "

دولہن کے سامنے روپیوں، اشرفیوں اور ہلکے پھلکے زیوروں کی چھوٹی سی ڈھیر لگ گئی ۔۔۔

سب سے آخر میں اماں بی آئیں ـــ دولہن کا گھونگھٹ ہٹایا۔ چٹ چٹ بلائیں لیں ـــ پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور مخمل کی ڈبیا میں سے نتھ نکالتی ہوئی بولیں ـــ

"بٹیا ہمارے اس سدا سہاگ کی نشانی نتھ چڑھی ہے ـــ اور اس کی حفاظت تمہارا بھی فرض ہے ـــ میں تمہاری ناک میں بھرپور دعاؤں کے ساتھ یہ نتھ پہنا رہی ہوں کہ خدا وہ وقت نہ لائے کہ تمہارا سہاگ خطرے میں پڑے ـــ بٹیا! کسی حالت میں اس چڑھاوے کو اپنے سے الگ نہ کرنا۔ یہی تمہارا سہاگ ہے ـــ" اور اماں بی نے دو ڈھائی تولے کی موٹی سی نتھ زکیہ کی ناک میں ڈال دی ـــ اور اس کا ٹچ، کان کے پاس جھومر میں منے اٹکا دیا ـــ

"اسے کبھی اپنے سے الگ نہ ہونے دینا ـــ یہی تمہارا سہاگ ہے ـــ" زکیہ نے سنا اور اس کا دل کانپ اٹھا ـــ دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کی آنکھوں سے نکلے اور گود میں گر پڑے ـــ

دولہن کا کمرہ، پھولوں، جھالروں اور مقیش کے تاروں سے جگمگا رہا تھا ـــ چھپر کھٹ پر سرخ جھالردار مسہری لگی تھی جس پر بھر واں تارے ٹنکے ہوئے تھے ـــ ہنڈولے کی تیز تیز روشنی میں، کمرے کی جگمگاہٹ پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔

خورشید بیگم آئیں اور سنگھاردان کھول کر دولہن کے سامنے بیٹھ گئیں۔ روتے روتے سارا سنگھار پھیکا پڑ گیا تھا ـــ نئے سرے سے انہوں

نے دلہن کو سنوارا اور پھر ہاتھ پکڑ کر چھپر کھٹ تک لے گئیں ۔۔۔
بٹھا کر گھونگھٹ اٹھایا اور ہنس کر بولیں ۔
"اب دیکھنا یہ ہے صبح تک کیا گت بنتی ہے "؟
دلہن نے شرما کر اور ہلکے سے مسکرا کر سر جھکا لیا ۔۔۔ اور خورشید بیگم ہنستی ہوئی
دروازے کو باہر سے بند کرتی ہوئی باہر کو نکل گئیں ۔۔۔
دروازہ دھیرے سے چرچرایا اور جوتوں کی ہلکی سی دپ دپ سنائی دی ۔
زکیہ کا دل دھڑک اٹھا ۔۔۔
پھر دروازہ چرچرایا اور زکیہ کا دل باہر نکل پڑا ۔۔۔ جھکتے جھکتے اس
نے کن انکھیوں سے دیکھا ۔۔۔ دولہا میاں دروازہ بند کر کے ادھر ہی چھپر کھٹ
کی طرف چلے آ رہے تھے ۔۔۔ انہوں نے گھونگھٹ ہٹایا اور وہ ایک طرف
کھسک گئی ۔۔۔
"اچھا ۔۔۔ یہ شرم ہے "؟
انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور زکیہ دوہری ہو گئی ۔۔۔ انہوں نے گھونگھٹ
اٹھا کے منہ اونچا کر دیا ۔۔۔
"اب کدھر گیا جناب وہ روٹھنا دھونا "؟
زکیہ کی آنکھیں بند تھیں ۔۔۔ ہلکی سی ہنسی اس کے منہ پر بکھر گئی ۔
اس نے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیا ۔۔۔ دولہا میاں نے ٹھوڑی سے
منہ اونچا کیا تو ہتھیلیاں کام آ گئیں ۔۔۔
"بڑے خوبصورت ہاتھ ہیں ماشاء اللہ ۔۔۔ ان ہاتھوں سے پان لے گا

ہیں ـــ اور کنگن پہنانا تو یاد ہی نہ رہا تھا۔ پھر تو اور غضب ہو جاتیں گے یہ صندلی بازو۔

اب کی بار زکیہ نے بڑی ادا سے آنکھوں کے گوشوں سے انہیں دیکھا۔ دولہے میاں کا جی لوٹ پوٹ ہو گیا۔

"اس تیز روشنی سے تو بھی اپنی آنکھیں جھپکنے لگیں۔" انہوں نے لیمپ کی بتی بالکل کم کر دی ـــ اور معنی خیز انداز میں نیچے سے مسکرانے لگے۔

زکیہ کو بری طرح پسینہ آ گیا۔

صبح سات آٹھ بجے ہوں گے کہ سسرال سے ساری سالیاں آ گئیں۔ دروازے پر دھپا دھپ ہونے لگی ـــ قدیر میاں نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔

رقیہ ماں، قدیر میاں سے عمر میں بڑی تھیں ـــ بھاوج کا منہ دیکھ کر بولیں۔

"کیسی گذری رات؟"

زکیہ نے منہ نیچا کر لیا۔ آنکھیں تو نیند بھری تھیں ہی۔

"اوہ ہو ہاں ـــ آنے والوں سے شرم۔ نہ آئی رات بھر میں سارے ہنگامے کر ڈالے۔ بس ہم ہی سے شرمانا رہ گیا ہے تمہیں۔"

اماں بی سامنے سے گذریں تو دیکھا دلہن کا کمرہ کھل چکا ہے اور دلہن کی جان پہ جھنڈ ہو رہی ہے ـــ بڑی خوش اور مطمئن تھیں اماں بی۔ اکلوتے بیٹے تھے قدیر میاں۔ رقیہ ماں کب کی اٹھ چکی تھی۔ قدیری ان کا

کیا تھا بہو! ایسا کام تھا بہو—

آج کل میں اس کو جانا ہی تھا — بیٹے کا گھر بسانے کا بڑا ارمان بھی کرتا تھا جو پورا ہوا۔

خوشی خوشی بہو کے کمرے میں آ کر جھانکا۔

واری شاباش ہے تم کو — گھیرے میں لئے بیٹھی ہیں سب کی سب کوئی تو حمام کے لئے پانی گرم کرواتا۔

خورشید بیگم آئیں اور آتے ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

"کیوں بھئی کچھ اٹھا پٹخ ہوئی یا ایسے ہی بیت گئی رات۔"

رقیہ ماں نے ہنس کر کہا — "یہ تو آپ دولہن کی بجائے ان مسلے ہوئے پھولوں اور بے ترتیب بستر سے ہی پوچھ لیجئے۔"

ذکیہ کی آنکھوں میں شرم کے ڈورے اور گہرے ہو گئے۔

دولہن کی ساتھ والی نے مصالح چکھے اور ابٹن ملے بجا کر حمام میں رکھ دیئے اور سلور کے گنگال میں گرم پانی لگا دیا۔ ماحول کی مناسبت سے میراثنوں نے لے چھیڑ دی —

جگتے جگتے ہی گذری رین سکھی ری
ہائے سجنا کے بھیگے نین سکھی ری

بڑی نند نے بھاوج کو سنوارا بنایا — ناشتے کے لئے دسترخوان پر بھائی بھاوج آتے تھے کہ اماں بی نے ہنس کر کہا۔

زرتاں — پہلے نذرانت اٹھانے دو۔ وعدہ لے کر

بیٹی ہوئی تو تیرے گھر دیں گے ۔ رقیہ ماں کی گود میں اللہ رکھے دو دو بیٹے تھے ۔

رقیہ بی ہنستی ہوئی جا کر کھڑی ہوئی ۔ بڑے بیٹے کو گود میں لے لیا ۔

"بول رے ماموں جان سے ۔ بیٹی ہوئی تو میں کروں گا ۔" وہ ہنس کر بولا ۔ "ہاں ماموں دان میں تلوں نا آپ کی بیٹی ۔" ماموں نے لپک کر گود میں اٹھا لیا ۔

"ارے تو زبان کرن کہتا ہے ۔ بیٹی ہی دے گا نا ۔؟"

چوتھی کی دو طور رچی کر تر بی بھلی ۔ سفید سفید فرش اور چاندنیوں کا بھرت بن گیا ۔ جاتے جاتے سسرال نیوتہ دے گئے تھے کہ شام میں چوتھی کا کھانا ہے اور چوتھی کھیلنے کی دعوت بھی ۔

منڈی کی ساری بھاجی ترکاری، پیاز، بینگن، آلو، ہرا دھنیا اور بڑی اماں بی نے گھر منگوا لیا ۔ شام کو صد چیا نے کہ جانا ٹھہرا تو کتنی گاڑیاں سامنے سبزی ہری ترکاری سے لدی چلی جا رہی تھیں ۔ تاکہ خوب دھوم سے چوتھی کھیل جا سکے ۔

چوتھی کا مزہ آ گیا ۔ جدھر دیکھو ادھر سبزی ترکاری بکھری ہوئی تھی ۔ صد صفیں کے بھاری کامدار ترلوان جوڑوں کی ہیئت بدل گئی تھی ۔ ہرے کالے دھبے ہی دھبے ۔

چوتھی کی رسم ختم ہوئی تو دل والیوں نے دونوں طرف کی میراثنوں کو لگا دیا کہ صد صفیں کو گالیاں دیں ۔

سمدھنوں پر وہ وہ گالیاں پڑی ہیں کہ منہ چھپائے بن نہ پڑتی تھی۔ میراثنوں کی چاندی ہو رہی تھی —— ایک ایک گالی پانچ پانچ روپے میں چھوٹ رہی تھی —

مندری بیگم نے دوطرفے رشتے سے فائدہ اٹھایا — اماں بی اور ان کا نند بھاوج کا رشتہ تو تھا ہی تھا —— اب سمدھن بھی تھیں —— الغرض انہوں نے خوب حظ اٹھایا اور تیلی میراثن سے گندی گندی گالی دلوائی تو اماں بیچ میں آ آ کر لوٹتی تھیں —

چنے پڑے تھوڑے
سمدھن کو لگے گھوڑے

اماں بی نے پانچ، دس، بیس، تیس، کہیں جا کر چالیس روپے دیئے تب گالی چھوٹی —

(۴)

چاندنی

چوتھی چالے، جاگیاں نیاریاں سب ختم ہوگئیں — ڈیڑھ دو ماہ
گذر گیا — اماں بی رو رو کر آنکھوں پہ بٹھائیں — ایسی من موہنی صورت
تھی نرگس — جیسے نازک کلی — اماں بی کی آنکھوں کا تارا۔ اور یوں
دیکھو نرگس کی آنکھوں کا تارا تھی — گھر بھر فدا تھا۔ قدیر میاں کا دل
تو اس کا دیوانہ تھا — دھوپ چڑھے کمرے کا دروازہ کھلتا اور سرِ شام
ہی بند ہو جاتا — نرگس شرما شرما کر بولتی۔

"کیوں جی آپ کو شرم نہیں آتی ہے؟"

"کاہے کی شرم بھلا؟"

"یہی گھڑی گھڑی، حضور کرتے ہو ستے؟"

اس سوال کا تو ایک ہی جواب قدیر میاں کو یاد تھا۔

رمضان کی عید شادی کے تین ماہ بعد آ گئی — نیا نیا وقت
تھا۔ نئی نویلی دولہن — اماں بی نے جی بھر کے ارمان نکالے۔ دولہا دولہن
کو عیدی دینی پڑی اور بڑے ہنگامے سے —

رات کے پانچ بجے سے ہی گلیوں میں فقیروں کا آنا جانا شروع
ہو گیا — اور ان کی آوازوں پہ، عید کی خوشیاں منانے والے منہ
اندھیرے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے —

چڑھاوے اور جہیز میں اتنی چوڑیاں ملی تھیں کہ باقاعدہ دوکان
سی لگ گئی تھی — مگر اماں بی کا چونچلا! صبح ہی سویرے مہندی چھڑوائی
رات سب لڑکیوں سہاگنوں کے مہندی لگی تھی — ترلی کے گھیرے پہ
مہندی کی باڑھ تھی — گھر کی مہندی ٹوٹی اور پیالے بھر بھر کے پیسی گئی۔
نوکرانیوں نے بھی لگائی بیبیوں نے تو خیر لگائی ہی — یہاں تو غدر کا سا
کام ہوا کہ جان سے اوپر گیا — دھوم دھام پیتی کہ حد نہیں —

ننھے منہدی چھڑاتے چھڑاتے بھابی سے چھیڑ کی: "کیوں بھابی! رات
رات تو بھائی میاں کی جیت رہی ہو گی" ذکیہ شرما گئی — قدیر میاں نے
رات جھروہ اور دھم مچایا تھا کہ ذکیہ رو رو کر تھک گئی — کر لی کیا بے چاری
ہاتھ تو مہندی سے رچے تھے اور ان کی صفائی ہو رہی تھی — ذکیہ ہنس کر
بولی —

- جیت تو کیا، رہی جناب کی۔ اماں یہ ضرور کہہ رہے تھے کہ تم روز مہندی
لگایا کرو تو اچھا ہے"

نندیں سجا رہیں، ہنسی ہنسی دوہری ہوگئیں۔ اماں بی نے جھپٹ کے دیکھا تو لال پیلی ہو لیں۔

— اے ہنسی مذاق بعد کو ہوتا رہے گا چوڑی والی کب کی آئی بیٹھی ہے پہلے بانکیں چڑھوا لو۔"

صبح اندھیرے سے ہی ادھر چوڑی والی آئی بیٹھی تھی — بیچارہ بھر رنگا رنگ کی چوڑیاں — ان پر طلائی کام — تو گویا جھم جھما رہا تھا۔

بچے زیور کی کیا کمی تھی مگر اماں بی نے اپنے پاس سے سونے کی بھروان مانجھے نکال کر دیے۔ بیچ میں طلائی کام کی ہری ہری چوڑیاں منگوا کر آس پاس مانجھے منگوائے۔ دولہن کا تو نام ہوا بے چاری کا — اس کے طفیل میں سبھی نے نئی نئی نیلی پیلی ہری ہری لال گلابی بانکیں پہن لیں۔

بی اماں نے بڑے جتن سے دنوں قبل ایک جوڑا اپنی بہو کے نام سے اتار رکھا تھا — کمخواب کا چست پاجامہ — اطلس کا جھلملیا کرتا سنہری دوپٹہ اور ستارہ ٹانکے کی کرتی چولی — اتنے پر بس نہ کیا بلکہ پورے جوڑے پر جگر مگر کرن کا مرانی بھی بنوائی — اس کے ساتھ کا گہنا بھی سنہرا ہی تھا۔ مغلانی بی نے کہا بھی —

"اے بیوی میں کہوں یہ کامرانی کا کرن کھٹک ہے — سارا جسم چھیل جائے گا — پہلے ہی تو اپنا نکّے دار جوڑا ہے۔"

"اے بی تو رات دن تو چڑھائے نہیں رہے گی — اور جسم چھلنے کی بات تو جانے دو — ہاں اب مرد والی جورو ہے۔"

امّاں بی ہنس پڑیں ۔
امّاں بی عید پر، اور خصوصیت سے رمضان کی عید تو بڑے دھوم دھام سے مناتیں ۔

بی امّاں نے دلہن کو نہلوایا ۔ اپنے پاس کا جوڑا دیا ۔ ساری لڑکیاں دولہن بنی پھر رہی تھیں ۔ باورچی خانے میں بڑے دیگ میں خمیر خورے کے لیے دودھ اوٹ رہا تھا ۔ سویاں تلی جا رہی تھیں ۔ باہر خانساماں بڑے بڑے گھڑوں میں بھر پانی، تورے اور سالن بگھار رہے تھے ۔
اماں بی کو گانے بجانے سے بڑی رغبت تھی ۔ کوئی گلوکار ہو کوئی گائک ہو میراثنوں کو سب سے پہلے بلوا جاتا ۔ بڑے سرکار کو اتنی ساری باتوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا جو بڑی بیگم کرتی رہیں رہی اچھا ہے ۔
عید دن پہ میراثن صبح سے ہی آ کر جم جاتیں اور اونچے اونچے سروں میں مبارکبادیاں کا نا شروع کر دیتیں ۔

مبارک مبارک یہ خوشیاں مبارک
یہ عید دن کی رنگین گھڑیاں مبارک

ادھر نمازی عید کی نماز سے لوٹتے اور ادھر دسترخوان سجا بنا ہوتا ۔ بڑے والان میں اس کمرے سے لے کر اس کمرے تک دسترخوان بچھتا ۔ ستر سے کم کیا لوگ بیٹھے ہوں گے ۔ اور اماں بی کا تو یہ حال تھا کہ گاؤں میں جتنے بھی رشتے دار تھے عید کے دن انہی کے دسترخوان پہ ہوتے ۔ پہلے تو گھر والے کو کیا کہ ہوتے کہ مہمان بھی آ جاتے ۔ تو لوگوں کی بڑی سی بیٹھک

دسترخوان پر بیٹھتی تو اس سرے سے اس سرے تک پتہ بھی نہ چلتا کہ کون کون بیٹھا ہے
اماں بی کا دل خوش ہو جاتا۔

بھائی بہن، مرد، بچے، ماموں، ممانی بھی لوٹے اور سب نے ایک دوسرے کو
جھک جھک کر سلام کرنے شروع کئے۔ عیدی مانگی گئی۔ اماں بی نے سب کو عیدی دی۔
دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ بڑے سرکار بھی آج سب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ورنہ
ان کا، اور ان کے مصاحبین کا دسترخوان الگ ہی لگتا۔ یہ انہیں کی چال
چلن میں کوئی برائی تھی اس لئے باہر ہی رہتے۔ انہیں تو ہمیشہ سے یہی عادت تھی
غریبی کے دنوں میں بھی یہی حال تھا کہ جب تک دو تین یار دوستوں کے بیچ میں کھانا
نہ کھاتے، دل کو نہ لگتا۔ چاہے وہ دال روٹی کیوں نہ ہو۔ [illegible] کے ساتھ۔ دسترخوان
پر تنہا تو ان سے بیٹھا ہی نہ جاتا۔

اپنے دسترخوان پر دوستوں کو دیکھ کر میرا دل بڑھ جاتا ہے۔ جس کا دل
بڑا ہوتا ہے خدا اس کا دسترخوان بھی بڑا رکھتا ہے۔ یہی برکت تھی کہ سو کو کھلا کر
کھاتے تب بھی خدا کی نیاز تھے

کیسی اچھی گذر رہی تھی کہ راجہ بنے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان کے ماں باپ
ایسے کوئی بڑے جاگیردار نہ تھے۔ معمولی کھیتی باڑی تھی اور گھر
کے چند جانور۔ گزر بسر کے کام آتے۔ مگر باپ کے مرنے کے بعد جب اپنے
تنہا خود مختار ہوئے تو ان کے ہاتھ پڑ کر مٹی بھی سونا ہو گئی۔ اسی چھوٹی سی
کھیتی باڑی نے انہیں گاؤں کا بڑا آدمی بنا دیا۔ اور ایسے کہ سدا ہاتھ کھلا
ہی رہتا۔ کسی قسم کا گلہ [illegible] کہ جیب میں بیٹھا ہے [illegible] ہے
یا موت ہے ——— جیسا وقت آتا ہے آنے دو ——— اوپر والا
تو ساتھ ہے ——

یہ دل کی نیکی اور بھروسہ ہی ایسی چیز تھی کہ آج گاؤں بھر میں بڑے سرکار کے نام سے باجتے تھے۔

بقرعید کے آتے آتے ذکیہ بی کا پیٹ ابھر گیا —— معلاقی بی کا کہنا تھا ——

"اور کی ہیں تو کہتی ہوں دلہن پاشا کو جلوے کی رات کو ہی حمل ٹھک گیا۔"

کیونکہ دو ماہ بعد سے ہی ان کی پچھاڑی ایسی وزنی دکھائی دیتی تھی جیسے کچھ اندر کے شکار کھا ہے —— انہوں نے اماں بی سے کہا بھی تھا تو یہ بولیں۔

"اے کچھ بات بھی ہو —— کیا ہم نے بچے پیدا نہیں کئے ؟ جہیز کے جوڑے تو رہیں ہی —— چڑھاوے کے جوڑے بھی سو کے دہری رہیں بھاری بھرکم تو ران —— ایسے نہ چلے تو کرے بھی کیا بے چاری۔"

"اب آپ کے سامنے منہ کیا چلاؤں بیوی مگر میری آنکھ تو دھوکا نہیں کھا سکتی۔"

انہی دنوں ذکیہ بی کو زور دار متلی اٹھی تو اماں بی کو پھر بھی خیال ہوا کہ حمل ہو گا —— بولیں۔

"دلہن پاشا تمہارا کمرہ ادھر اندر کی طرف ہے سو گرمی سے جی اُبک جاتا ہو گا —— میں معمار بلوا کر کوئی کھڑکی کھلوا دوں گی۔"

باغیچے کی طرف سے ایک کھڑکی بھی کھلوا دی گئی —— مگر جب بار بار متلی کے ساتھ قے بھی ہونے لگی تو اماں بی کا منہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"دلہن پاشا کو تو پانی تک نہیں پچ رہا ہے۔" انہوں نے خوشی خوشی

حفاظت ہی کرنا تھا۔

"اب کہیے نا بیوی جی کہ کیا ہم نے بچے پیدا نہیں کئے تھے؟"

"وہ تو تمہارے جیسے بارہ چودہ نہیں جنے ــــ لے دے کے تین ہی تین تو ہوئے تھے" اماں بی ہنس کر بولیں۔

"تو پھر میری بات مانی کیوں نہ تھی؟"

اب اماں بی کو بڑا خیال رہنے لگا کہ پہلا پہلا معاملہ ہے کوئی ویسی بات نہ ہو جائے۔ دلہن پاس تھیں تو چنبیلی کی سی نازک ــ ہوا کا ذرا سا جھونکا بھی پریشانی کا باعث بن جاتا تھا۔

انوری بیگم کو اس خوش خبری کا پتہ چلا تو پھول اٹھیں۔ اللہ بیٹا بھی دیتا ہے بیٹی بھی ـــ بیٹی کا ہونا ہزار خوشی کی بات ہو مگر پہلا دوسرا بیٹی تو جان کو لگے رہتے ہیں۔ ڈھنگ سے تربیت، پالن پوسن ہوئی بھی تو کوئی خاص بات نہ ہوئی ـــ اصل چیز ہے منگنی بیاہ ـــ قسمت کا حال تو قسمت بنانے والا ہی جانتا ہے ـــ ایسی ویسی جگہ پڑ گئی اور نصیب پیچھے پڑ گئے تو ماں باپ کو عمر بھر کی جھینک لگ گئی۔

چلو قسمت اچھی ہو بھی گئی ـــ میاں کے من تھا، بھی گئی تو اولاد کا جھیلا بھی کچھ کم نہیں رہتا ـــ یہ تو اللہ کی دین ہے، گود بھری بھری نہ بھری ـــ اللہ کی بات تھوڑی ہی ہے۔ اور پھر اچھے ہی نکلے تو نسل چلے گی بھی کیسے! مرضی نہ ہو تب بھی دوسری تو گود ہری کرے گی۔ چلو دوسری سوت، چھاتی پر مونگ دلنے آگئی ـــ اب بیٹھے رہو عمر بھر

آنسو بہاتے ہوئے ۔۔۔!

انوری بیگم خوشی سے پھولی نہ سمائیں کہ خدا نے مہربانی کی اور بیٹی کی کوکھ ہری بھری رکھی ۔۔۔

بڑی خوش نصیب تھیں وہ بہن پاشا ۔۔۔ ان کا گھر بھی خیر سے کماتا تھا پشتوں سے بڑھ کر تھا اور یہاں سسرال میں تو پوچھنا ہی کیا تھا۔ ادھر ادھر دونوں طرف سے دبے دبے تیاریاں ہونے لگیں ۔۔۔ یوں کھلے خزانے بھی تیاری ہوتی تو کون ہاتھ روکے چلا تھا مگر گود ہری کرنا تو اللہ کا کام ہے ۔۔۔ پورے نو مہینے بیتے ہوتے ہیں ۔۔۔ اور پل پل پہ اللہ آمین کا سہارا لینا ہوتا ہے ۔۔۔ کبھی اونچ نیچ ہو گئی اور پیٹ گر گیا تو سننے والیوں کے لئے تو معمولی سی بات ہے مگر جھیلنے والی کے دل پر کیا کیا نہیں.. بیت جاتی ۔۔۔؟

انوری بیگم کا تو ایسا ہی حمل جاتا رہا تھا ۔۔۔ شروع دنوں سے تیاری ہو رہی تھی ۔۔۔ بیچ دنوں میں آ کر اچھا خاصہ پانچ مہینے کا حمل گر گیا ۔۔۔ منہ سے تو کیا بولتیں کہ بے شرم کہلائی جاتیں مگر بیٹی بہنوں سے ننھے ننھے کرتے ٹوپیاں، جھبلے دیکھتیں اور دل ایک تو ویسے ہی حمل گر جانے سے خون ضائع ہوا اس کی کمزوری۔ دوسرے ہر وقت کا رونا دھونا ۔۔۔ ہفتوں ہی ہفتوں میں وہ صورت نکل آئی کہ پہچاننا بھی مشکل تھا ۔۔۔ دوسرا حمل جلد ہی ٹھہر گیا اور جب ان کو اپنا آپا بھی بھاری محسوس ہونے لگا تو پھر آپ ہی آپ نند کی

عزت کرنے لگیں۔

اسی بنا پر دلہن پاشا سے ایک عجیب سی الفت پیدا ہونی شروع ہو گئی —

آنے جانے پر کوئی روک ٹوک تھی نہ پابندی — دلہن پاشا کا جب بھی جی چاہتا ماں کے ہاں جاتیں، جب جی چاہتا ساس کے ہاں آ جاتیں۔ ساس نے ماں کی سی سرپرستی دی — دلہن پاشا نے کبھی تو محسوس نہ کیا کہ اپنا میکہ چھوڑ کر سسرال آ بسی تھیں — وہی ماں کی سی محبت، وہی چاہت، رقیہ اماں تو اپنے گھر کی تھیں — تو اسی ماں بھی بہنوں کی سی محبت رکھتیں — آگے پیچھے کبھی برائی نہ طعنے تشنے — اور نندیں تو واری صدقے تھیں —

دلہن پاشا کا اب ان کا مہینہ چل رہا تھا۔ چلتیں تو سانس پھول جاتا — بیٹھتیں تو اچھی طرح بیٹھا نہ جاتا — بس رو سی جاتیں۔ نیند اس غضب کی تھی کہ اللہ ہی بچائے — بڑی بوڑھیاں ہنستی تھیں۔ "بیٹی ہو گی — ساری نیند اسی کی ہے نا؟"

اور پھر بیٹے کا بھاری رہنا وِرد تھا کہ معلوم ہی تھا — دلہن بیگم بھی یہی کہتیں — کہ پہلے پہلے بچہ ماموں کا جوڑا ہی بیٹھے تو بیٹا ہی ہو گا —

اماں بی کہتیں — مجھے نہ بیٹے کی فکر ہے نہ بیٹی کی — بس یہ فکر ہے کہ اللہ جو کچھ بھی دے دے اپنی خوشی اور دلہن کی سلامتی کے

2117258

ساتھ دے دے سے؟

ان گنا بھینٹ ملا تو زمین کی بھید شروع ہو گئی۔ اب تو قدم قدم پر بسم اللہ پڑھی جانے لگی۔

"چلتی ہے تو پاؤں اونچا نیچا تو نہیں ہو جاتا ۔۔۔؟"

"بیٹھتی ہے تو گاڑی کی دب تو نہیں جاتی ہے؟"

"دوڑ دوڑ سیڑھیاں ایک ساتھ تو نہیں پھلانگ جاتی ہے؟"

"اللہ یہ سب کچھ تو ہوتا رہی ہے ۔۔۔ بھلا زمین بیٹھنے کی پچھاڑ پڑ کر کسی کا من آپے میں رہ سکتا ہے۔؟ ہر دم زچگی کا ڈنکا لگا رہتا ہے۔

جس دن بڑے چچا کے ہاں کی دعوت آئی ہوئی تھی ۔۔۔ بڑا گوٹ مدعو تھا ۔۔۔ زکیہ بیٹے پہ تھی ۔۔۔ چچا نے بطور خاص زکیہ بی بی کو بلوایا تھا ۔۔۔ (نانی) کا بڑا بیٹا کہ اوتو ہو رہی تھیں۔ ماں نے دل پر ست تہا بھی بھیجا۔

۔ ارے ارے ہو گئے ہیں میاں ۔۔۔ یہ ہنگامہ۔ جانا بھی ضرور تھا کیا ۔۔۔؟

تب تو ایسے بات کر لی ہی بھاوج ماں کہ وقت پڑا تو جیسے میرے اور انتظام ہو رہی۔ سکے کا ۔۔۔

چار دنے پہلے سب چچا میاں کے ہاں پہنچ گئے۔ زکیہ بی بی صاحب کی ریشمی دو رجیشا، موتیوں کا گہنا، ہلکا پھلکا سنگھار کئے تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں مگر بڑی پیاری سی لگ رہی تھیں کہ ہر کوئی ملک کر

ہر گھڑی دیکھنے کھڑا ہو جاتا تھا اور یہ اپنی جگہ جھینپ جاتیں۔۔
چچامیاں نے محبت سے گلے لگا لیا۔ ماں چال پر چھا گئیں مگر یہ بھی ہی
رہ گیا —

بچھی ہل کے کھیتوں کی جوائی۔ ایک جوائی زمین میں ملا دینے کے بعد
ہوتی تھی — اس طرح زمین زیادہ زرخیز تو ہوتی مگر فصل ذرا دیر کو
کھڑی ہوتی — اب گھر کی امرائی کے آم آئے ہوتے تھے — آموں
کے بڑے رسیا تھے — وہ روز دو سے اوپر گٹھلیاں منگوا دیتے —
ایسے بڑے رسلی آم کہ سیر سیر کا ایک ایک — اسی سلسلے میں یہ دعوت
تھی —

زکیہ بی بی نے دو ایک ہی قاشیں کھائی ہوں گی کہ ڈھیر ڈھیر
منہ بنانا شروع کر دیئے — اب ایسا بھی نہیں کہ سینکڑوں آموں
کی گرمی سے دھبے لگنے شروع ہو گئے — آخر مہینے تو پورے ہو چکے
تھے، کسی بھی لمحے اللہ کا فضل ہو سکتا تھا — اللہ رے بیوقوف کیا
شرم آئی تو چھوٹی بھوپھا سے جا کہا — پہلے پہل کے دو ماہ تھے
پریشانی یا گھبراہٹ کی بات ہی کیا تھی مگر تھی تو دو جون زچہ — سارے
میں بھاگڑ مچ گئی — دولہا کو دوڑایا گیا — اس نے چپکے
سسرال میں خبر کی —

"دلہن بی بی کو درد لگے ہیں۔"

اماں کو کہاں چین پڑتا — گھبرا گھبرا کے پوچھا۔

شروع کیا۔ وہ الّو کی دم کیا برتتا ہے۔ اُسے ترس اتنا ہی
منہ پسید سے کر بھیجا گیا تھا۔

وہاں بی بیگنی ہوئی بڑے سرکار کے پاس پہنچیں۔
"دو تین بھو کو درد لگے ہیں اور آپ یہاں کو مزے سے حقہ گڑگڑا رہے
بیٹھے ہیں۔"

"ہائیں ۔۔۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "مجھے تو خبر بھی نہیں"
منشی جی کو بھیج کر ابھی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لو۔ بی جان کو جلدی
بھیجا ۔۔۔ بیوی صفائی اور آسانی کے ساتھ جا پہنچ کر پتہ بھی نہ
چلا ۔۔۔ کے بال چھپا بچہ نکل آیا ۔۔۔

اماں نے جھٹ گاڑی منگوائی ۔۔۔ ساتھ سنگت والیاں بھی
جانے کو کہنے لگیں ۔۔۔

"۔۔۔ میں تو جاتی ہوں۔ تم لوگ آتی ہو پیچھے۔ میرا دل
نا جانے کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا ۔۔۔ ہی ہو گی۔
۔۔۔ ہے۔ سوتی اسے ساتھ خوشی آرام ۔۔۔ دعا پڑھت
۔۔۔ ۔۔۔ بیماری زیادہ دل لگی ہے"

اماں تو دھڑ دھڑ کرتی گاڑی میں بیٹھ چلتی ہوئیں۔ ادھر
جانے والوں کا شور شرابہ شروع ہو گیا۔

بی میاں نے ۔۔۔ ادھر جیسے عید ہو گئی ۔۔۔ اللہ بیگم منہ پھوڑ
غصہ ۔۔۔ دکھائیں ۔۔۔ ۔۔۔ چڑھ مزید ۔۔۔ تھیں۔

" اسے بس میں نے آگے ہی کہا بھی کر دیا! ایسے میں ہی دعوت دینا ضرور تھا — بولنے لگے " میں بچا نہیں ہوں کیا ؟" میں کہتی ہوں اب چالیس دن میں بار بن کے انھی کے ہاں پڑی رہوں گی کیا ؟

اماں بی نے صلاح دی کہ اگر درد ہلکے ہو رہے ہوں تو ابھی بھی گھر یعنی والی ڈولی میں ڈال کر گھر ہی لے چلیں — چچا میاں کے کانوں تک یہ بات گئی تو انھوں نے ادھر منہ پھلا لیا۔

" مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنا غیر ہو جاؤں گا کہ درد کھاتی بھتیجی کو پلٹنا پڑے گا "

امی بیگم تو بے چاری کیا کہتیں — دیور بھاوج کا رشتہ تھا — سسرال کی بات تھی۔ کسی کا برا بنا نہیں کھاتی تھیں مگر انسان کو رخ دیکھ کر بات کرنی ہی پڑتی ہے — چپ رہ گئیں — گو منہ بہت سل سلایا مگر میاں بھتیجی کو پلٹانا تو بعد کی بات ہے۔ ایسے پورے دنوں میں بلانے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی ؟

اماں بی بولیں " میاں۔ جی کیوں میلا کرتے ہو۔ تم خود سوچو پہلا کا رہے پہلی زچگی — اس بے چاری نے بھی دل میں کچھ ارمان پالے ہی ہوں گے کہ بیٹی کے دن آئیں گے تو یہ کروں گی وہ کروں گی۔ تم خود کیوں ایسے ناک سے جتاتے ہو ؟ میری اولاد تو جانے ہی دو۔ بھلا اس کی بات نہیں — یوں ہی تمہیں ارمان ہے تو دوسری بار اللہ مہربانی کرے گا تو تمھی نے زچگی جاپہ کرنا ۔"

کہیں رات کے گیارہ بجتے بجتے زکیہ بانو کے دردوں میں تیزی ہوئی — دائی اندر ہے — اماں پاس کھڑی ہیں — ساس دعائیں پڑھتی بیٹھی ہیں اور اماں کی ہر چیخ ہے کہ آسمان سے ٹکرا رہی ہے۔ وہ باہر نمدہ بچھ رہا ہے —

اماں بی کرا بیٹھے ہیں بھی میرا قتن نہ بھولیں۔ رات کے گیارہ بجے بجا دیا گیا تو ان کے ٹھاٹ کیا پوچھنا تھا۔ کوئی تو رات بھر کے پانچ روپے بھی نہ دے اور یہاں آدھ جگت ہوئی دیکھی تو بڑے نخروں کے ساتھ بیس روپے کا مطالبہ کیا — اماں بی کو بھلا کیا جھگڑنا تھا — بس گنا تے پچاس تھما دیے۔

"جان کی سلامتی کے ساتھ اللہ ننھی منی سی جان دے دے ایسے ایسے ہزاروں لٹا پھینکوں گی — پچاس کی کیا حقیقت ہوئی ہے؟

صحن کے باہر بیبیوں کی رت جگا ہو رہی تھی — اللہ رکھی بیگم کی بیٹی اور بڑے سرکار کی بہو کا زچہ خانہ — اور وہ بھی پہلا زچہ خانہ ہو رہا تھا۔ بھلا کیا ٹھاٹ باٹ پہ بیچے تھے۔ ڈھول بج رہی تھی۔ میراثنیں ماڈیوں تلے ڈھول دابے بیٹھی تھیں کہ کب بچہ رونے کی آواز آئے اور وہ ڈھول پیٹنے شروع کر دیں۔

ارے اللہ اللہ کر کے رات کے ڈیڑھ دو بجے ننھی منی سی آوازیں آئیں — ہماں — ہماں۔

مغلانی بی رہیں سے بولیں — اری بیٹی نے گھر سنا کیا؟

سنتی ہو کیسی آواز ہے ۔۔۔ ؟

حلانی بی کا کہنا تھا کہ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی، بجائے خوشی کے گھر پر اداسی آ جاتی ہے ــــ برائی کی حدیں پھلانگتا تو دور رہا۔ اپنی ننھی ننھی چیزوں سے ہی یہ جتاتی آتی ہے ــــ مجھے جانا ہے۔ مجھے جانا ہے۔

"اے بی۔ بھلا جاتی ہوئی لڑکی بھی گھر روشن کرے گی ۔۔۔ ؟

ابھی اماں کے منہ کی بات منہ میں ہی تھی کہ اندر سے بیگم نے دروازے سے جھانک کر سنا دیا ــــ

"بیٹی ہوئی ہے بھیرو! اللہ سلامتی کرے اور نصیبہ اچھا کرے ۔۔۔

خوشی خوشی ماماں بھی اماں کے پیچھے ہی لپک آئیں۔ ۔ وزیرن ــ چنچل۔ مبارکبادی چھیڑ رود ــــ ہمیں تو کیا بیٹا اور کیا بیٹی ــــ سب ایک سے ہیں۔ کیا بیٹا یوں ہی آسانی سے جنی جاتی ہے ۔۔۔ ؟ ارے نو مہینے اسے بھی رکھنا پڑتا ہے۔ وہ بھی دردوں کے ساتھ دنیا میں آتی ہے ۔۔۔ !

بڑے سرکار، رحیم بیگ، اور مصاحبین دوست احباب رشتہ دار بھی باہر جمع تھے ــــ قمبر میاں بے تابی چھپائے منتظر تھے کہ کب ادھر جانا ہوتا ہے۔

باہر سینی میں سونے کی چوڑیاں رکھ کر بھجوائی گئیں ــــ پتہ لگ گیا کہ چوڑیاں پہننے والی پیدا ہوئی ہے اور جو صافہ بھجوایا جاتا تو صاف ظاہر تھا کہ گھوڑا چڑھنے والا پوت دنیا میں آیا ہے ــــ !

ادھر حویلی میں خبر گئی نہیں کہ رات کی پرواہ کیے بغیر دھوم دھام

شروع ہو گئی ـــــ گاڑیاں آنے لگیں اور بھاگ دوڑ پڑ گئی۔ لڑکیاں بالیاں، بڑی بوڑھیاں، بچے والیاں، مرد، بڈھے، غرض سبھی کے سبھی الٹ پڑے ـــ بھلا اماں بی کے گھر پوتی ہوا ہے اور سب یہ تماشا نہ دیکھنے آئیں؟ یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔

اماں بی تھیں کہ آسمانوں پہ چل رہی تھیں۔ سب تو یہی اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اماں بی اس بات پر منہ پھلائے بیٹھی ہوں گی کہ بیٹا نہ ہو کر بیٹی ہو گئی ـــــ ہوئی بھی تو کس کام کی ـــ، چار دن کھیلے گی کودے گی اور پھر گھر گرہستی ان دیکھی کر کے دوسرے کے گھر کی راہ لے گی۔ مگر اماں بی تو یوں خوش تھیں جیسے بڑے کماؤ بیٹے نے جنم لیا ہو۔ مبارک سلامت کی دھوم مچ گئی ـــ جو آتا اماں بی کے پاس جاتا۔ مبارکباد دیتا ـــ صاحبزادی کی سلامتی کی دعا دیتا ـــ اماں بی خوشی خوشی بھلا دعائیں سمیٹ رہی تھیں ـــ

قدیر میاں شرماتے جھجکتے آئے اور بی بی کے بازو بیٹھ گئے۔ منہ سے کچھ بول نہ پا رہے تھے مگر خوشی تھی کہ منہ سے پھوٹی پڑتی تھی ـــ ادھر ادھر آس پاس عورتوں ہی عورتوں کا جمگھٹا تھا ـــ تھے تو مرد، مگر پھر بھی سبھی کو کچھ اچھا نہ لگا ـــ پہلوٹھی کی اولاد دیکھو اور ماں بہنوں کے سامنے بی بی کے بازو برابر جا کر بیٹھ بھی گئے اور ٹپاٹپ پیار بھی بچی کے لینے شروع کر دیئے ـــ

بس اسی ڈر کے مارے بانو بیٹھے مسکراتے رہے اور بچی کو جھک جھک کے

دیکھتے رہے۔

چلنے کو ہوئے تو شنکر جھکے اور بی بی کے کان میں کہہ گئے۔

"اپنی چھاتی سے دودھ نہ پلانا بیگم" سے خود ہی مسکرا کر بولے "مطلب تو سمجھ گئی ہوں گی نا۔۔۔ ہاں؟" اور ہنستے ہنستے چلے گئے

حالانکہ ہنسی سے یہ بات کہی گئی تھی مگر دلہن پاشا تو سنتے ہی حیران سی رہ گئیں۔۔۔ کون تنگ تھی بھلا، نو مہینے تک پیٹ میں رکھا بوجھ لیتے لیتے پھرتی رہیں۔ خشخاش ایم کھانے سے پرہیز کیا۔۔۔ اچھے برے ذائقے سے اپنے منہ کے مزے تک کا خیال نہ کیا کہ اللہ خیر سے گود بھرے اور پھر ایسے پکے" دردوں سے جا کر اپنی جان پر بن بن گئی اور میاں ہیں کہ اپنے عیش کے لئے سنا گئے۔۔۔۔

"دودھ نہ پلانا"

ماں بی زکیہ کو سہاگ یاد تھے، یہ اندری بیگم کی بھی تو پہلی اولاد تھی کہ صاحب اولاد ہوئی۔۔۔ دوسرے دن اندری بیگم نے اپنے سے ہر کام کی ہر بات، مالن سے پھر کر مانگی۔۔۔ گائے کا تازہ تازہ دودھ نکلوایا اور چاندی کے پیالے میں اٹھائی زکیہ بی بی کے پاس لے گئیں۔

دودھ حویت کا حق ادا کرنا تھا۔۔۔ ماں بی بیٹی سے بولیں۔۔۔

"چار قطرے ماں۔۔۔ دودھ دھلائی کرو۔" گنگے سے پہلی دودھ میں ذرا دیر ڈوب کر رنگ نے دلہن بیگم کی چھاتیاں دھوئیں اور پھریری سے پھر گود نیک لیا۔

مغلانی بی نے نہلا دھلا کر پھول سی بچی کو گود اٹھایا اور مذاق سے بولیں ——

" لو دلہن بھابی بسم اللہ کرو اور منہ سے چھاتی لگاؤ۔ اللہ بخشی بھوکی ہے رو رو ہلکان ہے "

دلہن پاشا چپ رہیں تو یہ ہنسی سے بولیں ——

" میاں کا خیال آرہا ہوگا —— پر ہے وہ قریب ہی یہیں خود بھی ک

رہی تھیں —— شرنگ موڑ دیا تو جسم ہے بی بی تمہارا "

زکیہ کو شرم آگئی ——

مغلانی بی بولیں —— دلہن پاشا ہنسی مذاق کرو بعد کو —— پہلے بچی کا منہ تو لگاؤ "

زکیہ بی بی عجب مشکل میں —— کہیں تو کیا کہیں؟ ادھر میاں کا حکم دیا اور میاں یہ پوچھ چکے ——؟ مغلانی بی سے دھیرے سے بولیں ——

" دودھ ہوتا ہے۔ ابھی نہیں "

مغلانی بی ہنسیں " دلہن پاشا —— اسی لئے تو کہتی ہوں کہ چاہئے کہ منہ لگاؤ —— دودھ اتر گیا ہے۔ اسی لئے اکڑ گئی ہیں —— بچی دودھ کھینچے گی تو سارا اندر آپ ہی آپ غائب ہو جائے "

زکیہ بی بی کا دل کیسے چاہ رہا تھا اس ننھی سی کلی کو اپنے کلیجے سے لپٹا لیں اور اپنی چھاتی اس کے منہ میں دے دیں ——

مغلانی بی نے اور دو چار باتیں سنائیں تو دھیرے سے بول گئیں۔

۔ انھوں نے مناہی کر دی کا ہے۔" ؟

حفلاں بی پیچھے ہٹ گئیں اور ماماں بی آگے بڑھ آئیں۔

قدیر میاں کا کیا جاتا تھا؟ بی بی کی کوکھ تھی تبھی دیکھنا چاہتے تھے بچہ چھاتیاں چوستا ہے بدن ڈھلک جاتا ہے۔ کمبخت نے تمک کسی سے بھی نہ لگایا — شادی ہوتی بس بی بی کو ہاتھ لگایا — خیر کے منہ کو خون لگ گیا۔ بچے تو تھے نہیں، اپنا عیش بھی کر جاتا ہے — نئے نئے دولہے تھے۔ ان کو اس بات کی برداشت نہ ہوتی کہ کسا بندھا کر شت پھیلا جائے۔ مگر ماماں بی یہ کیسے برداشت کر پاتیں کہ ماں کے ہوتے ہوئے بھی بچی غیروں کے دودھ خون پہ پلے — ہو یوں الگ ہوتے ہوتے بجلی کر چھٹی اور خون اوقوں کا جوڑ نہ ملے — غیر ولک ددھ کا کیا ہے؟ پلانے والی کا سارا اثر آجاتا ہے۔

ستو میاں کی بی بی کو پہلا بیٹا ہوا۔ خاندان شریف، ماں باپ شریف ساتھ پیڑھی تک کوئی کھوٹ و خرابی نہ تھی۔ بیٹے کے پیدا ہوتے ہی خون چھوٹ گیا۔ لینے کے دینے پڑ گئے — ہوتی غلطی تو ہی۔ قسمت کی بات ہو کر رہتی ہے۔ حکیم بھی آئے۔ بگھی پہ چڑھ کر شہر سے ڈاکٹر بھی آئے۔ جو ہونی ہوتی ہو چکی تھی تو کرتے کیا، حکیم بھی کیا کرتے؟ شام ہوتے ہوتے دلہن بیچاری بی بی ایسے ختم ہو گئیں کہ پتہ بھی نہ چلا۔

اب ننھا منا سا بیٹا تھا کہ جس نے ماں کی چھاتی کو منہ بھی نہ لگایا تھا شہد، تیل چٹانے کو چٹا دیا مگر پیٹ کا ہے کو بھرتا؟ گھر میں دو دیکھے تھیں

کھلائیں بھی دودھ والی مگر کسی کے منو میاں نے اجازت نہ دی اور کسی نے آپ
ہی بہانہ کر دیا ــــ اور اپنا بچہ آنگ سے لگا چھوڑ کر دوسرے کی کون پرواہ
کرتا ہے بی ــــ؟

ایک کھانا پکانے والی ماما تھی ــــ اگلے حسب نسب کی کسے پرواہ تھی
بھینس کی بھینس تھی۔ اس کا اپنا بچہ بھی تھا مگر وہ پیٹ بھر کر پی کر اٹھتا تو بھی
اس کا کرتا سامنے سے لت پت بھیگ جاتا ــــ منو میاں کی اماں اسی کو
پکڑ لائیں ــــ اس نے کرتا اٹھایا اور چھنگی منہ میں دے دی ــــ بچے کی اوقات
ہی کیا ــــ چار پانچ گھونٹ میں پیٹ بھر گیا اور مگن ہو کر سو گیا۔

اب اس کے ان بڑے تڑاکے ماما گیر نکلے تو بلا کر انا گیری پر لگا دیا
گیا۔ بھینس کا سارا حب کھانے کو دیا جانے لگا ــــ میوے، بھیل
دودھ، ملائیاں سبھی کچھ ــــ تنخواہ الگ بندھی ــــ اور منو میاں کے
بیٹے اس کے دودھ پہ پلتے رہے۔

بچپن سے جوانی آئی۔ دادی اور باپ کی تربیت میں بڑے ہو گئے۔
کتب اور مدرسے کی تعلیم بھی ہوئی جیسا کہ اس زمانے میں دستور تھا۔ باپ
نے اس قابل کر دیا کہ چار میں بیٹھ سکیں ــــ دودھ اپنا رنگ لاتا ہے اور
لا کر رہا۔ ایسے ایسے کام کیے کہ پورے خاندان کے نام کو بٹہ لگا رہا۔ بعد میں
پتہ چلا کہ جس انا کا دودھ پیا وہ ایسی شریف بی بی تھی کہ ہر رات نئے مرد کا
بستر گرم کرتی ــــ جانے کتنوں کو گھر لایا ہوگا۔ ایک بدذات رنڈی سے
آنکھ لڑ گئی اور اسی کے گھر آ پڑی ــــ اللہ نے کر کھو ہری، کفنی تھی۔

بیٹا ہوا۔ کس کس کا میل تھا یہ تو اسی کا دل جانے مگر چاند کا ٹکڑا جیسا تھا ـــ فقیر کو کسی ایک گھر کی۔ روٹی آنگ نہیں لگتی ـــ جب تک گھر گھر پھر پھر کر مانگ مانگ کر نہ کھائے دل کو نہیں لگتا ـــ اس کا دل کیا چنتا تھا۔ گود میں تو سال بھر کا بیٹا تھا اللہ مارا زاری اِدھر اُدھر لئے لیتی پھرتی تھی۔ منتوسیاں کے اِن ابا کی ضرورت تھی ـــ پتہ نہیں کہاں پہنچ گیا۔ میاں بھی سب کے ساتھ وہی برابر انصاف سے سلوک کرتی۔ بھائی باپ بیٹے پوتے کی کوئی تخصیص نہ تھی ـــ دن کو ہانڈیاں گرم کرتی اور رات کو بستر گرم کرتی ـــ

اماں بھلے ہوتے ہوئے بات مردانے میں بھی جا پہنچی ـــ اپنے دبدبے سے تو لال پیلے نہیں ہوئے۔ مگر دوسروں کے ذریعہ کہلوایا بھی ـــ مگر قدیر میاں کے دماغ میں تو بھس بھرا ہوا تھا ـــ نہ مانے ـــ ان کے ہوتے بھی بیگم غیروں کے دودھ پہ پلتی رہی۔

دلہن بات گو دوسرے دن کا پانی لیتا تھا ـــ اندری بیگم نے تو باقاعدہ چھلے کی سی دھوم کر دی ـــ ساس کو پتہ چلا تو خوب خوب بگڑیں ـــ

"وہ تو بی بی میں بھلا اپنی بہو کا اتنا بھی کار نہ کرتی جو تم نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے"

مسدود حسن ہنس کر بولیں ـــ بی کس کی اماں بہو کس کی وہ جو کچھ ہے

آپ ہی کی ہے۔ آپ جی کیوں میلا کرتی ہیں۔ چھلا" تو آپ ہی کے ہاتھ دیا
تو یہ میکے والوں کا حق ہوتا ہے"

اس دن بھر جو بیبیاں آئی تھیں اماں بی نے ان سب کو کہلا دیا
کہ — "دیکھو بی چھلے" کی دعوت میں ابھی سے دیے دیتی ہوں — ضرور آنا
دن چڑھے کے ہی آ جانا — گانا بجانا بھی ہوگا"

اماں بی نے چھلے" کی تیاری ایسے اعلیٰ پیمانے پہ شروع کی کہ لوگوں
کو قدیر میاں کی شادی یاد آنے لگی — ولیمے کے کھانے کے علاوہ بھی
تین بار، گاؤں والوں کو عام کھانا دیا گیا تھا — اب کی بار بھی اماں بی
چاہتی تھیں کہ پورے گاؤں کو میٹھا کھلایا جائے — یہ اماں بی کی چال
تھی۔ بھلا وہ صرف میٹھے پہ بات کر سکتی تھیں؟ میٹھے کے نام سے
وہ پیدا کھانا دینے والی تھیں — بڑے سرکار ان کے بیچ میں کیا بولتے۔
جو انھوں نے کہا، انھوں نے مان لیا مگر اب کی بار وہ چپ رہ گئے۔

"اب میں کہتی ہوں چپ کاہے سے لگ گئی؟ چھلا کوئی ہے میرے
بچے کا میں اتنی بھی دھوم نہ کروں" اماں بی کہتیں تو وہ ہی کچھ جواب
میں ہوتا۔ مگر بڑے سرکار کے کانوں پہ بات ضرور ڈال دیا کرتیں۔ اگر ان
کی مرضی نہ ہوتی تو ادھر کا پتہ بھی ادھر نہ کرتیں۔

بڑے سرکار نے ان کی طرف دیکھا اور بولے — "بہت خرچ پڑ
جائے گا"

"ہو تو اللہ میاں کیا کروں؟" — اماں بی کچھ خفا سی اور کچھ بناوٹی

کے انداز سے بولیں ۔۔۔ میں کہوں یہ خرچ کا خیال کب سے ہو گیا ؟

" میں کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر ایسی باتیں عورتوں سے کچھ کرنی تو پڑتی بھی کیا ہے ۔۔۔ سوائے اس کے کہ انہیں بھی خواہ مخواہ پریشان کیا جائے ؟"

اماں بی آگے بڑھ کر خود حیرت سے بولیں ۔۔۔ " کیوں بات کیا ہے ؟"

بڑے سرکار نے بات ٹالنی چاہی ۔۔۔ " یہی کہنا چاہتا ہوں اللہ تک تو جو کچھ کیا، کیا۔ مگر اب تو ہر میاں کی اولاد کا بھی تو دیکھنا ہے۔"

" انشاء اللہ کے دم قدم کی برکت سے ان کی زندگیاں بنیں گی۔ یہ دولت کچھ دے دے کر پار کی فکر سے کیا ادنیٰ ہے ۔۔۔ ہم نے تو ہمیشہ یہی دیکھا کہ اپنی فکر سے کچھ نہیں ہوتا ۔۔۔ اللہ نے چاہا اور گئے ہجرت جو ہجرت سے قبول کر لیا ہو گیا ۔۔۔ اللہ خدا نہ چاہتا تو کچھ ہو سکتا تھا ؟"

" مگر خدا نے بھی تو نہیں کہا تھا کہ فضول خرچی کرو۔ ندی کے پانی کی طرح پیسہ بہا کر فائدہ بھی کیا ہے ۔۔۔ آخر بچوں کے مستقبل کی تعریف میں اچھے سے اچھا لینا ۔۔۔ ؟"

" اللہ کے فضل سے پورے گاؤں میں سب سے زیادہ زمین ہماری ہے۔ اور پھر دروازے بھی کھلے رکھا ہی ہے ۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے لٹائیں تب بھی ختم نہ ہو گا۔ اتنا دیا ہے اللہ نے۔"

" اور بارہ برس بعد کیا کرو گی ۔۔۔ " بڑے سرکار نے کچھ عجیب و غریب سا سوال کیا ۔۔۔

" بارہ برس ۔۔۔ " اماں بی نے کچھ تعجب سے انہیں دیکھا۔

"اگر میں نے بارہ برس کہہ دیا تو کیا اس کا مطلب ہے کہ بیچ بیچ میں بارہ برس میں یا بیر رحمن ختم ہو جائے گا ——؟ ارے واہ آپ بھی آج خوب ذکرے بیٹھے —— اس میں کچھ دیتی ہوں چھلے تو دوغر کے سے ہی ہو گا "

" چھلے کر تو خیر میں منع نہ کروں گا مگر آگے ذرا ہاتھ روکنا پڑے گا "

" ایسے بند لفظوں میں نہ کہیے —— صاف سیدھی بات سناتے کیوں نہیں؟"

" کچھ ہو تو سناؤں "

" پھر کبھی تو زبان نہیں ہلائی —— آج کیوں خیال آگیا "

" اپنی موت کا اور تمہاری زندگی کا خیال آگیا تھا کہ میں نہ ہوں گا تو پھر کیا ہو گا "؟

" توبہ —— ایسی بات نہ کہیے —— جی جل جاتا ہے میرا "

" پھر اصرار کیوں کرتی ہو "؟

" میں نے کچھ کہا بھی —— "؟

" اور کہہ بھی کیا سکتی تھیں —— ؟ مگر جو کچھ کہا میں نے تمہارے اور اپنے بھلے کے لئے کہا "

" ہاں بی اٹھیں اور آگے بڑھ کر بولیں —— اب بھی ! ضرور کوئی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہیں آپ —— سچ بتا دیجئے —— میں آپ کے سکھ کی ساتھی ہوں تو دکھ کی بھی ہوں —— آپ کا چہرہ پریشانی ظاہر کر رہا ہے —— "

جوتے سرکار کچھ دیر تو چپ رہے پھر بولے ——

"کبھی تو نہیں چاہتا تھا ـــ مگر تمہاری ہٹ ہے تو کہنا ہی پڑیگا۔" وہ پھر رک گئے۔

"بات کیا ہے ـــ" اماں بی کا جی ہول گیا۔

"بات کچھ بھی نہیں وہ اپنی کپڑوں کی دکان تھی نا شہر میں، وہ بیٹھ گئی ـــ"

"بیٹھ گئی ـــ؟" اور اماں بی جو کھڑی ہوئی تھیں خود بھی بیٹھ گئیں۔ "آپ نے پہلے تو کبھی ذکر نہ کیا ـــ؟"

"ذکر کر کے لینا بھی کیا تھا ـــ مگر، تم جی چھوٹا کیوں کرتی ہو ـــ ایک دکان ہی تو بیٹھی ہے نا ـــ اللہ مالک ہے کہ اس نے بہت کچھ دے رکھا ہے ـــ"

بڑے سرکار کی محنت لگن اور کام کی دھن ایسی تھی کہ ترقی انہیں چار میں سرخروئی حاصل تھی۔ باپ کی زمین جائداد جو کچھ تھی انہوں نے حصے بخرے کے بعد اپنے ہاتھ میں اٹھائی اور ایک کے سو سو کر کے دکھائے۔

زمین کا تو پھر بھی یہ حال ہوتا ہے کہ سارے کا سارا دارومدار خدا پہ ہوتا ہے ـــ یوں خدا کے بغیر کون کام چلتا ہے مگر زمین کا تو بس یہی کہ بادل گرجے تو پانی برسے اور پانی برسے تو کچھ برسے ـــ ورنہ زمین سوکھی ہے۔ بیج بھی سوکھ گئے ـــ پانی ہی نہ پڑے گا تو بیج کیا پھوٹے گا اور فصل کیا پکے گی ـــ بڑے سرکار بڑے تجربہ اور دور اندیشی سے کاروبار

چلا رہے تھے، گاؤں لیکن زمین سے جو کچھ بھی آمدنی ہوتی گئی اسے پس انداز کرتے گئے — پہلے پہل تو ایسا ہی کیا — زمین پر ہی بھروسہ کئے جانا نادانی ہے — عقلمندی یہی کی کہ جیب بھاری ہوتی گئی تو پھر کاروبار پھیلاتے گئے — چھوٹے پیمانے پر تو شروع کیا۔ مگر خدا پہ بھروسہ رکھ کے اور تن دہی سے محنت کر کے —

کبھی برتنوں کی دوکان کھول دی۔ کبھی بساطی سامان کی۔ کہیں کریانے کی۔ شہر میں سب سے بڑی کپڑوں کی دوکان انہی کی تھی — کرایہ کے آدمی لگا دیئے تھے — اور ان کی نگرانی پر بھروسے کئے۔ گاؤں کے ہی جو پہچان کے آدمی تھے جو حساب کرتے۔ سال بھر کی جانچ پڑتال کے بعد منافع یہاں بھیج دیتے — اور جو بڑی دوکان تھی اس کا حساب ہر مہینے کے مہینے ہوتا —

ادھر جائداد زمین کی آمدنی بھی کم نہ تھی — آس پاس کے دو گاؤں کی تھوڑی بہت زمینیں چھوڑ کر پورے گاؤں انہیں کے تھے۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ بیٹھ کر کھانے سے تو ندی کا پانی بھی پورا نہیں پڑتا۔ مگر اللہ کے فضل سے اب ان کے پاس اتنی جمع جتھا اور اتنی جائداد ضرور ہو گئی تھی کہ اگر خاندان بھر کو بٹھا کر کھاتے اور چار کو کھلاتے تب بھی سالوں پیسہ ختم نہ ہوتا —

دوکان سب سے بڑی ضرور تھی اور اس کا پیسہ اتنا آتا تھا کہ سال بھر زمین کا جوتنا اور بیج ڈالنا سب کچھ ہو جاتا تھا۔ پھر بھی یہ تھا کہ

سود کا ایک پہلو ٹوٹا بھی تو کدھر ۔۔۔ ؟

اماں بی سنبھل کر رو لیں ۔۔۔

" اللہ نے دیا تو ہے مگر یوں چھپکے کر تو نہیں دیا ہوگا بڑے سلوہ نے پھر بھی نہ ہاں نہ ہاں کی تو اماں بی برس پڑی ہیں ۔۔۔

" کچھ دالوں کا منہ دیکھتا ہے۔ کسی کا کچھ نہیں جاتا۔ سنتر ہزار یا، کبھی سرتی کر ان حرامی منشیوں اور منیموں کا کوئی بھروسہ نہیں مگر آپ ایسے اللہ والے کو بھی کر اپنے جیسا سمجھ لیا ۔۔۔ میں کہوں کہ اتنی بڑی دکان کہ جس کے سامنے کسی کی ساکھ نہ تھی۔ ہر ماہ نیا مال اترتا ۔۔۔ وقت پر کام والوں کی تنخواہ جاتی، حساب صاف ہوتا۔ پھر یہ تنزلی تو دیکھیے ۔۔۔ ہائے دیکھ بھال جس کے بھروسے چھوڑا بس چھوڑ ہی دیا۔ پھر بھی پرائی چیز کو اپنا جان کر خیال کرنے لگیں تو پھر اپنے پرائے کا فرق ہی دنیا سے جاتا رہے۔ یہ جو پچھلے برسوں سال کے سال جو آپ شہر کا پھیرا لگاتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ مہینے کے مہینے جو حساب آتا ہے کبھی آپ نے ورق بھی الٹ کر دیکھا کہ کیا آتا ہے کیا جاتا ہے ۔۔۔ ؟ ابھی یہ تو ایک دوکان کا حشر ہوا آپ دیکھیں گے آگے ساری کی ساری جائداد ہی ہوا ہو جائے گی۔ اگر آپ کے بھروسے سے یہی لگا رہے ۔۔۔ حد ہوتی ہے کسی چیز کی ۔۔۔ اتنا بھروسہ بھی کس کام کا؟ آپ کے سامنے ہی آپ کے بھائی ہیں نا؟ دیکھئے کیسے پائی پائی پہ مہر لگاتے ہیں۔"

بڑے سرکار کے ملازم منشی میاں کو تین بیٹے ہوئے تھے۔ دو بیٹیاں تھیں اچھے گھروں میں اور شوہروں کے ساتھ خوش تھیں۔ باپ نے زندگی میں ہی ہاتھ

بیٹے کر دیئے تھے ــــ اں تو مدت ہوئی مر چکی تھیں ــــ باپ کے مرتے ہی نا چاقی ہو گئی، اور جھگڑے پڑ گئے ــــ بچے کی صورت ایسی ہوئی ہے کہ بھائی بھائی کو سلام نہیں کرتا ــــ بہن چولھے پڑ گئے ــــ کام کاج الگ ہو گیا اور بچھڑے ہو کر گھر بھی الگ ہو گئے ــــ

ایک ماں کے پیٹ کے لڑکے ہوئے تھے مگر قسمت ایک جیسی نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے بیٹے قادر میاں ایسے پھلے پھولے کہ دور دور تک ان کی کھیتی باڑی، بیل بڑھیاں مشہور ہو گئیں ــــ گھر کی بیلوں کی جوڑی گھوڑے سے بدلی ــــ دو گھوڑوں کے چار گھوڑے ہوئے اور پیسہ ایسا چھپر پھاڑ کر برسا کہ ہاتھی جھولنے لگا ــــ اور وہی قادر میاں کہ صبح ہی سویرے دو کرایے کے آدمی لے کر اپنی کھیتی کی نگرانی کو جاتے تھے اب چار گھوڑوں کی بگھی پر سواری کرتے تھے ــــ

اللہ میاں نے پانچ انگلیاں ایک سی نہیں بنائیں تو قسمتیں کیوں ایک جیسی بناتا ــــ بے چارے دونوں چھوٹے بھائی مصطفےٰ میاں اور خالق میاں جیسے کے ویسے ہی رہے۔ بس اتنا ہوتا کہ سال بھر کے خرچ کے لئے گھر کی کھیتی سے اناج داخل ہو جاتا ــــ بیلوں کی ایک اور دو جوڑیاں ــــ کام چلاؤ نا گر گہتر ــــ معاملہ ختم ــــ ہاں بس یہ تھا کہ اپنی اپنی حال روٹی سے راضی خوش تھے ــــ

قادر میاں تو دو تختوں کو کھلا کر کھاتے تو یہ تو ان کے اپنے ماں جائے تھے ــــ دیکھا کہاں جاتا۔ وہ تو ان بی کو تو وہ وقت یاد تھا دوسرے

کو مرے دس دن بھی نہیں ہوئے ہیں — چالیس دن ہوئے تو ابھی دن پڑے ہیں کہ ادھر دیورانیاں کھسر پھسر کرنے لگیں — کھانا پکتا ہے تو تینوں حصوں میں بٹ جاتا ہے — جدھر کا حصہ ادھر، قادر میاں تو سدا سے ہی دل کے بڑے تھے — اور بڑے دل یہ نہیں دیکھتے کہ ہاتھ کھلا ہونے کے لیے پیسے چاہئے یا نہیں؟ دل میں وسعت ہے بس ہے — کوئی پاس پڑوس والا آیا انہوں نے ساتھ بٹھا لیا — کوئی دو گھڑی بات کرنے کو آیا اور انہوں نے ہاتھ پکڑ کر ابھر کٹورا دودھ کا پلا دیا — ماں باپ کے رہتے تک یہ باتیں چل گئیں اب تین بھائیوں کی کھیتی تھی، جس کا دل بڑا تھا وہ رئیس زادہ ہوتا تو ایک بات بھی تھی، یہاں تو مروت میں بھی کے پیٹ پر لات پڑتی تھی — اور ایسا دل والا تو دو دنوں میں سے کوئی دن تھا کہ سہار جاتا —

اب کے چالیسویں کی فاتحہ ہوئی نہیں کہ دیورانیاں ہاتھ لمبے کر کے جٹھانی کو رلانے لگیں —

"اری — جنم مرن کی ساتھی بنی ہو تو اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میاں کے ہاتھ پہ روک لگا دیں — جیب میں پھوٹی دمڑی نہیں اور ہاتھ ایسا اونچا کہ بس حاتم طائی انہی کا باپ تھا..."

اماں بی کو منہ اونچا کر کے لڑنا جھگڑنا کبھی نہ آیا — ماں باپ کی تعلیم ایسی تھی کہ میاں سے لگائی بجھائی بھی نہ کرتیں، حق ناحق تو اوپر والا خود دیکھ لیتا ہے — قادر میاں بڑے تھے — دل کے بھی بڑے

اور بھیا جیون سا ہی ، بھی سب سے بڑے ـــ ہر طرح دیے جاتے۔
ماں باپ کے بعد وہی تو تھے جو ان چھوٹوں کے سر پر موجود تھے۔ چھوٹے
بھی سوال اپنا جانتے تب ـــ مگر ان کی سرشت میں نہ تھا کہ منہ
موڑتے ـــ شادی کر دن گذر گئے تھے ـــ روپے پیسے کی کوئی
خاص کمی نہیں نہ تھی ـــ بلکہ بیچ جو بھی تو تنگی ہی تھی ـــ مگر جب
بھی مشترک ماں باپ چھوٹے روپیہ لوٹنے لگے بند جمع پونجی رہتے ـــ ماں باپ
کی زندگی میں گذر نہ تھی ۔ اب تو سب کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ۔

وفاداری شکایت یعنی سے ایک وہم آ گیا اور آخر کار بھیا بڑھ گیا۔
جس وقت سے ان بھائی بہنوں میں ، والد صاحب کی یہ حالت تھی کہ روتے
[illegible] ـــ [illegible] کی طرح [illegible] کے بچیاں
لیے جاتے ہیں گھر سے ایک لفظ نہیں کہتے ـــ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو
بیٹے سے کہہ دیا جائے [illegible] ـــ سامان کی فہرست اٹھا کر ہی اتنا لے

[illegible] حقیر سے پیسے کے لئے آج تم ان نحوں
تک [illegible] پڑ رہا ہے ، بھائی بھائی لڑتے ہیں ہم ان کی بھی چاہت
نہ ہو [illegible] پھر بھی میں تجھ سے مانگتی ہوں ـــ لگتا ہوں کہ اتنا
تو کھول [illegible] بچھڑے دل پھر مل جائیں گے

رحمت [illegible] کھول کے اللہ نے بھی برسات
شروع کی ـــ ایسا برسا ایسا برسا کہ سارے میل دھل گئے۔ وہی
بھائی اب تو ہاتھ کھینچے نہیں [illegible] بیچ کر آتے اور لد لد کر جاتے۔

قادر میاں کا دل بھی کیا دل تھا کوئی کدورت ان کے دل میں ٹکی نہ رہتی تھی!

برسات کے پانی سے جیسے ڈابروں پر لگی دھول خاک کیسے بہہ جاتی ہے۔ ان کے بھائیوں کے آنسوؤں نے بھی ان کے دل پر جمی ہوئی غم اور میل کی تہہ کو بہا دیا ——

خدا نے فرش سے اٹھا کے عرش پر بٹھا دیا اور اب گاؤں بھر میں غنی میاں کے بیٹوں کی ہستی باقی تھی اور سب سے بڑھ کر قادر میاں کی —— جدھر دیکھو، جس کے منہ سے سنو بس قادر میاں کی تعریف اچھی کا ذکر۔ —— قادر میاں جو غنی میاں کے بیٹے تھے اور جن کے پاس کیا تھا —— ؟ لے دے کے دو چار بیگھے زمین —— بیلوں کی مریل سی جوڑی دو ایک چھوٹے جانور اور قرضے پر لی ہوئی ایک بھینس —— ؟

مصطفےٰ میاں اور صادق میاں کا یہ حال تھا کہ ہاتھوں سے پیسے پکڑتے —— ایک پائی ادھر کی ادھر نہ ہوتی اور ادھر بڑے سرکار تھے کہ ہزاروں ادھر کے ادھر ہو جاتے اور پیشانی پر شکن نہ پڑتی۔

راگ راگ زندگی!

تحیلہ جیسی دھوم دھام سے ہونا تھا ویسے ہی ہوا۔ رتی برابر بھی فرق نہ پڑا ـــــ مگر اماں بی کے دل کو جیسے پھانس سی لگ گئی تھی۔ بڑی ماں کی شادی ابھی ہونی تھی ـــــ اور اماں بی کے ہاتھ کی شادیاں تو مشہور تھیں ـــــ شادی کرنا تھا مطلب گھر لٹا دینا۔

بری کا نام اماں بی نے دلہن پاشا کے نام کے وزن پر صفیہ تھا۔ صفیہ اب گھٹنوں سے رینگتی پھرتی تھی ـــــ منہ کھول کے ہاہا کر کے ہنستی ـــــ اماں کے دودھ پر پل پل کر مست ہو رہی تھی ـــــ ابھی کھڑا ہونا بھی نہ سیکھا تھا کہ دلہن پاشا پھر دو جی سے تھیں۔

انیس میاں کی اماں کو تو فالج مار گیا ـــــ اللہ اللہ وہ اپنی دم توڑتی

زندگی کا واسطہ دے دے کر شادی طے کر دینے کو کہنے لگیں ۔
گردی ماں کی عمر بھی ابھی کیا تھی؟ گڑیا کھیلنا بھی تو ابھی ابھی چھوٹا تھا ۔۔۔ چھاتیوں میں اب کہیں ابھار آ رہا تھا ۔۔۔ بھائی کی شادی سے دو ماہ قبل اماں بی نے اس کی چولی چڑھائی تھی ۔۔۔

بڑے سرکار کی اولاد میں سب سے چھوٹی، سب سے خوبصورت اور گھر بھر کی لاڈلی ۔۔۔ باپ تو جان نثار کرتے ۔

شادی کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی ۔ نہ جہیز کا جھگڑا نہ جوڑے کا رگڑا ۔۔۔ اماں بی نے تو اپنی دونوں بیٹیوں کے جہیز دونوں پہلے تیار کر رکھے تھے ۔۔۔ قادر میاں کے دم قدم کی برکت سے جب گھر بھرنے لگا ۔ تو اماں بی نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ بیٹیوں کا جہیز جوڑا ۔۔۔ رقیہ کی شادی تو سولھویں برس کر دی ۔۔۔ اپنے گھر خوش تھی ۔ میاں بی بی میں ایسی محبت تھی کہ پل بھر بھی میاں نہ چھوڑتے ۔ بھائی کی شادی جیسی شادی ہوئی کہ دور دور کے رشتہ داروں کو بھی اماں بی نے ہفتوں پہلے بلا لیا مگر خود بہن شادی سے چار دن پہلے آ گئیں ۔۔۔ رت جگے میں بھی شامل نہ رہی ۔۔۔ پہلے تو اکیلی ہی آ جاتی مگر میاں اپنے کاروبار کی دیکھ ریکھ میں پھنسے ہوئے تھے اور انہیں یہ کب گوارہ تھا کہ ان کا بچہ بھی آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ۔۔۔؟

اب گردی ماں کی شادی کرنے میں کیا رکاوٹ تھی ؟ مگر اماں بابا دونوں کا دل کہتا تھا کہ ابھی تو اس کے کھانے کھیلنے کے دن ہیں ۔

گیت گانے کے دن ہیں ــــ روٹھیوں کی زندگی کا یہی دور تو ہوتا ہے کہ وہ جی بھر کے خوشیاں سمیٹتی ہیں ــــ اگر یہ دن گزر جاتے تو پوری یہ زندگی پھر کہاں ؟ پھر زندگی کی ذمہ داریاں اور الجھنیں ــــ پڑ گئیں تو کیا زندگی کا مزہ آئے گا ــــ ؟

انیس میاں چار بیٹیوں سے بڑے تھے اور گویا گھر کی ماں کو بڑی جہاد جیسا کر کے ــــ پال جاتا تھا ــــ بڑی بہو بن کر جانا تو اپنے ارمانوں کا خون کرنا ہوتا ہے ــــ ان اب کسی کی فکر نہیں رکھتے ــــ ساس سسر کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام تر بار بڑے بیٹے اور بڑی بہو پر ہی آتی پڑتا ہے ــــ چھوٹے بیٹے ذرا سی جھڑکی دے ــــ تو تھا جیسے سب کچھ سہن کرنا اور منہ سے اف بھی نہ کرنا ــــ اگر برداشت سے باہر ہو گئے تو سسرال والے یا پشت بھر کی تعلیم ہرگز بھر کی بنا کر اچھالتے ہی ہیں محلے ٹولے پاس پڑوس والے بھی کچھ کم نہیں کرتے ؟

اماں بی اور بڑے سرکار ـ کا ٹھیک ہی تو کہنا تھا ــــ اپنی جگہ تو یہ ٹھیک تھے اور ادھر گھر کی ماں کی ساس کو فالج مار گیا تھا ــــ موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ ہے ــــ موت آ گئی تو اچھے بھلے جان جوان چٹ پٹ ہو جاتے ہیں اور نہیں تو بڈھے کھوسٹ بیٹھے موج مناتے ہیں ۔

یہ کون جانتا تھا کہ قسمت میں قضا اب لکھی ہے ؟ گھر بھر میں بدھو بچھو ادھر بس بیٹیوں ہی بیٹیوں کے منہ دکھائی پڑتے ۔ اندھے کی ایک ہی تو لاٹھی تھی ۔ اک رس کا سہرا بھی دیکھا تو ان سے بڑھ کر

بدنصیب اور کون ہوتا بھلا ——— ہمیشہ سے ہی تو دل بہلانے لگے، بیوی
کی حالت تو دیکھ ہی رہے تھے اور پھر بیٹے تھے کہ سانڈ بنے گھومتے تھے
باسیوں سے بادام اور چرونجیاں کھلا کھلا کر مرغ تیتر اور بٹیر لڑایا کرتے
باپ بیٹوں بھی زیادہ زور دے رہے تھے کہ شادی کی بیڑی پاؤں میں
پڑے گی تو گھر میں دل لگے گا اور یوں باپ کے کام کاج میں ہاتھ بٹائیں گے۔

نانی بی تو سن کر خاموش رہ گئیں ——— بیٹی کے پیدا ہوتے ہی
اس کو احساس ہو جاتا ہے کہ کسی نہ کسی دن اُسے جُدا ہونا ہے ——— یہی خیال
لئے لئے وہ اس کی پرورش کرتی ہے اور ہر دم مہمان سمجھتی ہے ——— مہمان
کسی کا گھر بار اپنے تو نہیں آتا! وہ اس سے دل لگا کر ناکرہ ——— ؟
مگر بڑے سرکار کا دل چھوٹا ہو گیا ——— گوری بی ان کے دل کا چین
تھی ——— دل کی ٹھنڈک تھی ——— دن بھر میں جب تک دو ایک بار
اسے پاس بلا کر اس کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ نہ پھیر لیتے انہیں چین
نہ پڑتا ——— اور ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی ——— ؟ چھوٹا سا ذہن تھا ———
باپ کے پاس آکر بیٹھتی تو وہ اپنی گود میں بٹھا لیتے ——— اس کی جدائی
سہار کیسے ہو گی بھلا ——— ؟ بوڑھا دل یہ سب کچھ کیسے برداشت کر
پائے گا ——— ؟ جدائی کے غم سے پھٹ نہ پڑے گا ——— ؟

بیٹی اور زمین میں پڑے بیج سے کبھی آس نہ رکھنی چاہئے ——— بیٹی،
کون جانے کب پیا کے دیس چلی جائے، بیج کا کیا ہے، دل کی آس پاس
سے بدل جائے پانی نہ پڑے تو وہیں جل جائے ——— ایسی چیز لگا

سے دل لگا کر بنا بھی کیا ہے ــــ ؟

مرے مرے دنوں سے ماں باپ نے بیٹی کی شادی کی تیاری کرنی شروع کر دی ــــ

شادی میں ابھی دن باقی تھے ــــ تاریخ طے نہیں ہوئی تھی مگر جمادالثانی کا مہینہ سوچ لیا گیا تھا۔

دو ایک ماہ قبل اماں بی مغلانی بی سے نئے جوڑوں پر مسالہ ٹکیاں ٹنکوا رہی بیٹھی تھیں کہ چوڑی والی آ گئی ــــ

گاؤں کی زندگی میں چوڑی والی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ گھر گھر جانا ہوتا ہے، ہر گھر کی بری بھلی سے معلوم رہتی ہے ــــ چوڑیوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ گئی اور مغلانی بی سے بولی۔

"اے بی کس کے جوڑے پاگھوں پر ٹنکائی ہو رہی ہے۔"

مغلانی بی نے بے زاری سے اسے دیکھا اور ناک چڑھا کر بولیں۔

"دوری کیا نہیں جانتی ہے جیسے پتہ ہی نہ ہوگا کہ چھوٹی بی بی کا گھر بسنے والا ہے۔"

چوڑیوں کے گالے زمین پر ڈالتی ہوئی بولی۔

"معلوم کیسے نہیں ہے ــــ پر میں بھی ــــ وہ چپ رہ گئی۔

اماں بی نے چونک کر سر اٹھایا اور بولیں۔

"پر تو کیا بھی ــــ ؟

وہ یونہی چوڑیاں الٹ پلٹ کرتی ہوئی بولی۔

"میں یہ سمجھی شاید بات ٹوٹ گئی ہوگی"۔

"اے ہے — بی بی چلاّئیں — "زبان سنبھال کر بات کرنا ذرا — موئی ان کمینیوں کو کبھی گھر نہ گھسنے دینا چاہیے — چل جو زبان پہ آیا بکتی ہوئی — بات ٹوٹے تیرے سگوں کی — بی بی کا نام کیوں بیچ میں لاتی ہے"؟

"اوئی بی تم تو ہوا سے لڑتی ہو — میں نے کیا بری بات کہی بھلا — سنا ہے اللو میاں پہ باپ نے روک لگا دی ہے ادھر ادھر کی ٹوہ لینے لگے ہیں — دن بھر گلی کے لونڈے ڈبا اور مرغ تیتر، بٹیر، ہم غریب آدمی کیا کسی کا بگاڑیں گے۔ ہم سمجھے کہ بڑے سرکار بھلا دیکھتے بھالتے اپنی بیٹی کیوں ایسی جگہ دیں گے جس کی ساری محلے ٹولے میں بدنامی ہو رہی ہے"۔

مغلانی بی نے ہاتھ روک کر پوچھا — "ٹوہ سے تیرا کیا مطلب ہے"؟

"گھر گھر جھانک کر اصیل مرغ خریدتے پھرتے ہیں اور اصل میں مرغوں کا تو نام ہے بی..... وہ چپ رہ گئی — آئینہ تو اپنا ہی عکس لوٹاتا ہے اس میں الجھنے کی کون بات —؟

گاؤں یا شہر — شریفوں کے بیٹوں کا چلن ہوتا ہے کہ بچپن میں تو تعلیم حاصل کی — بڑے ہوتے تو مدرسے یا انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے — ذرا داڑھی مونچھ نکلی کہ ماں باپ نے جگہ دیکھ سمجھ کے شادی رچا دی۔ اپنے دھندوں میں پھنسے، دو چار بال بچے ہو گئے

تو آپ ہی پابند ہو گئے ـــــ ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے تو انسان کبھی نہیں بھٹک سکتا ـــــ پھر بھی ہوتا ہے کہ باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں ـــ

اماں بی نے عطیہ بی بی کو دیکھا اور عطیہ بی بی نے اماں کو ـــ بات ایک کے بھی منہ سے نہ نکلی ـــ

اماں بی کے دل کو جیسے پنکھے لگ گئے۔ گھر چاہے لاکھ بھرا پرا ہو مگر کوئی تو دل والا ملے کہ جس سے دل کی بات کہہ کر بوجھ ہلکا کیا جائے ـ خورشید بیگم ایسی تھیں کہ فکر اور پریشانی کی بات کو بھی رنگ دے دیتیں ـ مگر وہ اپنے گھر کی ٹھہریں بھلا کاہے کو بار بار آتیں ـــ وہ تو شادی کے وقت ہی اماں بی نے چار چھ دن روک لیا تو لطیف میاں نے گھر سارا سر پہ اٹھا لیا ـ

کب آ رہی ہو، کب آؤ گی ؟

بار بار آدمی بھجواتے کہ کب تک ٹھہرنا ہوگا ـــ ؟ وہ جو کہیں تو کوئی بری سی بات سمجھا جائیں ـــ اب ذرا نہ دکھائی دیتا تھا ـــ کس سے دل کی بات کہیں ـــ ؟ ان لڑکیوں اور ڈاکٹروں کا بازار ضرور تھا ـــ آخر بھی کر اپنے گھر بار کی فکر تھی ـــ اماں بی، کوئی ملنے کو آتا تو چار دن کی جگہ چار ہفتے روک لیتیں مگر کوئی کب تک رہ سکتا ہے ـــ ؟ یوں تو آنے جانے والوں سے حویلی بھری رہتی مگر دل کا زخم کیسے دکھایا جائے کہ وہ چھپایا بھی نہ رکھ سکے ـــ

چھڑی والی تو نوکرانیوں، بھتیجوں کو لگ گئیں، پیلی، پیلی چوڑیاں پہناتی گئی مگر آناں بی کی آنکھوں سے سیاہیاں بکھیرتی گئی — بڑے سرکار کے علاوہ اور کس سے بات ہو سکتی تھی۔ آپ ہی تو بیٹی کا اچھا برا سوچ سکتے تھے —

"اب سوچنے سے کیا ہو سکتا ہے؟"

آناں بی نے دیکھا ان کی آنکھوں میں نمی پیدا ہو رہی تھی۔ کڑوی سے کڑوی بات سہہ جاتے، بڑی سے بڑی مصیبت وہ جھیل جاتے مگر کبھی بڑے سرکار کی آنکھ نم نہ ہوتی — یہ کیسی بدلی تھی جو ان کی آنکھوں میں بسیرا ڈھونڈ رہی تھی —؟

"تمہارا اپنا دل کیا کہتا ہے بھلا — انھوں نے رندھے گلے سے پوچھا —

"میری تو عقل چٹ ہو گئی بھائی، اسی لئے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ مجھے تو اپنا آپا یاد نہیں رہ گیا ہے۔"

"پھر بھی — فکر یہ انسان ہی کو گھیرتی — اور انسان ہی اس کا حل بھی ڈھونڈتا ہے۔"

"اگر بات توڑ لیں تو —؟"

بڑے سرکار زور سے اٹھے اور پھر بیٹھ گئے — بڑی گھٹی ہوئی آواز میں بولے — اگر بات توڑ لیں تو —؟

یہ الفاظ تمہاری زبان سے نکلے ہیں بیگم — یہ تمہاری زبان

ہے —؟ تم نے یہ پانچ الفاظ کہہ تو دیے مگر یہ بھول گئیں کہ الفاظ کے
پیچھے ایک عمارت ہے — ایک عظیم الشان عمارت جو دھڑام سے
گر پڑے گی — زبان کی — عزت کی، — اپنے قول کی۔ تمہیں
خیال نہ آیا بیگم کہ یہ عمارت گر پڑے گی —؟

وہ رک رک کے لہجے میں دھیمے مگر پُروقار آواز میں کہنے لگے۔
• کیا بات اتنی آسانی سے ٹوٹ جایا کرتی ہے جب کہ چار لوگوں کے
سامنے بیٹی قبول کی جا چکی تھی — منگنی کے کپڑے اس کے ہاتھوں میں
اتنے دنوں سے ہیں کہ اس کے کنگورے گھس چکے ہیں اور اب تم کہتی ہو
کہ بات توڑ لیں گے —؟ انسان کی عزت قول اور زبان کا بھی
دنیا میں کچھ پاس ہوا کرتا ہے — کیا یہ سب کچھ ممکن ہے جو تم نے کہا؟

• میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ رہی ہوں — کچھ سوجھائی نہیں
دے رہا مجھے — امّاں بی گھٹے ہوئے لہجے میں بولیں۔

• مطلب — میرا مطلب بس اتنا ہے کہ یہ تو انو میاں کے بگڑنے
سدھرنے کا سوال ہے میں تو کہتا ہوں کہ اگر وہ میرے منہ میں خاک
مر بھی جائیں تو بھی ان کی لاش سے ہی گڈی راں کی شادی ہو گی کیا
ہم لوگوں کو اپنے پرایوں کے سامنے ہیٹا پڑنا ہے — کیا ہم ایک بیٹی
کے لئے اپنی عزت کھو دیں گے —؟؟

امّاں بی تیزی سے بولیں —

• تو کیا عزت کے لئے اپنی بیٹی کو کھو دیں گے —؟

"بیٹی کیسے کھو سکتی ہے — ؟ ہاں تم اپنی بات سے نہ ٹلیں گے؟"

"اور جو تمام عمر جلتی رہی تو — ؟ پھر کیا ہوگا؟"

بڑے سرکار نے ٹھنڈی سانس لی۔

"تم یہ بتاؤ اگر شادی کے بعد اقو میاں اوندھے سیدھے چکر میں پڑ جاتے تو تم کیا کر لیتیں؟ کیا بیٹی کو گھر بٹھا لیتیں کیا اسے طلاق دلوا لیتیں — تم کو کیا — مجھے بھی تو کچھ معلوم ہو۔"

"غیب کا حال تو اللہ کو معلوم مگر اب تو کوئی نہ کوئی حل سوچیں۔ آپ نے تو بیٹی کو جیسے دمڑی کی سبزی بھاجی سمجھ لیا ہے — پڑی تو کیا سڑی تو کیا۔"

"پڑنے سڑنے کا سوال نہیں ہے بیگم۔ تمہاری ہماری عزت کا سوال ہے —" وہ ٹہل ٹہل کر، اونچے اونچے ہاتھ اٹھا کر بات کر رہے تھے — کھڑے ہو کر بولے۔

"تم جانتی ہو بیگم ہم گاؤں کے راجہ کہلاتے ہیں اور راجہ کی کیا عزت ہوتی ہے! تم نہیں جانتیں — ؟ بیٹا بیٹی کا معاملہ اہم ہوتا ہے میں مانتا ہوں مگر یہ تو تم بھی مانو گی کہ عزت کا معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے — اپنی بگھی پر سوار چار لوگوں کے سامنے سے گزروں گا تو تم ہی سوچو کیا میں یہ برداشت کر سکوں گا کہ زمانے کے انجانے لوگ میری طرف انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہیں۔

"وہ دیکھو بڑے سرکار — جنہوں نے اپنی بیٹی کی بات توڑ دی۔"

"ارے یہی ہیں وہ — واہ خوب تشریف ہیں ہے"

"یہ عزت آج نہیں بی بیگم — والد مرحوم لاکھ غریب تھے مگر عزت والے تھے — بڑے بڑے زمیندار صاحب! مجھے یاد ہے جب تو میں چھوٹا سا تھا بستیوں میں رکا پھرتا تھا — کہ جب کبھی والد مرحوم ان کی بیٹھک کے سامنے سے گذرتے تو خود کھڑے ہو کر جھک کر سلام کرتے۔ اور پھر آج — کہ خدا نے اپنے فضل سے ہمیں مالا مال بھی کیا ہے حیثیت ہے کہ ہم جہاں قدم رکھتے ہیں۔ گاؤں والے اس جگہ کی خاک اٹھا کر سر پر رکھ دیتے ہیں — کیا یہ عزت یونہی لٹ جائے گی بی بی؟"

اماں بی کا سر کانپ رہا تھا — وہ منہ سے کچھ نہ بول پا رہی تھیں —

"مگر گوری ماں کا خیال آتا ہے تو میرا کلیجہ کانپنے لگتا ہے — وہ میری آنکھوں کا تارا ہے — مگر کیا جانے میں اپنی آنکھوں کی موت سے دیکھتا ہوں — نہیں یہ میری گوری ماں ہے جس کی موت سے میں جیتا ہوں — میں کیا چاہوں گا کہ اپنی لاڈلی کو عمر بھر کا روگ دے دوں —"

"مگر تم جانتی ہو کہ آج اس کی بات ٹوٹی تو پھر کہیں نہ جڑے گی۔ بات ٹوٹنے کے بعد لڑکے والے بھی پھر جاتے ہیں — کہیں — تم نے زندگی دیکھی ہے — اونچ نیچ سے واقف ہو — پھر مجھ سے کیا پوچھتی ہو بیگم —"

سفید بالوں بھرا سر اور آنسوؤں سے جل تھل آنکھیں بڑے سرکار کے سامنے تھیں —— یہ سفیدی ان کے دیکھتے دیکھتے ہی بی امّاں کے سر پر چھا گئی تھی —— کیسے کیسے زمانے نہیں بیتے تھے لیکن کبھی بڑے سرکار ان آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتے جو اب مسلسل برسنے کو مچل رہی تھیں —— ؟؟

امّاں بی کے ہونٹ کانپنے لگے —— تیزی سے آنسو ان کی آنکھوں سے گر کر جھریوں سے گرنے لگے ۔

نہیں نہیں —— آپ کی عزت میری عزت ہے۔ آپ کی زندگی میری زندگی —— آپ جیسا بھی کہیں گے ویسا ہی ہو گا —— میں کبھی آپ کے کہنے سے باہر نہیں گئی اور کبھی جاؤں گی بھی نہیں —— کبھی نہیں —— کبھی بھی نہیں —— میں آپ کے سہارے سے اس گھر میں آئی اور آپ ہی کے سہارے اس گھر سے جاؤں گی —— یہ تو ایک چھوٹی سی سوال ہے اگر میرے ہزار بیٹیاں ہوتیں تو میں انہیں بھی خوشی خوشی آپ کی بات کے لئے، آپ کی عزت کے لئے وار دیتی ۔

امّاں بی نے ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہیں کی جو مدتوں سے ان کی پلکوں میں سمٹے ہوئے تھے ۔ بڑے سرکار کا سر جھک گیا تھا اور ان کی سفید داڑھی میں کئی قطرے گھل مل رہے تھے ۔

رنگ رنگ زندگی

اماں بی نے ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش نہیں کی جو مدتوں سے ان کی پلکوں میں سوئے ہوئے تھے۔ بڑے سرکار کا سر جھکا ہوا تھا اور ان کی سفید داڑھی میں نمکین قطرے گھل مل رہے تھے —

جی ہاں — انہوں نے بصد مشکل کہنا شروع کیا — تو میری بیٹی ہے — میرے خون میرے ہی انگ میرے ہی گوشت پوست کا ایک حصہ — میری ہی سی عادتیں تجھ میں ہیں — اقو میاں کو اپنا سر کا تاج سمجھنا۔ اس تاج کی عزت تجھ ہی سے ہے — چھوٹی بڑی بات پر کبھی اپنا جی میلا نہ کرنا میری جان — جیتی جی زندگی میں بھی کچھ جھیلنا پڑے تو بیٹی — اپنے باپ کی عزت رکھ لینا میری گڑیا۔ اس کی بات کی لاج رکھنا —

ایک دن تھا کہ قدیر میاں کی شادی رچی تھی۔ یوں ہی گھر بھرا تھا — اماں بی کیسی خوش تھیں —! بڑے سرکار کتنے مطمئن! بہو لانے اور بیٹی بیاہنے میں کتنا فرق ہوتا ہے —! ویسے ہی مہمان وہی ہنگامے، وہی رسوم دھڑکے، وہی کھانے والے کی چیخ پکار، وہی باجوں گاجوں کے ڈھماکے — میراثنوں کے ڈھول، پائل، رخصتیاں کیسا دل خراش منظر تھا —!!

پانچ دن سے جہاں گوری ماں دلہن بنی بیٹھی تھی وہ پیلی پیلی ریشمی چادر اور پھولوں ڈھکا پلنگ اب سنسان ویران سا پڑا تھا۔ ابھی ابھی پانچ بجے کے لگ بھگ دولہا والوں کے ہاں سے لال لال جوڑا آیا تھا — گوری ماں کو اس پیلے پلنگ سے اٹھا کر غسل کرایا گیا۔ پھولوں کے گہنوں اور چاندی سونے کے جھمکا جھول زیوروں سے لاد دیا گیا — لال لال جوڑا پہنا کر اسے منڈپ میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ اور ادھر اندر کمروں میں سناٹا پڑ گیا — ساری رونق کھنچ کر منڈپ میں آ گئی۔ جہاں عورتوں کے ہجوم میں دولہا گھرا تھا۔

اماں بی بے حال ہوتی جا رہی تھیں — ایک بڑی بی نے انہیں گلے لگا کر دلاسہ دیا۔

"روؤ مت بی بی — گھبرانے جیسی بات ہے، یہ تو دنیا کی ریت ہے۔ بڑے بڑے پیغمبروں تک نے اپنی بیٹیاں نہیں بٹھائیں کہ یہی دنیا کا چلن ہے تو ہم تم کس شمار میں ہیں؟ — دل چھوٹا نہ کرو بی۔

بچی کی طرف دیکھو اس کا بھی کیا کہنا ہوگا۔ اس آنگن کی کھیل پلی
بڑھی اب ساتھ چھوڑنے کو ہے۔ بھائی چند اداس سے، ماں پژمردہ
باپ اور بہن کی آنکھیں سدا ہنستی رہتی تھیں اب آنسو بھرے کھڑے
ہیں۔ اس کے دل کا تو خیال کرو بی بی ــــ ابھی ڈولی چڑھے گی تو
شرم وحجاب بالائے طاق رکھ کر وہ اٹھا اٹھا کے جھانکے گی کہ ماں
کی آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں ــــ باپ دھاڑیں مار رہے ہیں ــــ
بھتیجا بھتیجی پچھاڑیں کھاتے ہیں اور بہن ہے کہ دل کی آہ دل میں دبائے چپکے
چپکے روئے جاتی ہے ــــ

بڑے سرکار بمشکل دو چار جملے کہہ کر ہٹ گئے ــــ اور پھر
عورتوں نے خود ہی سے گانا شروع کر دیا۔ خالائیں، پھوپھیاں، بہنیں
سکھیوں نے مل جل کر دلہن کو رلایا اور خود بھی رو دیں ــــ ساعت
گھڑی ہونے لگی تو رہاو والوں نے جلدی مچا دی ــــ

قدیر میاں ڈولی کے پاس کھڑے چپکے چپکے روئے جاتے تھے
صنوبر تو ریحانہ سے لپٹ گئی۔ ننھی سی جان ہمیشہ بچی پلی ہوتی تھی
سب کو روتا چلاتا دیکھا تو سہم گئی۔ سارے بندھن ٹوٹ گئے اور
آنکھیں جو گھٹے سے بٹھا کر رکھی تھیں ان سے ندیاں بہا دیں ــــ

رقیہ ماں آئیں ــــ بہن کو دم دلاسہ تو کیا دیتیں گھونگھٹ
اٹھا کر چاند سا مکھڑا دیکھا اور لپٹ پڑیں۔ جب سے رخصتی کی دھوم
مچی تھی یہ حال تھا ان کا جان کر جا تیں۔ ان کا آنسو بھرا چہرہ اور

بوڑھے باپ کی دبی دبی ہچکیاں ان سے دیکھی نہ جاتی تھیں۔ بھتا تھے
ر عورتوں کی طرح بغیر کسی شرم وحیا کے پھکو پھکو روئے جاتے تھے۔ ؟
گوری آج بچپن کی سہیلیاں بچھڑتی ہیں — رقیہ ماں کے منہ سے ان لفظوں کا نکلنا تھا کہ ہماں بیبیوں کی دبی سہمی چیخیں نکل گئیں۔

باہر دھما دھم ڈھول پٹ رہے تھے — پٹاخ پٹاخ پٹاخوں کی آوازیں آرہی تھیں —

اللہ میاں نے ہلکی پھلکی گوری ماں کو گود میں اٹھایا اور دھیرے دھیرے چلنے لگے — پھر کمنٹ کے پاس ان کا جوتا کھڑا گیا — اور وہ چھک پڑے۔

پیچھے سے کوئی بڑھیا دھیرے سے بولی۔

" تھکے کہار بنے ہو میاں اتنے سے بوجھ پر — یہ زندگی کا بوجھ اللہ رکھی ہے، جو تم سے سنبھلے —؟

ماں کا منہ دیکھ کر اللہ میاں پھسل پڑے — وہ مرغ، تیتر، بٹیر سب بھرا ہوتے — اور سارا وقت بی بی گود میں بسر ہونے لگا۔ ماں اب مطمئن تھیں کہ گھر میں اب بہو آگئی۔ نندیں خوش کہ بھاوج ٹی۔ بڑے میاں بشاش کہ اب بیٹا راہ راست پر آجائے گا — اللہ میاں کا کیا تھا — بیساری، دھر گئیں آکر گوری ماں کے دل میں بس گئیں — چاند کی چاندنیاں لاکھ چمکدار سہی مگر ان میں پائیداری کہاں ہوتی ہے۔

ابھی پونم ہے تو ابھی اماوس —— ایسی چمک کرے کر چاند تھا جس
کے پہلو سے بھیانک اندھیرا لپٹا ہوا تھا —؟ ایسی جھما جھم چمک سے
تو وہ مدھم مدھم اجیارا بھلا جو عمر بھر ساتھ تو دے جائے۔

بچے نئے نئے کھلونے رنگین کھلونے کو دیکھ کر ہمک اٹھتا ہے۔
چار گھڑی کھیل لیا اور دل کھٹا پڑ گیا — پھر ادھر ادھر نگاہیں بھٹکنے
لگتی ہیں کہ نئی چیز کہاں سے ملے —؟

گوری ماں رنگ دار کھلونا تھی اور اتو میاں بچے — چار گھڑی کھیل
لیا اور دل پھر اداس تھا — اب کہاں سے نیا کھلونا ہے گلی کوچے
میں چل کر تلاش کرو، بہت مل جاتے ہیں — تیتر بٹیر ایک طرف ہے
ان کے آگے پیچھے لونڈوں کا وہ جھنڈ رہتا معلوم ہوتا مداری ہیں۔ بندر
نچانے چلے آرہے ہیں — ایک ہاتھوں میں مرغا ہے، دوسرے ہاتھ کی
ہتھیلی میں مرغ کے لئے پسی کی کرچیاں — کھلا رہے ہیں اور چبوترے
پر بیٹھ کر چلا رہے ہیں —

"ارے ہے کوئی لڑانے والا"

"ارے ہے کوئی مقابلے پہ آنے والا"

بگڑے دل شاہزادوں کی کون کمی — کوئی نہ کوئی چلا ہی آتا ہے
اور پھر وہ دنگا مچتا کہ بس الامان! جاتی مرغ لڑ رہے ہیں اور ان کے
مالک ان سے بڑھ کر لڑ رہے ہیں۔

گوری ماں کو یہ باتیں کہاں بھا سکتی تھیں؟ اپنا گھر یاد آتا تھا۔

وہاں ایسے دنگے تھے نہ اوٹ پٹانگ حرکتیں —— نہ کری فکر نہ کوئی پریشانی —— یہاں بھی پیسے کچھ کم نہ تھا۔ نوکر چاکر بھی ہاتھ باندھ کو پاؤں پاؤں کو تھے —— کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ مگر پتا کیا تھا ابھی کس سام کا کہ رنگ دنگے —— ہر چیز میں کسی چیز کی کمی —— یہ کمی کیا تھی یہ اس کا معصوم دل جان نہ پاتا ——

ادھو میاں گھڑے جوان تھے، مضبوط ہاتھ پاؤں کے آدمی۔ گوری ماں کیا تھی —— دھان پان سی، نازک جیسے چھوئی موئی —— رات کو پاس آتے تو گوری ماں کا دل کانپ جاتا ——

۔ زمان بابا کو گھر میں ایسی کیا بری تھی کہ اٹھا پھینکا ک دن گزرے نہیں کہ ابکائی متلی شروع ہو گئی —— بیمار ساس کا یہ ارمان بھی پورا ہونے کو آیا کہ چھوٹا موٹا پالا تیں ——

آنسوؤں کے جگنو

دونوں باتیں ایک ساتھ ہی ہوئی تھیں — ادھر دلہن پاشا
کو بیٹا پیدا ہوا ادھر گوری ماں، ماں کے گھر آ پڑی۔

قمریاں کی گھڑی چوانی بڑی حیلی گوری ماں کے بس کی نہ تھی۔
گھر کی ماماؤں لونڈیوں سے بھی وہ برابری کا برتاؤ کرتے۔ یوں بادی تلے
کہ دیکھتے شرم آئے — کبھی بنتے دلارے ہوتا نہ ہوتا، انہیں
غرض نہ تھی۔

اکلوتے بیٹے تھے — لاڈ کے پلے — گودوں میں کھلائے گئے۔
زمین کی بجائے آنکھوں میں چلنا سیکھا — ہر عیب موجود تھا —
پھر اس پر صورت ایسی کہ شہزادے سمجھیے — جو آتا گود میں اٹھا لیتا۔
— اللہ رکھو گھر میں چاند چمکا ہے چاند —

۔ صورت کیا ہے جیسے پھول ۔

یہ باتیں کان میں پڑتی ہی رہتی تھیں ——— مزاج اور بھی ماشاء اللہ ہو گیا ——— بچپن سے دماغ چڑھا ہوا تھا، رہی سہی کسر یوں پوری ہوئی کہ پھوپھی، خالہ، ماں نے سر پہ چڑھا لیا۔ کوئی بھی عیب دکھائی دیتا، کوئی شرارت کرتے تو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ———

۔ ابھی بچہ ہے بڑا ہو کر آپ ہی سنبھل جائے گا ۔

بچہ بڑا ہو کر یوں ہی سنبھل جایا کرے تو پھر مائیں بچپن سے تربیت کی طرف توجہ ہی نہ کریں ——— باپ تھے وہ باہر کے آدمی ——— گو گھر میں رہ کر بھی وہ کیا زبان ہلاتے تھے ، جو ہوتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے ۔

بڑے ہوئے تو ہر گن ان میں موجود ——— ادھر باپ کا اور ادھر بڑے سرکار کا ، دونوں ہی کا خیال تھا کہ شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے ——— سنبھلی ان کی جوتی ——— شیر کے منہ کو خون کا چسکا پڑ گیا ——— تاک جھانک سے جی نہ بھرا تو دور دراز سے بھی طوائفوں سے اپنی پیاس بجھانے لگے ———

اتنا سب کچھ ہوتا تو کچھ نہ تھا۔ مگر گوری ماں نے تو اماں بی کو اپنی چوکھٹ پہ نیل کے نشان دکھائے ——— گھبرے گھبرے ہو دن گزرنے پہ بھی نشے تھے یوں گوری ماں ایسی تھی کہ بڑے سے بڑا ستم سہہ جاتی مگر اف نہ کرتی ، اس دفعہ اس نے تو اتنا ہی کہا تھا بس ———

آپ اتنے بڑے باپ کے بیٹے ہیں، لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے ۔

اس رات اللہ میاں رات کے کوئی بارہ ایک بجے جھومتے جھامتے گھر پہنچے تھے — شراب وراب تو نہ پی تھی مگر جیسے کسی کے بھی آنکھوں کا رس پی کر آئے تھے اس کا نشہ اتنا تیز تھا کہ بار بار بہکے جاتے — وہ تو خیر گزری کہ گوری ماں کا حال نہ جانا رہا —

ماں تھیں دشمن تو نہ تھیں۔ باپ کے کانوں تک بات گئی۔ دونوں کو بس یہی سوجھ سکا تھا کہ بیٹی کو گھر بٹھا لیں — اس کے آگے پیچھے اور کوئی بات سوجھ ہی نہ سکتی تھی۔

کہنے والے کہتے ہیں ماں باپ کا کیا اولاد کے سامنے آتا ہے — آتا ہوگا مگر بڑے سرکار رو رو کر سوچتے کہ میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا — کون گناہ ایسا سرزد ہوا تھا کہ جو اس بیٹی پر یہ آفت آئی — اب مجبوری بھی کا یہ ساتھ تھا۔ ان کی بیٹی ایسے پچاس آدمی کھلاتے، تب بھی بار نہ جاتا، مگر یہاں سوال کھلائی پلائی کا نہ تھا — جان جوانی ہی کا تھا — اور پھر یہ بھی تہمت کہ کنواری بیٹھے تو بیٹھے بیاہی نہیں بیٹھ سکتی — میاں کے ساتھ بھی بسی راتیں اور گذرے رنگ بھرے دن یاد آتے ہیں — اور پھر دن کی راتیں اور گرمیوں کی شامیں — برساتوں کے رم جھم دن کہ اپنا آپا بھلا جائے —

بڑے سرکار کو یہی غم کھائے جا رہا تھا — شریفوں کے خاندان سے تھے اونچی ناک تھی یہ بھی ناممکن تھا کہ کسی اور جگہ ہاتھ پیلے کر دیتے — اور پھر کچھ ہی دنوں بعد ان کی ترپنے والی تھی — کوئی ایک مصیبت تھی

بڑے سرکار کی راتیں جاگتے جاگتے گذرنے لگیں ۔۔۔
اماں باپ بہن بھائیوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا کہ پوتا ہوا ہے۔ اماں بی کے دل کو ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا تھا کہ غیب کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے اتنی بڑی جائداد جس کے تن تنہا مالک قدیر میاں ہی ہونے والے تھے۔ بیٹا نہ ہوا تو کس کے سہارے چلے گی ۔۔۔ گھر سے جھگڑے پڑ جائیں گے حصہ دار اپنا حق منوانے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نام لیوا نہ رہے تو منہ میں پانی ڈالنے والا ۔۔۔ یہ کھٹکا بھی اماں بی کے جی سے نکل گیا ۔۔۔ بھاری بھر کم ہی ہو رگ میں بیٹا مانگتے ہی رشل چلے ۔۔۔

دلہن پاشا ۔ لگتا نہ تھا کہ دو دو بچوں کی ماں بن گئی ہیں ۔۔۔ اعضا میں وہی دلکشی تناؤ۔ چال میں وہی مستی ، طنطنہ ۔ اب کی بار بھی قدیر میاں نے رنگی چلانی چاہی مگر اماں بی کفن پھاڑ برس پڑیں۔

"اے بیٹی زینت تھا منہ بند کر لیا ۔۔۔ جو تو کہے وہی سنتے رہیں گے کیا ۔۔۔ ؟ بیٹا جیسا بیٹا پیدا کیا دودھ نہیں پلائے گی کیا ۔۔۔ واہ یہ اچھا مذاق ہے "

قدیر میاں منہ پر اتر آئے تو اماں بی بھی پھر تو آگئیں ۔۔۔
"دیکھ لوں گی کیسے اپنی سی کرتا ہے ۔۔۔ بیٹا اللہ نے دیا ۔ اللہ رکھے ماں صحت مند ہے ۔۔۔ یہ تو نئی روشنی ہے موئی کھیل بگاڑ دو ۔ پہلی بار ہم بھی چپ رہ گئے کہ چلو بیٹی پہلی پہل ہے ۔ اور پھر بیٹی کا معاملہ ہے ۔ پہل ہی پہل کا ۔۔۔ پل ہی جائے گی ۔۔۔ یہ نہ سوچا تھا کہ بیٹے کے وقت بھی ایسا

بنی ہو گا ـــ

دولہن پاشا کی دودھ سے ابلتی چھاتیاں بچے کے منہ سے لگا دی اور ان کی داستانیں جیسے راہ ڈھونڈ لی گئی تھیں جیسے آج پہلی بار ماں بنی تھیں ـــ

بچہ دودھ پیتا تھا مست اور تندرست تھا۔ ماں بھی صحت مند اور بشاش ـــ تعریف میاں اور بی بی سے ناراض ناراض رہتے تھے ـــ ان کا خیال تھا۔ دولہن پاشا نے خود یہ چال چلی ہے ـــ ساری کارستانی انہی کی ہے ـــ خدا معاف کرے وہم کر کیا کیا جائے ـــ بے چاری نے زبان تک نہ ہلائی ـــ

بیوی کے ساتھ اب سوتے تھے تو لگتا تھا جیسے پہلی بار کے ہی کی ڈگر پر لگے ہیں۔ سے الجھ سے ہوا ۔ وہ پہلے تو وہ ختم انہیں نظر آتی تھی کہ مانگ پر اتر گئے اور ہنگی بھرنا چاہتے تو انگلیوں کے بیچ گوشت بھی نہ گرا جاتا تھا۔ مگر یہ ناراضگی زیادہ دن چلی نہیں۔ بیوی ایسی تھی کہ محبت پھوٹی پڑتی تھی۔

محبت، وفاداری، خدمت گزاری اور فرمانبرداری دولہن پاشا کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اب یوں تو ہے بڑی تھیں نہ کام کرنا پڑتا نہ کوئی۔ ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ تھی ـــ ایک کے چار چار دوڑتیں۔ تو پھر ساس نندوں کی خدمت کا موقع بھی کیا ملتا ـــ؟ مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں دیکھتی تھیں کہ اتنے بڑے گھر کی بہو ہو کر بھی ان میں ایسی فرمانبرداری تھی کہ دل موہ لیتیں ـــ رانی بی نے کسی چھوکری

سے پانی مانگا اور جھٹ انہوں نے پلادیا ـــــ اماں بی کھانے سے
اٹھیں نہیں کہ یہ پین کٹی لے کر پان کوٹنے بیٹھ گئیں ـــــ جمعے کے جمعے
اماں بی ضرور نہاتی تھیں اور سورۂ کہف کی تلاوت کرتی تھیں۔ انہیں
معلوم تھا۔ دس گیارہ بجے کے انداز میں خود ہی باورچی خانے میں جاکر
حمام کے لئے پانی گرم کرواتیں ـــــ سیرت کی خوبیوں کا اندازہ اور کیسے
ہوتا ہے بھلا ـــــ ؟ میاں سے بھی ایسا ہی سلوک تھا اور سسرالیوں
سے بھی ـــــ سسرال بھی فدا تھی ۔ اور اب دو دو بچوں کی ماں
بھی تھیں ـــــ بیٹی تو تھی ہی ـــــ اللہ نے بیٹے کی ماں بھی بنادیا تھا۔
زندگی کیا تھی بس بہار مجسم تھی ـــــ

اماں بی دوکان کا حادثہ بھول نہ تھیں ـــــ دوکان کیا تھی
اچھی خاصی جاگیر تھی ـــــ منشیوں کی حرام زادگی اور کارندوں کی
بے ایمانی سے لاکھوں کی دوکان خاک ہو گئی ـــــ اب کوئی کاروبار کرنے کو
سوچتیں تو سب سے پہلے دل کو یہی خیال آتا کہ ہاتھ کا نہ کھلا ہی اب
بھی رہ سکے گی یا نہیں ـــــ اماں بی کا وسوسہ گو بالکل بے بنیاد تھا۔
دوکان اپنے تھے اور اوپر سے شہر میں بجلتر اور متفرق سامان کی دوکانیں
بھی ـــــ ایک منشی نے حرامی پن کیا سبھی تو نہ کر سکتے تھے۔ یہ آمدنی
بھی کم نہ تھی سالانہ ہزاروں کی تھی پڑ جاتی تھی ـــــ یہ مزدور بے کرگر
آمدنی ہزاروں کی تھی تو خرچے بھی ہزاروں کے تھے ـــــ دلی میں ہی خود

کتنے جی بیٹھے تھے —— اور پھر آنے جانے والے کہ سارے دنوں میں شادی بیاہ، میلے ٹھیلے کا سا منظر رہتا۔ شادی بیاہ کی بات تو جانے ہی دو پوتے کا عقیقہ دادی نے بڑی دھوم دھام سے منایا —— کوئی ارمان کوئی حسرت اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہتی تھیں —— جی بھر کے خوشیاں دیکھی تھیں اب ان کا اپنا کیا تھا مگر بڑے دم اپنے زندہ رہنے کا جواز یوں ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ چھوٹوں کو ہماری ضرورت ہے —— اور سچ تو یہ بھی یہی کہ بڑے دم ہی گھر کی رونق ہوتے ہیں —— چاہے ایک کونے میں پڑے رہیں مگر بھرا بھرا سا محسوس ہوتا رہتا ہے ——

بڑے بوڑھے قدم کا شگن بہت مانتے ہیں —— خود اماں بی کا اپنا ذاتی مشاہدہ تھا کہ قدموں کی برکت اور نحوست کیا ہوتی ہے —— اماں بی نے تو کبھی دو پیسے کی جھاڑو خریدی اس کا بھی شگن دیکھا —— مٹی کی ہنڈی لی تو اس کی بھی برکت سنبھالی۔

اماں کو یاد تھا انھوں نے ایک چھوکری پالی تھی۔ اس کے آتے ہی گھر کی حالت بدل —— ایسی بدلی کہ راتیں شب برأتیں اور دن عید والے دن بن گئے —— دینے والا تو اللہ ہے وہی دیتا ہے۔ اور وہی لیتا بھی ہے لیکن اماں بی کے دل کو بھی بات لگ گئی —— اس کا نام تو حسن تھا، مگر اماں بی نے بدل کر برکتا رکھ دیا ——

بڑے سرکار کا ایک پسندیدہ گھوڑا تھا —— جسے انھوں نے اپنے

ایک عرب دوست سے پورے دو سو اسّی میں خریدا تھا — وہ بیمار پڑا
دیا کہ بس مرنے کے قریب ہو گیا — گھوڑے کے بارے میں تو یہ بھی یقینی
بات کہ عمر بھر کبھی نہیں بیٹھتا بس جب مرنے کا وقت آتا ہے تبھی بیٹھتا ہے۔ بس
اس کا بیٹھنا ہی باقی رہ گیا تھا — انھی دنوں بڑے سرکار نے شہر چٹھی
بھجوا رکھی تھی کہ گاؤں میں ایک سائیس کی ضرورت ہے کوئی سمجھدار اور تجربے
کا آدمی ملے تو بھجوا دینا —

رات کے دس گیارہ بجے ایک آدمی گاؤں پہنچا — صبح کا نکلا نکلا۔
دس بجے بجے گاڑی سے گاؤں آیا — کسی کو خبر نہ ہوئی دربان نے خود ہی
اسے کھلایا پلایا اور ایک کوٹھری میں سلا لیا — گھوڑے کے مرنے میں کوئی
کسر باقی نہ تھی مگر بڑے سرکار کی حیرت کی حد نہ رہی کہ دو دن بعد اور رات
کی رات گھوڑا چنگا ہو گیا — بس سائیس نے آکر اس کی پیٹھ ہی تو تھپکی تھی۔
موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ ہے مگر نانا بی کہیں انھیں یہ قدم کا شگن
ہے — بڑے سرکار کی البتہ اس پہ کوئی خاص عقیدہ نہ تھا بولے۔

"جو ہوتا ہے پہلے ہی سے ہونے والا ہوتا ہے اور ہم سمجھ لیتے ہیں کہ
قدم کی برکت تھی یا دعا کا اثر تھا — بھلا قسمت کا لکھا بھی کہیں ٹلا
ہے — ؟"

مگر نانا بی یہی کہتی رہیں کہ آدمی بے برکت بھرا — عمر بھر کے لئے
رکھ ہی لیں گے۔

تب سے اب تک جمن خان سائیس بڑی حویلی میں تھا — سیاہ

ے بال سفید ہو گئے — دانتوں کا پورا چوکا بیٹھ گیا اور منہ چوسا ہوا آم بن گیا — تنی ہوئی کا عشق کمان بن گئی مگر وہ اس حویلی میں رہا۔

ایک دیگچی اماں بی نے ایسی بھی خریدی کہ جب جب اس میں گوشت پکایا جل جل گیا — تنگ آکر اماں بی نے اٹھائی اور پھینک دی۔

قدم کی نحوست کا تو ایک بار اماں بی نے بڑے سرکار کو بھی قائل کر دیا —

ذاکر میاں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی — رہتی دال روٹی سے خوش تھے نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں — ان کی اماں اچھی خاصی تھیں نہ کوئی بیماری نہ دکھ — شادی کو چودہ دن ہوئے نہیں کہ اماں کو ایک دن کمر میں درد اٹھا — دوسرے دن بھی یہی حالت رہی — تیل ملا — ارنڈ کے پتوں سے سینکا سائی ہوئی — مگر کمی نہ ہوئی — چوتھے دن نہ اماں رہیں نہ درد۔ اماں کے مرتے ہی وہ تباہی آئی کہ فاقوں کی نوبت آ گئی۔ اب تک کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی گھڑی نہ آئی تھی خوش پوش پڑے تھے مگر ایسے برے دن آئے ہاتھ میں کشکول آ گئی —

اماں بی کس سے تو کیا کہتیں، دل ہی دل بھانپ گئیں کہ پوتے میاں دنیا میں برا ہے تو ہیں مگر ہیں پورے سبز قدم — ادھر جنم ہوا انہیں کہ سمجھ بھی گھر آ پڑی اور یہ کوئی ایسی ویسی بات تو تھی نہیں کہ اماں بی نظر انداز کر جاتیں۔ کسی سے کہا سنا نہیں — گھر کی بھلے سانڈ تو باہر کی بھلے پٹ رونڈ۔ اپنے والے ہی بدنام کرتے پھریں گے تو غیروں کے منہ کس نے بند کیے

ہیں ۔۔۔ بڑے دکھ کے ساتھ انہوں نے کہا ۔۔۔ "اللہ میاں پوتا دیا
تھا تو بھاگیہ دان بھی دیا ہوتا ۔۔۔ اس کے بدلے بھاگ بھری بیٹی کیا
بُری تھی ۔۔۔؟"

اماں بی نے سہم کر اس پرشکوہ عمارت، اس عالی شان حویلی کی طرف
دیکھا جس کے کنگورے آسمان سے باتیں کر رہے تھے ۔۔۔ اس حویلی کی مٹی
کے ذرّے ذرّے سے انہیں پیار تھا ۔۔۔ یہ مٹی کہاں تھی یہ تو افشاں تھی
جو سہاگ بن کر ان کی مانگ میں جھم جھما رہی تھی ۔۔۔ انہیں پیار یوں
تھا کہ یہاں انہوں نے برے دن دیکھے اور اب رانی بن کر راج کر
رہی تھیں ۔۔۔ یہاں وہ کھردری زمین پر سوئیں اور اب پھولوں
کی سیج ان کی پیٹھ کے نیچے ہوتی تھی ۔۔۔ یہاں انہوں نے روکھی سوکھی
بھی کھائی اور اب یہ دن تھا کہ دیگیں کھڑکھڑاتی تھیں جن کی خوشبو
چار گھر دور تک اڑتی تھی ۔۔۔ یہیں انہوں نے اپنے موٹے جھوٹے کپڑے
پہنے کہ جسم پر بوجھ لگتے اور اب ہلکے پھلکے پھولدار ریشم کہ ہوا کی طرح
ہلکے اور پھولوں کی طرح سبک ہوتے، پہن رہی تھیں ۔۔۔

ساس مر گئیں اس وقت یہاں کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں مٹی کا کچا گھر
اور اوپر ذرا سی کھپریل ۔۔۔ پھر سسر مرے، بھائیوں کا بٹوارہ ہوا تو ان
کے حصے میں گھر اور تھوڑی سی زمین آ پڑی ۔۔۔ منجھلے بھائی نے اپنی زمین
کے پاس جا کر گھر بسایا ۔۔۔ چھوٹے بھائی سرحد کے پاس والے نہروں کے
قریب جا بسے کہ کھیتوں سے قریب پڑتے تھے ۔۔۔ رہ گئے کون؟ تادو میاں۔

ان کو اپنے ماں باپ کا گھر پیارا تھا جہاں انہوں نے جنم لیا۔ ماں باپ
نے گودوں کھلایا۔ جہاں کی مٹی سے پیار کرنا سیکھا۔ قدم قدم چلنا سیکھا۔
ہنستا کھیلتا بچپن گذرا تو دکھ بھری جدائی آئی ــــ شادی ہوئی اور زندگی
کا بوجھ کندھے پر آپڑا ــــ جہاں اتنی زندگی کاٹی وہاں سے جدا ہونے
کے خیال سے ہی آنکھوں میں نمی گھلتی تھی ــــ ایسے کڑے دل کے نہ تھے کہ
اتنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کہیں جانے کی سوچتے ــــ بھائیوں نے اپنا گھر کا
حق چھوڑا تو اس کے بدلے میں زمین ہتھیا لی۔ بکھرے پڑے تو ہانڈیاں ڈوئیاں
گھڑے برتن بھانڈے بھی بٹ گئے ــــ قادر میاں کو اس کی بھی پروا نہ تھی۔
ان قادر میاں کے جیسے پھرے۔ قسمت والوں کے ہی پھرا کرتے ہیں۔
گھر میں دو کے چھوٹے چھوٹے دو کمرے تھے۔ چھوٹا سا دالان ہودی
خانہ۔ غسل خانہ، پاخانہ بس ختم ــــ اب جو جیب بھرسا تو قادر میاں کو
سب سے پہلے اس گھر کو سنوارنا سوجھا جہاں ماں باپ رہے بسے تھے
خود پیدا ہوئے پلے بڑھے بیٹیاں مضبوط ہوئیں ــــ پورا کام ایک ہی دم سے
شروع نہیں کروایا ــــ پہلے سامنے کی دیوار بڑھوائی۔ پھر بیٹھک کے
آگے کی زمین خرید لی ــــ پچھلا صحن تو ان کے باپ کا تھا۔
ابا ہردم سوچتے تھے کہ ایک بار کھیتی میں بیک پانی اچھا آیا تو گھر
بڑھاؤں گا ــــ پیچھے کا بڑا سا صحن اسی سے خرید اٹھا ــــ باغ
لگانے کی بڑی ہی آرزو تھی۔
وہ تو بیچارے حسرت بھرا دم لیتے چلے گئے۔ گر قادر میاں نے

ان کی حسرت اگر وہ مرتے جیتے جی نہیں مگر پوری کر دی —— جس دن اونچی
حویلی بن کر کھڑی ہو گئی ہے یہ حال تھا کہ میاں بی بی کی آنکھ سے آنسو کی جھڑی
خشک نہ ہوتی تھی —— پورے گاؤں کو گھر بھرائی کی دعوت دی تھی مگر ان
کے اپنے دل مرجھائے مرجھائے سے ہی رہے —— خوش ہونے والوں نے
صدق دل سے اور من ہی من جلنے والوں نے اوپری دل سے ایسی عمارت
کھڑی کر لینے پر دل کھول کے مبارکباد دی —— مگر ان کے دل نہیں کہتے
رہے کہ وہ آنکھیں بھی یہ بہار دیکھ لیتیں تو کیا برا تھا ——؟

ایسی اونچی حویلی تھی کہ راستے والے گذرتے تو سر کو اونچا کر کے گھور
کر دیکھنا پڑتا —— قادر میاں نے اسی پر بس نہ کی —— حویلی کے کنگوروں
میں کلس بھی لگائے۔ جو دور سے اپنے جھل مل کرتے جیسے چاند سے پہچان
لگتے۔ وہ دن کہ زمیندار لگان نہ بھرنے پہ بے دخل کر دینے کی دھمکیاں دیتا
تھا اور اب یہ دن کہ قادر میاں سفید براق کپڑے پہنے حقے کی نے منہ میں
لئے آرام کرسی پر براجے ہیں اور زمیندار، عہدہ دار، پٹواری سب آگے
پیچھے ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں —— گاؤں والیوں نے اپنے پیاروں کو
یوں دعائیں دینی شروع کیں ——

"جیتے رہو —— کال پڑیں۔ خدا قادر میاں کا سا نصیبہ کرے"

گاؤں کے چھوکروں میں مشہور تھا کہ جب سرکار کی حویلی کا اوپر والا کلس
دیکھو تو سالی ٹوپی زمین پہ جا پڑتی ہے"۔

قادر میاں کا نام تو اب لوگ بھول بھال بھی گئے تھے۔ اب بڑے
سرکار کے نام سے وہ پورے علاقے میں مشہور ہو گئے تھے

کی اتنی اونچی حویلی تھی کہ بنا گدی میں ہاتھ دیئے کوئی سب سے اوپر کی کنگورہ نہ دیکھ سکتا تھا۔

رتاں بی نے گدی میں ہاتھ دے کر سب سے اونچا والا کلس دیکھا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

"میرے مولی۔ ان آنکھوں سے کبھی برے دن نہ دکھانا۔" ان کا پورا جسم کانپ گیا۔

"تو شمع - میں پروانہ"

انوری بیگم کے بیٹے جہانگیر میاں کی شادی تھی۔ شادیاں تو گاؤں میں ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن قدیر میاں کی شادی نے جیسے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا ــــ ان کی شادی میں شہر سے رنڈی جو آئی تھی یہ اعزاز اور کبھی نہ ملا تھا۔ گاؤں کی بیسواؤں کا کیا ہے دس بیس روپے پکڑا دو، رات بھر ناچیں اور دم تک لینے کو نہ رکیں۔ بڑے سرکار نے تو پورے پانچ سو روپے دیئے تھے ــــ

کچھ یہ بات نہ تھی کہ رحیم بیگ کو بڑے سرکار کا رقص آیا ہو اور یوں بیٹے کی شادی میں رنڈی نچوانے کا ارادہ کیا ہو ــــ بھلا بڑے سرکار کی وہ کون ان جوتی کی برابری کر سکتے تھے؟ مگر چونکہ شہر کی مہذب رنڈی خوب ناچی تھی اور رنگ جما گئی تھی اور دور دور شہرہ ہو رہا تھا اس لئے رحیم بیگ

نے کہا کہ جب پیسے ہی پھینکنے پڑے تو کیوں نہ شہر کے کسی نامور ناچن اور گاتن کو بلوایا جائے ۔۔۔؟

اختر جہاں، ناک نقشے سے تیکھی تیکھی، رنگ کھلتا ہوا سانولا۔ ایسا چمچماتا ہوا کہ جھلکیاں سی کوندتی جائیں آواز وہ سریلی کہ انسان سنے تو ہوش ہی کھو بیٹھے ۔۔۔ ناچتی یوں کہ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑکے ۔۔۔ اور جسم بھی کیا ہی قیامت تھا کمبخت کا ۔۔۔ رہی سہی کسر تنگ لباس نے پوری کر دی ۔۔۔

قدیر میاں دو بجے کے اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ ہی بیٹھے تھے بازار کی ہانڈی کا مزہ اب تک چکھنے میں نہ آیا تھا ۔۔۔ وہ ادھر بل کھاتی دل ان کا ادھر نکلا پڑتا ۔۔۔ جیبیں تو سدا بھری ہوتی رہتی ہی تھیں ہر بول پہ ہر ہر بھاؤ پر لٹانا شروع کر دیا ۔۔۔ جیب میں اس وقت کوئی سات سو روپے تھے ۔۔۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہی پاک ہو گئے۔

پاس ہی موجو میاں بیٹھے تھے ۔۔۔ کہنی مار کر آہستہ سے پوچھا: "میاں کچھ جیب میں ہے ۔۔۔؟"

موجو میاں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

"گھر چل کر واپس کر دیں گے یار ۔۔۔" وہ ان کی حیرت کو نظر انداز کر کے بولے ۔۔۔ "ہاں پھر دیتے ہو ۔۔۔؟"

موجو میاں نے ہنس کر منہ پھیر لیا ۔۔۔ قدیر میاں نے ان کی ہنسی سے فائدہ اٹھا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کا بنڈل نکال لیا ۔۔۔

تین سو تھے — سو جو میاں نے حیرت سے مجرا ان کی طرف دیکھا — وہ مزے سے روپے لٹا رہے تھے یوں جیسے روپے نہ ہوں، پالے میں گری ہوئی امبیوں کا بور ہو —

سات مجرے کی قیمت تین سو روپے ٹھہری تھی — تین سو تو سرے اپنی جگہ پر — ایک ہزار تو خود قدیر میاں نے ہی دے دیئے — پھر اشرف میاں تھے جو ادا ادا پہ لوٹتے اور قدیر میاں کو ٹہوکا دے کر بولتے۔

"دیکھتے ہو میاں کیا چلت پھرت ہے کیا آن کی ۔"

"پنڈلیوں پہ پاجامہ تو دیکھو کیسا پھنسا پھنسا ہے — ہائے نہ ہوئے ہم رقیب —"

"ہائے ہائے کمبخت نے آج ہی جالی کا کرتا پہننا تھا ۔"

اور پھر براتی بھی تو تھے، جو چونی سے لے کر روپے کے نوٹ اور پھر بڑے چھوٹے سبھی قسم کے نوٹ چلا رہے تھے — جو اہل دل تھے انھوں نے خوب خوب مزے لوٹے ایک مرحلے سے جوان نے زور زور سے پھبتی اور چلا کر بولا —

"ساری دولت لٹا دی ساقی، یا تیرے لئے ۔"

قدیر میاں نے بڑی ناگواری سے اس حرکت کرنے والے کو دیکھا۔

اس رات کتنوں کے گھر برباد ہوئے اس کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، مگر قدیر میاں کا دل اپنے پہلو سے سرک گیا تھا۔

اختر جہاں میں ادا اس خانم کی سی تہذیب اور نفاست تھی

پیسے کی لو بھی معلوم ہوتی تھی — جہاں دیکھا کر قدیر میاں دبائے سے ہوئے جا رہے ہیں، پھیرے لیتی ہوئی ان کے سامنے "بیاتی" اور آنکھوں پر پتلی پتلی انگلیاں رکھ کر کھڑکی سی بنا لیتی — کر کے بل دیکر گاتی —

کیسے سجنا سے پڑ گیا ساتھ رے
جیسے جیسے ہی گذری رات رے

آخر کو شہر کی چلتی ہوئی رنڈی تھی — وہاں دس راتیں گذارتی تب بھی اتنا نہ ملتا — سازندوں نے جب ساز سمیٹے ہیں کوئی صبح کے چار بج رہے تھے اور قالین، جس پر وہ ناچ رہی تھی، روپیوں، اکنیوں دونیوں اور دھیلوں سے بھرا پڑا تھا۔

قدیر میاں کو اس کے سوا کسی بات سے غرض نہ تھی کہ کھانے پر کیا ہے — ناشتے کے لیے کیا پکا ہے — رات کے دسترخوان پر کیا لگا ہو — کھانے کے ایسے رسیا تھے کہ دور دور کے گھروں سے اڑتی ہوئی خوشبو پکڑ کر پہچان لیتے کہ کیا پکا ہے۔ — بھونے مسالوں کی خوشبو آتی تو بول اٹھتے —

"املی کے کھٹے کی جھل پک رہی ہے"

لہسن کے بگھار کے ساتھ کچے مسالوں کی خوشبو ناک میں گھستی تو ناک سر سراتے —

"آہاں بی ـــ خالہ بیگم کے ہاں مرغ مسلّم پک رہا ہے"
الائچی کا بگھار پڑتے ہی، کہیں نہ کہیں سے بول اٹھتے ـ
"زردہ پک رہا ہے"
دوسروں کے گھروں کی خوشبوؤں پر شرطیں تک بد لیتے ـ

سوجو میاں نے ایک دن صبح صبح بازار سے مچھلی خریدی اور اپنی بی بی کو دے آئے کہ جھٹ پٹ پکا کر رکھنا ـــ وہاں سے ان کا گھر تین گھر ہٹ کے تھا. خود آکر قدیر میاں سے گپ لڑانے بیٹھ گئے ـــ دو تین گھنٹے گذر گئے اور دوپہر کے کھانے سے قبل بگھار کی تیز تیز خوشبوئیں آنے لگیں ـ

"کیوں دوست مرغی پک رہی ہے نا آج ـــ؟" ناک سڑسڑا کر.. قدیر میاں بولے ـ

سوجو میاں ہنس پڑے ـــ "بس آج معلوم ہو گیا کہ ناک بھی بگھار کی پہچان نہیں ـــ میں تو ابھی بی بی کو مچھلی دے آیا ہوں"

"جھوٹ ہے بالکل"

"جھوٹ ـــ؟ ارے جناب خود میں نے مچھلی خریدی"

"اگر یہ مچھلی کا بگھار ہے تو ناک کاٹ کے نہ پھینک دوں؟ صاف دہی کے کھٹے کی خوشبو اڑ رہی ہے ـــ مچھلی میں املی کا کھٹا ڈالتے ہیں جناب! کچھ معلوم بھی ہے؟"

سوجو میاں کو زور سے ہنسی آ گئی ـــ

"اچھا؟ ہنسئے سوجو میاں. لاؤ شرط باندھ لو"

"ارے میاں کیوں بیٹھے پڑے سڑتے ہوئے ہو — فضول پانچ پچاس سے بیٹھے بٹھائے لٹ جاؤ گے۔"

"پیسہ تو میری جیب سے جائے گا نا؟ اچھا بولو کتنے کی لگاتے ہو بازی؟"

موجو میاں نے پچاس کی لگا لی اور ہاتھ میں ہاتھ دے کر انہیں اٹھا ہی لیا — "چلو دیکھو لڑکو کتنے پانی میں ہے۔"

"ہاں ہاں چلو کیا بچنے والا ہوں۔"

گھر میں داخل ہوتے ہی موجو میاں نے للکار کر بی بی سے اپنے سرطف میں پوچھا —

"کیا پکا رہی ہو ہاجرہ بی بی؟"

ہاجرہ چولہے کے پاس سے نکل آئی — "تو یہ مرد جیسے مرد ہو اور مچھلی خریدنے تک کی سدھ نہیں۔ پتہ نہیں جبڑے سفید پڑ جائیں تو مچھلی باسی رہتی ہے ایسی گندی مچھلی اٹھا لائے کہ پورے باورچی خانے میں بساندھ پھیل گئی — میں نے کنڈی سے پہ پھینکوا دی اور تمہارے لئے گھر کی مرغیوں میں سے ایک کاٹ لی — تم نے کہا تھا نا آج چٹ پٹی چیز پر دل چاہ رہا ہے؟"

کھانے سے ہٹ کے دوسرا شوق تھا شکار۔ خیر، چھٹے چھ ماہے تیتر سے شکار تو ہوتا ہی ہوتا، گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی کبھی اب چاہے

تو ربڑی غلیل اور کنکریاں لئے باہر چلے جاتے ـــ باہر سے واپس ہوتے تو ساتھ میں ننھی ننھی چڑیاں، گرگٹوں اور چھپکلیوں کا ڈھیر ہوتا۔ کھانے اور شکار کرنے کے علاوہ تیسرا دھندا تو انھوں نے سیکھا ہی نہ تھا ـــ بڑے سرکار بوڑھے ہو چلے تھے۔ چاہتے تھے کہ سب کام کاج بیٹے جی پر چھوڑ دیں مگر جب دیکھتے کہ کیا کھیل رہا ہے تو چپ رہ جاتے۔ معلوم تھا کہ اپنی موت کے بعد تمام تر ذمہ داری اسی کے ناتواں کندھوں پہ آپڑنے والی ہے ـــ سو چتے: ٹھیک ہی تو ہے یہی تو کھانے کھیلنے کے دن ہیں ـــ

یوں روزانہ بلا کر حساب کتاب بتا ضرور دیا کرتے تھے کہ لگا رہیں رہے اور کچھ نہ کچھ مشاہدہ اور تجربہ رہے ـــ اگر ایک ہی دم سے ساری بڑگم آپڑی تو بوکھلا ہی جائے گا۔

نہ معلوم کیسے باپ کے بڑھاپے کا خیال آیا کہ کھانے اور شکار کے علاوہ آج تیسری بات یہ بھی سوجھی کہ باپ سے دو چار باتیں کریں ـــ

" ابا میاں! شہر میں ہماری دو دکانیں ہیں، ان کی دیکھ ریکھ بھی کیسی ہوتی ہے یا سارا بھروسہ منشیوں مختاروں پہ ہی ہے "

جہانگیر میاں کی شادی کی دھوم دھڑکے کے بعد سے بیٹے دکھائی ہی نہ دیتے تھے۔ آئے تو آتے ہی ایسی ذمہ داری کی بات کی۔ بڑے سرکار نے پیچوان کی ڈنڈی کو منہ سے نکالا اور ذرا خوف سے بیٹے کو دیکھا ـــ کیا ورثہ ہو گیا ـــ جس کا درد وہی محسوس کرتا ہے دوسرا نہیں ـــ آخر کو

بیٹا بے نا ـــ ؟

پھر زور سے بولے ـــ "اب بیٹا بات یہ ہے کہ میں کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں کہ خود جاؤں اور دیکھ ریکھ کروں تمہارے رشتوں کے چچا کہتے ہیں حامد میاں ـــ انہیں دو کانوں پر لگا دیا ہے۔ وہ کوئی کھوٹ تھوڑی ہی کریں گے ـــ اس پر بھی دل میں نیکی بدی آئے تو اللہ خود دیکھنے والا ہے۔ تھوڑے بہت کی خرد برد اگر وہ کریں بھی تو ہمارا کیا چلا جائے گا ـــ ویسے بھی مجھے ان پر اتنا بھروسہ ہے جتنا انسان کو خود پر ہوتا ہے ـــ ہو سکتا ہے۔"

"ابا میاں ـــ ہمارا کم نہیں پڑ جائے گا یہ بات تو ٹھیک کہی آپ نے مگر تیل پانی جمع کرو بھی تالاب بنتا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے کہ کاروبار پر ہماری نگرانی نہ رہے" قدیر میاں پریشانی اور دکھ کے احساس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"کچھوں کس سے بیٹا ـــ ہوئے وے کے ایک تم ہو سو دیکھتا ہوں کہ تمہاری عمر کھانے کھیلنے کی ہے کمانے کے یہ دن نہیں ہوتے۔ ہوتے کیوں نہیں ـــ یہی دن کمانے کے ہوتے ہیں مگر تم جیسوں کے نہیں ـــ ہم جیسوں کے ہوتے ہیں۔ شکر ہے کہ تمہارا باپ امیر آدمی ہے۔ وہ تم کو کھلا کر کھاتا ہے۔ ہمارا باپ کیا تھا ـــ کچھ بھی نہیں ـــ ہل چلاتے تب پیٹ بھرتا۔ اگر ہم محنت نہ کرتے، اپنے باپ کا ہاتھ نہ بٹاتے تو آج ہماری یہ حیثیت نہ ہوتی ـــ" وہ ایک لمحے رک کے پھر کہنا شروع کیا ـــ

ممکن تھا ـــ ہم کسی زمیندار کے ہاں بیگار پر بھجوائے جاتے، یہ بھی ممکن تھا کہ کسی کے جانوروں کا دانہ پانی کرتے اور یوں عمر تمام ہو جاتی ـــ مگر خدا نے ہمارے ہاتھوں تمہاری بہتری لکھی تھی ـــ کتنا جی خوش ہوتا ہے یہ دیکھ کر، کہ ہم نے اپنے جگر گوشوں کو کوئی تو سکھ دیا، انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ اور اس سے زیادہ ماں باپ چاہ بھی کیا سکتے ہیں؛ بس ہماری دعا ہے کہ پھلو پھولو اور خوش رہو ـــ نیک کام کرو اور اپنا نام اونچا رکھنے کی کوشش کرو۔"

قدیر میاں گڑبڑا گئے ـــ "اچھا نام اونچا رکھنے کی کوشش کرو" انہوں نے ذرا غور سے باپ کو دیکھا ـــ

"کہیں ابا میاں بھانپ تو نہیں گئے ہیں"؛ مگر وہ جانتے تھے کہ ابا میاں اپنے اصولوں پر کتنے کاربند رہتے ہیں ـــ جاڑے گرمی برسات کا سوال نہ تھا، نو بجے سو جانا اور صبح پانچ بجے اٹھ جانا معمولات میں سے تھا ـــ خود قدیر میاں کی شادی کے دن ..... اماں بہت ابا میاں کی ذرا چڑ گئی تھیں ـــ وہ تھے کہ دلہن کو لئے بغیر جانا چاہتے تھے اور اماں یوں کہہ رہی تھیں ـــ "دور کی خدا خیر کرے۔ اللہ آمین کا ایک ہی بیٹا، خدا نہ کرے کیا اس کی بار بار شادیاں ہوں گی جو محفل چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں ـــ ایسی بھی کیا نیند ہوتی ہے؟"

اور جہانگیر میاں کی شادی کے دن تو محفل بارہ بجے کے بعد رنگ پر آئی تھی ـــ وہ اور بارہ بجے تک بڑے سرکار بھلا کیا رکنے والے تھے۔

مگر کہیں رات کے کھانے کی دعوت بھی آئے تو عذر پیش کر دیتے ـــ

"میاں مجھے تو معاف ہی رکھو ان گھر والے آ جائیں گے ـ جانتے تھے کہ رات کے کھانے کے بعد جو محفل جمے گی تو گیارہ بارہ بجے سے پہلے کیا ختم ہو گی۔

جہانگیر میاں کی شادی میں بھی نکاح خوانی ہونے تک بیٹھے ـــ ایک چھوارہ منہ میں رکھا اور بگھی میں بیٹھ گھر آ گئے ـــ یہ قدیر میاں کا دل تھا جو یہ بات توہمات کا شکار ہو رہا تھا: انہیں رنڈی کے ناچ کی خبر تھی نہ قدیر میاں کے مرشد کی ـــ

"ابا میاں ـــ انہوں نے کھل کھنکار کر کہنا شروع کیا: اب میں کوئی بچہ تو نہیں رہ گیا ہوں کہ کھاؤں پیوں اور خوش رہوں ـــ اب تو ہم خود دو دو بچوں کے باپ ہو گئے ہیں۔ آپ میرے سر کوئی ذمہ داری ڈال ہی دیجئے کہ کچھ تو احساس پیدا ہو جائے اور میرے نکلے وقت محض نام تک تو میاں مارا ہی نہ رہ جاؤں "

بڑے سرکار کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے انہیں آج پہلی بار احساس ہوا کہ مرتے وقت ان کی روح کتنی مطمئن رہے گی ـــ!

"میاں گاؤں میں تو آپ ہیں ہی ـــ میں چاہتا ہوں کہ شہر کے سارے انتظامات اپنے ہاتھ کر لوں ـ حامد چچا کو آپ فضول تنخواہ بھی دیتے ہوں گے ان کا احسان اپنے سر کیوں رکھیں ـــ؟

"بیٹا ایسا نہ سوچو۔ اس میں احسان اور بیگار کی بات ہی کیا ہے۔ مجھے تو خوشی ہوتی ہے کہ اللہ کا کرم ہے۔ وہ اپنی روٹی سے زندگی سے لگا رہے

تم یوں کرو کہ انہیں تو کام سے لگا ہی رہنے دو اور خود بھی نگراں رہو۔ ان کے پیٹ پر کیوں لات مارتے ہو؟ ایک دھڑی بھی ادھر کی ادھر... انہوں نے آج تک نہیں کی حالانکہ روپے کے ڈھیر میں دھنسے رہتے ہیں۔"

"اگر آپ کا ایسا ہی خیال ہے تو مجھ کو کوئی حرج نہیں مگر اب آپ مجھے بھی بیکار نہ رکھیں۔ اگر مجھے یونہی بیکار بیٹھ کر کھانے کی عادت پڑ گئی تو پھر تمام عمر کے لئے بیکار ہو جاؤں گا۔ یہ ہونے نہیں دیجئے۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ تم ہفتے بھر کا چکر لگا کر آ جایا کرو۔ وہاں فضول رہنے سے فائدہ نہیں ہے — گھر کی گاڑیاں، بگھی گھوڑے سبھی کچھ ہیں سواری کے لئے۔"

"ارے ابا میاں آپ ہفتے کے ہفتے چکر لگانے کا کہتے ہیں اور میں تو سوچ بیٹھا تھا کہ اب سے گھر پر رہوں گا اور کاروبار کو ترقی دوں گا۔"

"نہیں میاں تمہاری اماں پسند نہیں کریں گی کہ ایک گھر کے دو گھر ہو جائیں۔ اب اگر تم جاؤ گے تو ظاہر ہے کہ وہاں رہائش کرنی ہی پڑیگی۔ اچھے خاصے لوگ بٹ جائیں گے اور اب بیگم تمہارے بچوں کے بغیر رہ سکیں گی — اگر شروع ہی سے الگ رہے ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" سر جھکا کر بولے۔

"میری مرضی کی بات نہیں ہے بیٹا — اس طرح تو خواہ مخواہ تمہیں تکلیف ہی ہوگی — میں نہیں چاہوں گا کہ جوان بیٹے سے اس کی بیوی الگ رہے — شیطان سب کے پیچھے لگا ہوا ہے۔"

قدیر میاں آج تک کوٹھے پر نہیں گئے تھے نہ اس طرف کبھی دل ہی لگا تھا ۔۔۔ اللہ جانے کیسی ادا تھی اختری کی، کہ دل لوٹ لے گئی ۔۔۔ کنوارے تھے تو شریفوں کے بچوں جیسے تھے، تانکا جھانکی کی عادت نہ تھی مرد کی صورت تھے ایسے پارسا بھی نہ تھے اور گھر میں جوان چھوکریاں جہاں تو کبھی ہاتھ پکڑ کر دبا دیا، اور کبھی گال پر تھپڑ لگا دیا ۔۔۔ بس اتنا ہی کچھ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے ۔۔۔ ادھر زمانے میں ماں ادھر مر گئے میں باپ ۔۔۔ شادی ہوئی سیدھے سادے شریف مردوں کی طرح بیوی کے بستر میں حیثیت لگاتے ۔۔۔ بیوی، شادی ہوئی تب تو نازک نازک سی تھیں، مرد کا پیار ملا، دل سے دل ملا، خوشی ملی اور جسم بھر گیا۔ یہ ان سے مطمئن وہ ان سے خوش ۔۔۔ مگر بولنے والے بول گئے ہیں جبھی کہ مرد کی ذات ایسی ہوتی ہے کہ عمر بھر ایک ہی سالن نہیں کھا سکتا ۔۔۔ منہ کا مزہ بدلنا ہی پڑتا ہے ۔۔۔ ایسے دیندار تو ہوں بھی کوئی نہیں، رہتے کہ بس بی بی کا منہ دیکھ کر ہی جیتے رہیں ۔۔۔ بی بی کی، گھر والوں کی نظر بچا کر جب تک چاہے بستر میں نہ گھسیں انہیں چین نہیں ۔۔۔

قدیر میاں کو تو شہر میں اپنا کاروبار پھیلانا تھا! ہوٹل میں رہتے اور آتے ہی تگ و دو میں لگ گئے ۔۔۔ بازار حسن کی تلاش میں زیادہ وقت نہ لگا ۔۔۔ اختر اگر کوئی نامی گرامی رنڈی نہ تھی تو کوئی ایسی گری پڑی بھی نہ تھی ۔۔۔ سلیقے قرینے سے سجا ہوا کمرہ ۔۔۔ بیچ میں سفید سفید چاندنی پر قالین ۔۔۔ وسط میں گاؤ تکیہ ۔۔۔ تکیے سے پیٹھ

لگائے اختر بیٹھی تھی ۔۔۔ سامنے چاندی کا جھلملاتا پاندان ۔۔
تھا، ان میں نفاست سے کٹے ہوئے پان ۔۔۔ یہ تھا اختر کا کمرہ جہاں
اختر کے ذکر کے ساتھ ساتھ قدیر میاں بھی پہونچ گئے ۔

کمرے میں چھوٹی سی چوکی پر بڑا سا لیمپ رکھا ہوا تھا ۔۔ اودی
سی، تیز روشنی پھیلا رہی تھی ۔۔ ایک پروانہ دیوانہ وار چکر کاٹ رہا
تھا ۔۔ یکبارگی پروانہ زور سے اُڑا اور جلتی لو میں گر پڑا ۔۔ اختر
نے قدیر میاں کی طرف بڑی لگاوٹ سے دیکھا اور مسکرا کر بولی ۔۔

سمجھا! میں نے جلایا نہیں پروانے کو!

قدموں میں جنّت

گوری ماں کا بس نام ہی گورا تھا۔ نصیب گورے نہ تھے اپنے لاڈوں کی پلی، آنکھوں میں پلی۔ مگر جہیز کے دلوں کا سکھ بنا رہی۔ سسرال ملی تو ایسی کہ پوچھنے تک کی روادار نہیں کہ جیتی ہے یا مری — مری ہے مرجا — جیتی ہے جی —

قسمت والی ہوتی تو یہ دن کیسے چہل پہل کا ہوتا۔ ساتوں رات جاگے — آنسوؤں کا ذکر فضول ہے ماں ہی تھیں — جتنا بھی کرتیں تھوڑا تھا — انہوں نے اپنی سی کر ڈالی کوئی ارمان باقی نہ رکھا۔ باجوں گاجوں کی دھما دھم آج بھی تھی، مہمان بیٹیوں کا تہوار جیسا آج بھی تھا — مگر گوری ماں اور خود حویلی والوں کے دل پہ کیا بیت رہی تھی وہ بس ماں صرف انہی کے دلوں کو معلوم تھا کہ اس روشنی کے پیچھے کیسی تاریکی چھپی ہے —

بڑے سرکار کی جو عزت تھی وہ بولنے بتانے کی بات نہ تھی۔ روزِ روشن کی طرح عیاں تھی — بیٹی گھر آ بیٹھی — اگر بات پھوٹ جاتی تو بڑے سرکار عمر بھر کے لئے منہ چھپا لیتے مگر اب تک تو یہ بات ڈھکی چھپی ہی تھی — تاں بی تو ہر آتے گئے سے بھی یہ کہتیں — "ادّی زچگی کے لئے بلوایا ہے میں نے"۔

بات کی پھر چل بھی نہ کی جاتی کیوں کہ دنیا جہان کی ریت ہے کہ بیٹی کو پہلی زچگی کے لئے میکے بلاتے ہی ہیں — امیر غریب کی اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے — امیر اپنی شان کے لائق اور غریب اپنی طرح کے موافق، جو کچھ ممکن ہو کرتے ہی ہیں — زیادہ نہ رہے تو سنوانے پر ساتھ ماہی منانے کو ہرا جوڑا اوڑھنے ہی ہیں — اللہ نے مجھے دیا ہے وہ ہرے تاش کا جھم جھماتا دوپٹہ اڑھا دے — اور جس کے پاس اللہ کا نام ہی نام ہے اس کے لئے دھیلے کا ہرا رنگ اور دو نے ململ کا کھڑا اور دوپٹہ تو کہیں نہیں گیا —؛

گوری ماں جب سے آ بیٹھی تھی یہ بات کتنی کتنی پوچھنے والیوں نے پوچھ لی تھی —

"ادّی بیٹی ابھی سسرال نہیں گئی —؟"

ماں بی خاطر خواہ جواب دے کر خود کو مطمئن کر لیتیں۔ مگر اب جو زچگی کا وقت آیا تو دبی دبی باتیں سننے میں آ رہی تھیں — وہ نہیں بانٹنے کا وقت — سب کو یاد تھا کہ زچگی ہوئی تو تھی میکے میں — مگر سات کوٹنے باجے تاشے کے ساتھ راتوں رات صدر صاحب آ کر پہنچ گئی تھیں۔ سب کہنے والیوں کے منہ سے چھوٹے تو نہیں تھے — زچگی کے درد تو ابھی گئے۔

درد بڑھتے بھی گئے — حد یہ آگئی کہ دائی نے نچلے کپڑے تک اتار دیئے۔
مگر ساس اب آتی ہیں نہ تب آتی ہیں۔ کوئی منہ پھٹ بڑھیا بول بھی اٹھی۔

" دولہن سرکار ۔ ساس صاحبہ اب تک نہ آئیں ۔ ؟"

اماں بی نے جلبلا کر دیکھا اور دوسرے لمحے ان کا منہ پیلا پڑ گیا۔
سنبھل کر بولیں —

" بیچاری آئیں کیوں نہ — فالج کی بیمار ہیں اور پھر وہ تو ایسی ہیں کہ دکھ بیماری میں دوسروں کی دہلیز تک نہیں پھلانگتیں کہ فضول کسی کو اپنی وجہ کیوں تکلیف دوں — ؟ یہی نندیں تو سب کنواریاں ہیں — وہ آئیں تو کیا نہ آئیں تو کیا — کام نہ دام — ہاں چھٹی چھو چھک پہ ضرور آئیں گی — یہ بھی میرا خیال ہی خیال ہے — یا ہو سکتا ہے کہ پھر چھلے پر ہی آئیں — "

فوراً ہی ماں کے پیٹ میں درد کی ایک تیز سی لہر اٹھی اور دوسرے ہی لمحے ان کے قدموں کے نیچے جنت تھی — !!

بیٹا بالکل اماں میاں کی شبیہ تھا — باپ کے ٹکڑے جوان بیٹا بھی کیا پھر ہاتھ پاؤں کا ہو کہ جب مبارک سلامت کی دھوم مچی اور دیکھنے والیاں بچے کے پالنے پر اوندھی پڑیں تو کسی اکھڑ سی لڑکی نے کہا بھی

" قسم ہے مولا کی — چاند بیٹے کا دکھائی پڑ رہا ہے "

" منّو بی بی نے چڑ کر اسے دیکھا — بے زبان کو ٹوک لگا بیٹھی۔
ایسے میں کوئی کہا کرتا ہے — ؟"

دائی نے نہلا دھلا کر اس میں اسے لٹایا اور گدگدی بیاں کا دل بھر آیا — حبیب کو بچہ ہوا تھا تو اس نے سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر کیسی کیسی رنگین باتیں سنائی تھیں —؟

"ادھر بچہ ہوا نہیں کہ میاں نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا — دائی جھنجلا جاتی — ارا رے پیارے ذرا تھم جاتیں۔

"ارے لڑکے میں خیر ہے — ذرا پوچھے یا پوچھے تو دے پاؤں اپنی گٹھری پھنڈ گرہ کھول دیتی —؟

"مگر انہیں کہاں چین پڑتی — وہ دروازہ دھپ دھپاتے جاتے تھے — ارے خدا خدا کر کے کہیں دائی نے دروازہ کھولا اور اماں نہ جانے کی شرم کیے بغیر دھپ سے پلنگ کی پٹی پر آ کر بیٹھ گئے اور بولے۔

"سچ کہنا جو نکیا لگتا ہے اب —؟

"بہشت — میں شرما کر بولی — خدا کسی کا خیال نہیں — ادھر ادھر دیکھا اور بڑی ڈھٹائی سے بولے — واہ یہ اچھی زبردستی ہوئی ہمارا بیٹا، ہمارا گوشت پوست اور ہم ہی خود شرماتے پھریں — اچھا یہ تو بولو بہت تکلیف ہوئی کیا —؟

ہائے ہائے — میرے تو مارے شرم کے پسینہ آ گیا — بھلا ایسا بھی کوئی پوچھا کرتا ہے — میں پھر بھی بول ہی گئی —

"ہونہہ — تکلیف ہوئی تھی کیا — بڑے پوچھنے والے آئے کہیں کے — آپ کو کیا معلوم بھلا —"؟

"گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی تھی"؟

مجھے ہنسی آ گئی — ان کی باتیں دیکھو ذرا — کیسے عجیب ہیں جو دل میں آ رہا ہے بس بکے جا رہے ہیں —

"آپ تو بالکل ہی وہ ہیں" مجھے سچ مچ بے حد شرم آ گئی — اماں بہنیں تو خود ہی ہٹ گئی تھیں — مگر یہ بھی کیا؟ اب ایسی ڈھٹائی سے یوں چمٹ گئے تو کون بے حیا ہے جو تماشہ دیکھتا ہی جائے؟ — جب دیکھا میدان خالی ہے جھٹ مجھ پہ تل گئے —

میں خود کو بچانے لگی — "بہت دیکھے ایسے محبت کرنے والے — بے شرم"

مجھ پہ وار نہ چلا تو بچے کو گود میں اٹھا لیا — اور قسم ہے مولی کی جو تھوڑا بولوں سارے میں ناچتے پھرے —

"جب یہ ذرا بڑا ہو لے — اس کے لئے میں گاڑی لاؤں گا اور خود ہی گھمانے بھی لے جاؤں گا"

مجھے جو ہنستا دیکھا تو بولے — "اری پگلی ہے — دیکھ لینا۔ میرا بیٹا ہے میرے ہی رنگ پہ ہل جائے گا اور تو مجھ سے جلتی رہنا۔ قسم اللہ کی ذرا اتا گڈا سا ہے، پاؤں پاؤں چلے گا تو کتنا پیارا لگے گا"؟

اور ایسے بے حیا تھے قسم مولی کی، میرے بازو پہ ڈالے کو جھکے تو جھکے ہی میرے گال کو توڑ لیا۔ بولے۔

"یہ بچے کی خوشی میں تحفہ"

"بازآئی میں اپنے تحفے سے ـــ ابھی کوئی دیکھ لیتا تو ـــ بس مزہ آجاتا ہے"

اس دن ان کی شرم تو جیسے چرنے کو چلی گئی تھی۔ کھل کھلا کر بولے "مزہ کیا آجاتا؟ انہیں بھی تو پتہ لگے کہ ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے؟"

گوری ماں کا دل سینے میں نہیں، اس کی آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ پانی بن بن گئے ـــ انہیں بھی تو پتہ لگے کہ تمہیں کتنی خوشی ہوتی ہے؟ کہ ان ریچھے کا تمہیں کتنی خوشی ہوتی ہے؟ وہ تو کہیں دور کبوتروں کو بادام کھلاتے بیٹھے ہوں گے ـــ ان کا اپنا پیارا کبوتر جو ان کی ہتھیلی پہ بیٹھنے کیلئے بے قرار ہے اس کی انہیں کوئی چاہ ہی نہیں ہے؟

"میری جان ـــ میرے کبوتر ـــ گوری ماں نے اسے اپنے دل میں بھر لینا چاہا ـــ میں جو بھی ہوں تیری ماں ہوں تیری ماں ـــ تیری پیار کرنے والی ـــ کوئی پوچھے تو بھی میرے دل سے ہی آج کتنی مغرور ہوں اس جنت پہ جو میرے قدموں تلے بس گئی ہے۔"

کانٹے

دولہن پاشا کا بیٹا اب گھٹنوں سے رینگتا تھا — دادا نے اپنی پسند سے نام رکھنا چاہا مگر دادی کے دل کو تو ان کے سبز قدم ہونے کی پھانس سی لگ گئی تھی — نحوست کا توڑ کرنے، بچی کو خوش کرنے، اس کا نام مبارک میاں رکھ دیا — دادا کے دلارے تھے۔ گھٹنوں ان کی گود میں بیٹھے ان کی داڑھی کے بال نوچا کرتے — دادی کے پاس آتے تو دادی ہاتھ پکڑ کر چلنا سکھاتیں — "پاؤں پاؤں سونے کے پاؤں،
راجہ جاتا رانی کے گاؤں"

بڑے سرکار کے بچے ان معنوں میں بڑے خوش نصیب تھے کہ باپ کی بھرپور محبت انہیں نصیب ہوتی — گاؤں میں رہنا سہنا تھا گاؤں میں ہی کھیتی باڑی بھی تھی — دن کام میں کٹتا۔ شام بچوں کے ساتھ بسر ہوتی اور رات بی بی کی گود میں گزرتی، بیوی اولاد بھی ان

کی محبت سے سیر تھے — قدیر میاں سے بچوں کو یہ سکھ کہاں مل رہا تھا — اب باہر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ مہینے دو مہینے میں ایک آدھ چکر لگا دیتے — ایسے پرائے ہوئے جیسے غیروں کے گھر مہمان اترے ہوں —

شہر میں نرالی چیزیں تو ملتی ہی ہیں۔ بہت ہوتا تو لوگ جھنگ تحفے جوڑ لاتے — اماں بی کو دکھ یہ چھٹتا لگ گئی تھی کہ بٹیا پردیس میں رہتا ہے — انہیں یہ بات اچھی نہ لگتی تھی کہ میاں بی بی کے دو دستر ہو جائیں۔ مگر کام کاج کا واسطہ تھا — یہ نہیں تو کیا پلٹتیں — ؟ بس اتنا بس میں تھا سو کر گذرتیں کہ جب جب قدیر میاں شہر سے آتے نئی نویلی دلہنوں کی طرح دلہن پاشا کی سج دھج ہوتیں — بیٹے تو لوٹا اٹھا کر غسل خانے میں گھس جاتے اور دلہن پاشا مغلانی بی سے پانی گرم کروا کر بیٹھتیں تو اماں بی کے دل کے پھول کھل جاتے۔

گئے تو تھے کاروبار کی نگرانی کرنے — مگر جھوٹوں بھی ایک خط تیرے اپ کے نام نہ آیا — ایک دن بڑے سرکار، جیسے الجھن میں پڑ گئے۔ شہر سے برتنوں کی دکان کا آدمی، حامد میاں کی طرف سے خط لے کر آیا۔ اس میں حامد میاں نے لکھا تھا کہ بڑے شہروں سے آج کل اچھے اچھے برتن آ رہے ہیں اگر آپ چاہتے ہیں کہ کاروبار زیادہ چلے تو ہمیں اجازت

دیکھیے کہ نیا مال اترا ہیں — اس کے لیے دس پانچ ہزار کی ضرورت بھی پڑے گی۔

بات تو قدیر میاں، حامد میاں کے ایسے پیچھے پڑے تھے کہ ان کے پیٹ پر لات مارنے ہی تل گئے تھے اور اب خط دیکھو تو خود حامد میاں کا چلا آ رہا ہے — ہونا تو اب قدیر میاں کا خط آنا چاہیے تھا کیونکہ وہی وہ کانوں کی نگرانی اور انتظام کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

”کیوں بھئی — آج کل کانوں کی نگرانی کون رکھتا ہے؟“

— وہ تو کئی زمانے سے حامد میاں کے ہاتھ میں ہے سرکار۔

”اچھا اچھا — بڑے سرکار ذرا رک رک کر بولے —“ اور وہ قدیر میاں کیا کرتے ہیں؟

— قدیر میاں؟

— ہاں ہاں میرا مطلب چھوٹے سرکار سے ہے۔

— تو حضور وہ تو آتے جاتے نہیں — ان کو تو مہینہ ڈیڑھ مہینہ جاتا ہو گا کہ پھر بھی اپنے چچا میاں سے ملنے ضرور آتے تھے۔

بڑے سرکار نے غور سے اس آدمی کی طرف دیکھا — اور بولے۔

”تم جاؤ — خط کا جواب ہم اپنے گھر کے آدمی سے بھجوا دیں گے؟“

آدمی چلنے لگا تو بولے ہاں — اور دیکھو۔ حامد میاں سے ہمارا سلام ضرور کہہ دینا۔

"بہت اچھا سرکار" وہ جھک کر بولا ___ اور جھکے جھکے ہی باہر نکل گیا ___

بڑے سرکار بیٹھک سے اٹھ کر جلدی جلدی زنانے میں آئے اور بی اماں کو آواز دے کر بولے ___

"بیگم ذرا بات سنو"

اماں بی سر پہ پلو سنبھالتی ہوئی آئیں تو دیکھا میاں ذرا الجھے الجھے، کچھ پریشان پریشان سے دکھائی پڑ رہے ہیں ___ گھبرا کر بولیں ___

"خیریت تو ہے نا ___؟"

بڑے سرکار سنبھل کر بولے "ہاں ہاں خیریت ہی ہے"؟

"تو پھر نصیب دشمناں چہرہ اترا اترا سا کیوں ہے"؟

"نہیں بیگم میں یہ پوچھ رہا تھا کہ چھوٹے میاں چال چلن کے تو ٹھیک ہیں نا ___؟"

"اے۔ کوئی بات ہے" اماں بی کو بڑا اچنبھا ہوا کہ ان کے بیٹے کے تعلق سے میاں ایسی بات کیسے پوچھ رہے ہیں ___

"کیوں کیا ہوا ہے؟"

"نہیں کچھ بھی نہیں ___ بس ایسے ہی خیال ہوا کہ پوچھتا چلوں۔ یہ نگوڑے شہر کی ہوا لگ جائے ___ جوان جہان آدمی ہے جورو میاں بچے میاں، دل بہلتا کاہے میں بھلے ___ منشی بہاری ہو تو قدم بہکتے ہیں

جاتے ہیں اور بے کھٹکے ادھر ادھر بھٹکے پڑے جاتے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

"دو تین نہیں جی — ایسی کوئی بات نہیں ہے — میرا قدیر تو اللہ رکھو چھوکریوں کی طرح سے شرم والا ہے — پھر اماں بی کا بڑا قدر دھیان پڑ گیا ہے۔" اور اب تو اللہ رکھو تیسرے سے دوہن پاشے کی گود بھری ہونے والی ہے۔"

"اچھا ہے! بڑے سرکار ہنس کر بولے —

"ہاں اور کیا — دیکھئے نا اللہ میاں کی کیسی مہربانی ہے کہ بہو کی گود ایسی بھاری رکھتی ہے کہ بچے گھٹنوں چلنے پر آتا نہیں اور ادھر پیٹ چڑھ جاتے ہیں —

پیا مانے نہ تھیا ہمار...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پیسے دھیلے کی چیز بھی نہ مانگی۔ بولتی تو اپنے انداز سے بولتی کہ سانپ
تو مر جاتا۔ لاٹھی چھڑی تک نہ تھی۔

منی جان کے پاس زمرد کی ایسی پیاری بالیاں ہیں۔ گالوں پہ
ایسی جھلکیاں جھلکتی ہیں کہ حسن دوگنا ہو جاتا ہے

کتنے کی ہوں گی یہ؟

میں قیمت وقیمت کا ہے کو پوچھتی پھرتی — ہوں گی یہی کوئی
دو ڈھائی سو کی — اور کیا — زمرد اصلی بھی تو نہیں نا ہے؟

بس اتنی سی بات ہے؟

مرزا نے بھی ایسی دم جاتے اور اپنے ہاتھوں لا کر پہنا دیتے تو
کھل نہ پڑتی —

وہ تو غضب خدا کا — میں نے وہ تمہاری دو دو ہزار کی کالا بچھوں
دو تانی کی دھاری والی ساڑی .... پہنی تھی نا؟
تو وہ نہ جانے کیا کہنے لگی کہ اس سے اچھی ساڑھی ہے بازار میں اور قیمت
بھی اس سے کئی گنا کم ہے

اچھا — ؟

ہاں ہاں — بھلا تم نے کتنے کی لی تھی یہ ساڑھی ہے؟

یہ تو سات بھی دھاریاں ہیں — اڑھائی سو کی لی تھی

جبھی تو وہ کہتی تھی کہ وہ آبی رنگ کی ساڑھی دیکھنے میں بھی اس سے
اچھی ہے اور قیمت تو کچھ ہے ہی نہیں

• کتنے کی بتائی تھی اس نے ؟

• تیس کم ڈیڑھ سو کی ہو گی شاید ۔

• بس —؟ اور یہ اپنے جوتے ٹٹولنے لگتے —

• اسے ختم بھی کرو یہ جھگڑا —— اب اس نے کہہ دیا تو کیا ساڑھی خریدنا فرض ہو گیا ہے ؟

• نہیں نہیں۔ تم بھلا اس کے سامنے ہیٹی کیوں پڑتے ؟

• ہیٹی پڑنے کا اس میں کون سا شک ہے — وہ جوتی ہو گی نہ ہو گی کیا میری ساڑھی اس سے کم خوبصورت ہے۔ دیکھو بمبئی میں تمہیں لینے دینے کی —

• میرا تحفہ سمجھ لینا جیسے ساڑھی

• اللہ کے بعد مجھے تمہارا رہنا بہت کچھ ہے۔ مجھے کچھ نہ چاہیئے ۔

• میری خاطر بھی منظور نہیں ہے

• خاطر منظور ہے تبھی تو لیتی بھی ہوں۔ مگر اس وقت تو بالکل نہ لوں گی — تم بتا رہے تھے گھر سے پیسہ بھی نہیں آیا۔ فضول ہی خرچ میں مت پڑ جاؤ ۔

• تم اس کی فکر کیوں کرتی ہو؟ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے اس کی کیا قدر ہے؟ کہیں نہ کہیں سے آ جائے گا ۔ تم آخر کیا بچتی ہو رہی ہو ؟

• دیکھو تمہیں میری قسم ہے جو ۔ ۔ ۔

• دیکھو اختر اپنی قسم واپس لے لو میں نہیں برداشت کرنے کا

وہاں سے

ادھر ساڑی بھی آگئی اور قد بھی بڑھ گیا — قدیر میاں دل ہی
دل میں چھوٹ لئے ....

لاکھ لڑو تو برابر بھی نہیں ہے — بڑی اچھی صورت ہے وہ اسکے
سر ابھی کا چاند دیکھنے سے قسمت ہری تھی کہ بڑی بن گئی ورنہ گی کے
گھر رانی بن کر راج کر سکتی تھی۔ اور پھر خشت بھی کیا زور دار ہے کہ
چار ہی بیٹھے کہ سب کی نگاہ اسی پر پڑے ہے

[illegible] کی وہ [illegible] پر نظر رکھتے ہیں — [illegible] آئے ہوئے
تھے — قدیر میاں سڑک سے گذرتے [illegible] میں بیٹھے سجائے
سلیم شاہ [illegible] دکھائی دیئے۔ [illegible] — [illegible]
کی اور خوشی خوشی وہ لے آئے — دیکھا [illegible] جہاں [illegible] کے
دیکھنے کے سامنے کھڑا ہیں — [illegible] — [illegible] بھی
ہو چکا ہے — بس [illegible] کھڑی ہیں —

[illegible] — [illegible] آیا ہوا
دامن — [illegible] اور [illegible] بھی آ سکتے ہیں۔
[illegible] — [illegible] بیٹھ کر [illegible] ہے کہ
نہیں ہے — [illegible] جہاں [illegible] ٹھہری تھی۔
[illegible] — دیکھتے ہی قدیر میاں [illegible] گئے — [illegible]
[illegible] — [illegible] — پھر ایکدم [illegible] ہوئے بولے —

"کیا موقع سے پہنچا ہوں میں بھی — " دیکھو ذرا اس لکھنؤی باس پر یہ کام سارے سلیم شاہی جوتے کیا میل کھاتے ہیں؟

اپنے ہی ہاتھوں جوتے پہنائے — بالکل برابر اترے — پھول اٹھے، "کہو — کیسے ہیں —؟"

"تمہیں کبھی کوئی بری چیز لاکے بھی دی —؟"

تمیز میاں نے نظروں سے ہنس کر دیکھا — پاندان سے گلوری اٹھا کر کھائی اور آواز دی —

"خان صاحب — بگھی ذرا جوت دو — " ذرا دیکھو کر ذرا یہ پہنچا دو، پھر مجھ بھی آتا ہوں جھگڑوں سے۔

تمیز میاں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"مگر جا کہاں رہی ہو —؟"

"رنڈی کہاں جا سکتی ہے — سوائے مجرے کے —؟"

تمیز میاں نے شفا انہیں انداز سے دیکھا —

"کہاں —؟"

"اے واہ اس کھیل کی بھی اچھی رہی — اور کیا میں کسی کی مجرے کی بات میں پہلی ہوں کہ مجھے بٹھا کر کھلاتے ہو — اپنا پیٹ تو مجھے ہی تو پالنا ہوا — جاؤں نہ تو کیا کروں — مجرا کرنے جاؤں گی؟"

غرض اس انداز سے کبھی بات نہ کرتی تھی، تمیز میاں کا جی الجھ گیا — تنگ کر بولے —

"ہم ان کے پیچھے کس مرض کی دوا ہیں پھرتے ؟

" اور تم نے ایسی بے پروائی سے، ایسے دل جلا دینے والے انداز سے
واپس نے" اور غصہ ہو کر قدیر میاں بپھر سے گئے۔ صرف گھور کر ہی دیکھا۔ منہ
سے تو کچھ نہ بولے ــــ اختر ہی بولی ـ

"تم بھلا کیا کر لیتے ؟"

قدیر میاں نے غصے و پیار سے پوچھا ــــ "یہ تو بتائیے حضور! کتنے پر
ٹھہرا ہے ــــ"

" دل والا ہے دل والا ہے، اختر کھلکھلاتی ہوئی بولی ــــ یہ وار تو
سیدھا قدیر میاں کے دل پر جاتا تھا ـ

" میں جو بات پوچھتا ہوں سیدھا سیدھا جواب کیوں نہیں
دیتیں ــــ ؟ اختر تیزی سے مڑی ــ دو ہزار دے گا ــــ سنا ـ ؟
بنیا ہے اپنے وقت کا ۔ اکلوتا بیٹا ہے اور پھر شہر کا سب سے بڑا افسر ـ
ہمیں تمہیں تو موڑ ہی دیا ــــ اب بولو کیا ارادے ہیں ؟"

" دو ہزار ــ قدیر میاں بے دھیانی سے بولے ــ " ہاں ہاں
دو ہزار ــــ پھر تم کیا سمجھ رہے ہو ــ ؟ اور وہ لغزش سے ہنس دی ـ

قدیر میاں بات بناتے ہوئے ہنس پڑے ـ

" دو ہزار ــــ ؟ ویسے تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم جو اتنی دیر سے
الجھائی بیٹھی تھیں اس میں ایسی کیا خاص بات تھی ــــ ؟ دو ہزار ؟"

دو ہزار تو میں دے بیٹھوں تو اپنے ناک کروا دے دوں کروا دیا
اچھے بال بنانے ہیں جی "

اختر منہ سے کچھ نہ بولی۔

قدیر میاں اپنی جگہ سے اٹھے اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر بولے۔

"تم آج کہیں نہیں جاؤ گی"

"مگر پیشگی رقم دے چکی ہوں"

"کتنا ؟"

"پانچ سو ؟"

"ہم سمجھ لیں گے —!"

اختر کی اب بھی پس و پیش میں تھا — بھانپنے کے انداز سے بولی۔

"میں نے بات پکی کر لی تھی — زبان بھی تو کوئی چیز ہے"

"اچھا —" قدیر میاں نے اسے غیر معمولی نگاہوں سے دیکھا —
بولے — "میں آج رات تک پانچ ہزار دے دوں گا"

"مجھے ادھار کھاتوں پہ نہیں جیا کرتے جان من —" اختر
ابرو اٹھا کر بولی۔

"میں کوئی بنیے کی اولاد نہیں ہوں کہ ادھار کھاتے کا حساب
چلاؤں — یہ لو گن لو —" قدیر میاں تیزی سے بولے۔

شام کو رئیس کا آدمی آیا تو اختر نے چپکے سے خاں صاحب کے ہاتھ
پچاس سو روپے واپس کر دیے — اور بیمار کا بہانہ کر کے معافی مانگ لی۔
مجرا میں سر پہ ٹھہرا تھا۔ ❊

"آنگنوں میں پڑے جھولے"

[illegible]

[illegible] ـــــ [illegible]

[illegible] شام [illegible]

[illegible]

[illegible] ـــــ [illegible]

ـــــ [illegible] ـــــ

[illegible] ـــــ [illegible] ـــــ پھول کھلے

[illegible]

[illegible] ـــــ [illegible]

مگر نہ ایسی ہنسی ہنس سکتی ہیں —

اور دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا گھر کے آئی اور پہلی بار برسات کی بوندیاں گرنے لگیں — زیتون لپکی ہوئی آئی اور دلہن پاشا سے بولی —

"اے ہے کتنا گھنا اندھیرا ہو گیا۔ ایسے میں بھی حضور نے اپنی زلفیں کھول رکھی ہوں گی — ٹپ ٹپ بوندیاں جو گر رہی ہیں یہ بھی حضور کی بھیگی زلفوں سے ٹپک ٹپک کر ہی گر رہی ہوں گی — ایسی بجلی کیا چمکی ہیں یہ بھی حضور نے دیا روشن ...

"جل جل بھی پاؤں نہ تھا — کام کیا ہے سنے؟" دلہن پاشا نے ہنس کر پوچھا —

"کام — یہ کام تو کچھ بھی نہیں ہے۔ حضور جانتی ہیں جب سے عرش کا پہلا چھینٹا پڑتا ہے، جب پہلی بار اودی اودی گھٹا چھا جاتی ہے تب پہلے پہل بجلی چمکتی ہے تو حضور ہی کی سرکار۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے ہیں —؟"

"تو زیتون کہہ رہی ہے کہ سب لڑکیوں کی طرف سے یہ پیام لے آئی ہو؟"

"اب حضور بھی کچھ سمجھیں —؟"

"تو تم ان ہی سے کیوں نہیں کہتیں —؟"

"ہائے ہائے — وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی — یہ کام تو بس حضور ہی کچھ بہتر کر سکتی ہیں —"

دلہن پاشا کو ہنستا دیکھ کر زیتون لڑکیوں کی طرف بھاگ

کھڑی ہوتی —
برسات کا پہلا چھینٹا پڑتا اور ادھر اماں بی جنگل میں منگل منا دیتیں — گاؤں میں گنّوں کے کھیتوں سے دور اماں بی کا اپنا باغ تھا — ایسا باغ کہ پریوں، شہزادوں کی کہانی والی بلبل ہزار داستان بھی وہاں مل جائے — باتیں کرنے والی مینا بھی اور اپنے آپ چلنے والا سیب بھی اور جنتی سپاری بھی۔ برسات آتی، پہلی پہلی گھٹا چھاتی اور حویلی میں شور و غل مچ جاتا —

اماں بی نے مودی خانے سے چار چھ بڑے بڑے رسّے نکلوائے اور جمتی خاں کو دے کر بولیں —

" اے بڑے حضرت ذرا باغ جا کر جھولے تو ڈلوا دو — نیم اور برگد کے پیڑوں سے لگوانا — ہاں بچے والیوں کا ساتھ ہے۔ کسی کا پینگ چڑھا ہوا ہے تو کوئی چلے تنہا کے اٹھی ہے کہ کمزور ڈالوں پر مت ڈلوانا۔"

ادھر جمتی خاں تو رسّے لے کر چلتے ہوئے اور اماں بی نے سارے میں شور مچا دیا —

" اری زیتون۔ اری برکت، اے چھنال سنتی ہے کہ نہیں — ارے رمضانی ہو سنو۔ ذرا ہرے رنگ کا شیشہ تو اٹھا لانا — اور اے ری لڑکیو جس جس کو اپنے دوپٹے رنگوانے ہیں یہاں انگنی پر ڈالتی جاؤ —"

" اری بی بی اتنے ابھی میں کیا ہرا رنگ چڑھے گا — تو تمہیں تو

بھی نہیں معلوم کہ ابر چڑھا ہو تو رنگ چھوٹ جاتا ہے۔ دھبے پڑ پڑ جاتے ہیں ۔۔۔" مخلا فی بی الجھ کر بولیں۔

"اے بی تم رنگنے بیٹھو تو سہی ۔۔۔ اس میں تو مزہ ہے کہیں گہرا۔ کہیں ہلکا رنگ ۔۔۔ کڑک کڑک دوپٹے ۔۔۔ ان میں ابرق جھلملاتی ہو تو پھولوں کے چنگیروں کے ساتھ دوپٹے اڑ رہے ہیں، لمبی لمبی چھٹیاں جھکولے کھا رہی ہیں ۔۔۔ ارے بی تمہیں سمجھنا ہی کیا ہے" اماں بی ہنستے ہوئے بولیں ۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں دوپٹوں، انگوچھوں اور جھنڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دو تین ہنڈیاں بڑا سا تسلا نکال لائیں۔ کلف بھی پک کر آگیا ۔۔۔ یہ دیا سارا رنگ گھولا گیا ۔۔۔ کلف چھنوا لیا اور دوپٹے رنگے جانے لگے ۔۔۔

دو دو لڑکیاں مل کر تھوڑی دیر جھولا سا جھلاتیں۔ اوڑھنی میں ذرا جھڑک آجاتی تو پھر رسی پر ڈال دی جاتی ۔۔۔ پورے آنگن میں جھنڈے اڑنے لگے ۔۔۔

لڑکیوں کو رنگنا چھوڑ اماں بی باورچی خانے کی طرف لپک پڑیں ماماؤں سے کہہ کر بیسن، ٹوکرے بھر بھر پیاز، ہری مرچیں، کڑھی، آلو مونگ کی دال، سب کچھ نکلوا لیا ۔۔۔ اماں بی کو پہلا کھانا اچھا لگتا کہ برسات کی پہلی پھوار۔ جیسے پھوار پڑے اور تلنے نہ پڑے۔

گاڑی بھر سامان منٹوں میں نکل گیا۔ تیل کے ڈبے، گھی کے پیپے

سکے کے پھر لوٹے ۔۔۔ آخر اتنے سارے لوگ تھیں کھانے والے تھے اور پھر کھانا وہ تھیں الگ، میٹھا الگ۔

ادھر روکھو بابو نے چپکے چپکے سے کیسے کیسے بڑے بڑے پیڑ پودوں والے اور [illegible] کے [illegible] سکھی [illegible] مستی کا جل سے تیار ہو باہر نکلیں۔

[illegible] ۔۔۔ پھر شام ہونے لگی ہے [illegible] کا مزاج [illegible] ۔۔۔

اور [illegible] فکر کرے ۔۔۔ تمہیں [illegible] کرنے کا کام [illegible] کی ذمہ داری کا پتہ چلے ۔۔۔ [illegible] بناؤ سنگار کر [illegible] کھانے تیار ہو گئیں ۔۔۔ [illegible] سارا [illegible] [illegible] تم سے [illegible] کہ [illegible] کسی [illegible] لگیں [illegible] باہر [illegible] آیا اور بولا ۔۔۔ [illegible] لوگ [illegible] ہم [illegible] تھوڑا [illegible] بیٹھیں گے نا

[illegible] کی [illegible] ہو گئے ۔۔۔ [illegible] تو ہمیں [illegible] ۔۔۔ دل ہی دل [illegible] جائے کہیں [illegible] کہیں [illegible] کر رہی تھے

[illegible] ہو گئیں ۔۔۔ [illegible] اچھا [illegible] ہم بھی جائیں گے ۔۔۔ بھائی [illegible] کیا ہوا ۔۔۔ کیا [illegible] [illegible] ۔۔۔ اور پھر [illegible] میں [illegible] کی بات بھی [illegible] کی [illegible] ہے کسی کا [illegible] ہو گیا ہے ۔۔۔ کیا [illegible]

اسی دن قدیر میاں کی شادی کی بات آج تک چلی آتی ہے کہ بڑی حویلی میں بڑی بے پردگی ہوتی ہے۔

کریم پھر اُلٹے پیروں واپس ہوا۔

"وہ ادھر ہی بل سے مر گیا۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم الگ ہی الگ رہیں گے جب آپ لوگ تقسیم کریں گے اسی وقت ہم بھی اپنا حصہ لیں گے۔"

"اے لو اور سنو — جب آپ لوگ تقسیم کریں گے" کیا تو کیا مر گئے ہیں کہ ہم [illegible] منتظر بیٹھے ہیں — ایسا ہی [illegible] آیا ہے تو گھر والے چلے جاتے ہیں۔

روشنیوں کے دل میں پیچھے ہونے لگے — اے اللہ یہ آگیا بی ایسی [illegible] میں کیا اللہ کے وقتوں میں ایسا ہوتا ہوگا؟ کیا ان [illegible] بیٹا [illegible] کسی کا [illegible] کیا ہے [illegible] کھینچے [illegible] آنکھ [illegible]

— [illegible] میں [illegible] قسم کے [illegible] کی [illegible] بات کہا بھیجا۔

"اچھا آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ادا [illegible] [illegible] آپ کا [illegible] — وہ [illegible] تو جاتا نام تو آگئے۔"

"اے معلی — [illegible] دیہوں [illegible] کو [illegible] دو [illegible] کبھی [illegible] [illegible] کیا

گت بنے گی سے ؟ تھک ہار کر بولیں ۔

جاؤ مردود تم بھی تیار ہو جاؤ ___ مگر اپنی گاڑیاں الگ ہی جتنے لگواؤ ۔

ان لوگوں کو تو خدا ایسے موقع دے ___ کس کی گاڑیاں اور کہاں کی بنڈیاں ۔ بڑے سرکار تو پڑے ابھی آرام ہی کرتے تھے جا کر ان کی بگھی نکلوائی ___ اور ادھر جتنے گھوڑے تھے وہ سنبھال لئے ۔

گھنٹہ بھر تو سامان لادنے میں ہی لگ گیا ___ لونڈیاں ، باندیاں زنانے کی جو کھٹ تک لے جا جا کر دیتیں اور ادھر سے گاڑی والے جو کھڑے ہی پہ بڑے تڑکے تھے ، کھینچ کھانچ گاڑیوں میں سامان لادتے جا رہے تھے ___ مذاق ٹھٹھا بھی چل رہا تھا ۔

یہ سارا دن ایسا جا رہا ہے کہ کسی کی برات چڑھ رہی ہے ___ منلا بی بی نے گاڑی میں سے جب جھانک کر دیکھا ۔ " یہ لدی پھندی گاڑیاں ___ سست بھرتے جاتے ہیں ۔ بیچ میں گھوڑوں پہ سوار ، شاہزادوں جیسے بچے بنے سرکار لوگ ___ سامنے ہی بگھی پہ ماموں میاں مجھوں ، بھتیجوں کے علاوہ شوق کے مارے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی جا بیٹھی تھیں ۔

بیلوں کے گھنگھرو کسی کھناتے اور گھوڑوں نے بھی ہن ہن کرنا شروع کیا تو بڑے سرکار کی آنکھ کھل گئی ___ آنکھ ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور زنانے میں آ گئے ___

"بیگم نے ہرے ہرے کپڑوں کی بہار دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔
"ساون منایا جا رہا ہے؟؟"
اماں بی مسکرائیں، اپنے دوپٹے کا پلو سر پر جماتی ہوئی آگے بڑھ آئیں۔
"برسات کا پہلا چھینٹا ہری دعوت دیتا ہے"
"مگر تمہارے جسم پر دھانی دوپٹہ مجھے نظر نہیں آتا" بڑے سرکار مسکرا کر بولے —
"اب میرا کیا ہے — بوڑھی ہو کر ایسے چونچلے کروں گی تو لوگ ہنسیں گے اور نام دھریں گے"
"نہیں بیگم" بڑے سرکار سنجیدگی سے بولے "ایسا نہ کہو کہ میرا کیا ہے — سب کچھ تمہارا ہے، تمہارے ہی دم قدم کی یہ برکت ہے ساری"
"ورقی اور سفو — میاں کی تعریف پر بڑی سرکار پھول کر بولیں
"میری کاہے کی برکت ہے — کمانے والے آپ، لٹانے والے آپ۔
ساری رونق تو آپ کی بدولت ہے"
"ہاں بیگم سچ کہتی ہو تم بھی اور ہیں بھی — بوڑھے لوگ بھی گھر کی زینت ہوتے ہیں، وہ گھر کتنا سنسان سا محسوس ہوتا ہے جہاں کوئی بوڑھی ہستی نہ ہو۔ یہ ساری چمک دمک سفید بالوں کی ہوتی ہے"
اماں بی کے چہرے پر اداسی سی دوڑ گئی — بڑے سرکار بھانپ گئے —

"بھئی تم دھانی دوپٹہ اوڑھ لیتیں تو لڑکیوں کے دل بیٹھ جاتے۔
پھر اللہ جانے ہم۔ رہیں نہ رہیں اور تم رنگین کپڑے پہنو نہ پہنو۔"

اماں بی کا دل رو اٹھا۔ "ایسی بات نہ کیجئے میرا کلیجہ کٹتا ہے۔ آپ کے کاندھے چڑھ کر آئی تھی آپ ہی کے کاندھے جاؤں گی — اللہ میری مٹی آپ ہی کے ہاتھوں کروائے، کیجئے میں تو بقا اللہ سے لیتی ہوں۔ بھرے گھر میں ایسی بات نہ سنائیے جی — ہاں میں کہے دیتی ہوں، میری آنکھ نے رونا نہیں جانا ہے — میں جیتے جیتے نہیں سونا چاہوں گی۔"

گاڑھوں میں ہے تک بھی پوری ساریاں نہ لدی تھیں۔ "یہاں تک جب جہیز سج چکا تو برات چڑھتی ہے بڑے باجوں گاجوں کے ساتھ چلا کریں گے۔"

"ارے چھوڑ کر یہ جلدی کی کرنا — باتو فوری بھی وہ دھوم مچا رہی تھیں اور اب ہم تیار ہو کر چڑھ گئے تو کبھی زمانے میں وہی سستی چھائی ہے۔"

یہ گھر آ گیا تھا — وہ پیار بھرے دن بیت کر نکل گئی تھیں اور جیسے دم گھونٹے وہ سے رہا تھا، مگر یہاں جیسی کی نیت پر نہ تھی۔ بس دلہا کی کمی تھی ورنہ پوری کی برات کی تیاری تھی —

"آپ کیوں نہ چلیں ساتھ" اماں بی کو بھی سوار ہونا تھا۔

"ارے واہ۔ بڑے سرکار خفا ہو دیتے — میرا کیا ہونا بھول گیا ہے"

"نہیں تو شاید میں اکیلے جا رہی ہوں سے؟"

"تم جا رہی ہو اس لئے کہ لڑکیوں کا میں کو ساتھ ہے۔ ایک بہو ہے کا ساتھ رہنا ضروری ہے سو تم جا رہی ہو۔ ٹھیک ہے۔"

نہ ہوئیں خورشید بیگم ورنہ دونوں کو ساتھ باتیں کرنا پڑتیں۔ سکھ
نہ اٹھانے دیتیں اور فقرہ پر فقرہ کسے جاتیں۔

"کھانے کھیلنے کے دن بچوں کے ہیں فکر ہمارے — کیوں جھوٹ
کہتا ہوں بیگم ہے؟"

اتنی دیر میں اندر سے گوری ماں نکلیں — دھان پان سا جسم، گوری گوری
گوری رنگت، لمبے لمبے ساون کی گھٹا جیسے بال کمر تک جن کو چھوتے
تھے — ویسے چلے اٹھ پاؤں۔

دو ترپہ چھٹا [illegible] پہلے پڑتا ہے ... آگے آگے
جیا ہوا اٹھا اور چھیلی چھیلی سی ہنسی ہنستا ہوا ان کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔
بڑے سرکار کا دل مرجھا سا گیا۔

ساون کے دن کی البیلی کنواری لڑکیاں ... تم دیا میں کرتے
دیکھتیں ہیں۔ جھولوں کی رنگین ڈوریوں کو پکڑا چہرہ اوپر اور نیچے پینگ بڑھاتے
آجاتا۔ گھر ... پیار ... اور یہ گوری ماں ہے کہ کبھی مرجھائی کلی
سی ہو جاتی ہے — اور جسم پر بیر کا چیز ہی تنگ نہیں — ؟

"بیگم — وہ جھجکے دل سے بولے — یہ گوری ماں نے پیرا کیوں
نہیں پہنے ہے؟ اماں ابا نے گوری ماں کی طرف دیکھا اور پھر بڑے سرکار کی طرف
"آپ نہ چھیڑیں تو ہی اچھا ہے — بیچاری کیسے جیتی
دل کو معلوم ہے۔"

"ہنستا ہوں بولتا ہوں کھاتا ہوں پیتا ہوں مگر گوری ماں کو دیکھتا ہوں

تو لگتا ہے کہ زندگی میں اب کوئی خوشی باقی نہیں ہے — بیگم تم اس دن پوچھ رہی تھیں کہ میری طبیعت اداس اداس سی کیوں لگ رہی ہے؟ تم ہی کہو بیگم پھول سی ایسی بچی اور اس کا یہ حشر — زندہ ہو لاش بنی بیٹھی ہے میرے کلیجے کو پھانس سی لگ گئی ہے۔

بڑے سرکار نے گوری ماں کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بیٹا تو نے میری پہناوی کیوں نہ پہنی —؟"

گوری ماں نے کچھ جواب نہ دیا — آنکھیں اٹھا کر باپ کو دیکھا اور پھر آنکھیں نیچی کر لیں —

"کیوں بیگم اس کے پاس جوڑے کپڑے نہیں ہیں کیا —؟"

"ایک چھوڑ چھ چھ ہیں اور میں نے آج بھی تو رنگے ہیں — وہ کیا دھرے ہیں پلنگ کی پٹی سے —"

"جا بیٹا اچھا نہیں لگتا — سب لوگ سوار ہو رہے ہیں تو بھی پہن لے — دیکھ تو یہ دوپٹہ زرد بھی تو اچھا نہیں لگ رہا ہے —"

"میرا دل نہیں چاہتا ابا میاں —" درد بھرے لہجے میں بولی —

"دل اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے بیٹا، دل کے ہاتھ میں انسان نہیں ہوا کرتا — جا میری اچھی بیٹی —"

بڑے سرکار اپنی آنکھوں کی نمی نہ چھپا سکتے تھے، گھبرا کر باہر نکل گئے۔

چھم چھم، جھنر جھنر — گاڑیاں، گھوڑے بگھی، رتھیاں چلی جا رہی تھیں —

اموں میاں ہمیں اجازت ہو تو گانا گاتے چلیں — کیا ہی اچھا موسم ہو گیا ہے —

اموں میاں نے ہنس کر دیکھا — "بڑا احسان کیا جو اجازت لی آپ کو منع کس نے کیا ہے —؟"

چھٹن میاں کی آواز بڑی اچھی تھی۔ میلاد ہوتا تو سلام بھی پڑھتے اور پھر ان کو دیہاتی گیت بھی بڑے دھڑا کے سے یاد تھے، دیہاتی گیتوں کا کیا ذکر، ان کو تو رنگ رنگ کی گیت یاد تھے۔ کیا پتا ان کے اور کیا ہوں گے حویلی کے باورچی خانے میں ان کی بڑی رسائی تھی — جھنڈ بچپن سے رحمٰن اماں کے ساتھ وہاں جا بیٹھتے تھے — گود سے اترے تو انگلی پکڑ کے چلتے تھے، انگلی پکڑنا چھوٹا تو دوڑتے بھاگتے خود ہی جا کر تخت پر بیٹھ جاتے —

وہاں تو ایسی رنگا رنگ محفل جمتی تھی — نت نئی باتیں سیکھے گندی گندی باتیں اور نئے نرالے مذاق ان کی موجودگی میں ہوتے مگر یہ رحمٰن اماں کی چھاتی پر چڑھے رہتے — دور کے رشتوں کی اماں بی کی بھابی لگتی تھیں حسینہ بیگم — چھٹن میاں ذرا سے ہی تھے کہ بے چاری تمام ہو گئیں — اماں بی نے ان کو اپنے پاس رکھ لیا — میاں نے دوسری شادی رچالی تھی، پیار کا ٹوٹا ہو گیا — دودھ پلانے والیوں

نے ایک انار کھا لی۔ جس سے اس کی جان پر بن آئی تھی ۔۔۔ یہی شہزادی کا بچھڑا بھی گزر رہ گئے تھے جب کہانیوں والی شہزادی پیچھے سے ہی گود میں اٹھا لی رہی یہاں تک کہ وہ بیل ہو گیا، رنگ باگ بڑھے۔ تعجب سے پوچھنے لگی اتنی دھان پان سی شہزادی اور بیل اٹھائے اٹھائے پھرتی ہے ۔۔۔؟

وہ حیرت سے بولی ۔۔۔ بیل ۔۔۔ یہ کون سے بیل کا ذکر ہے میں تو بچھڑا اٹھائے ہوں جب سے کہ مجھے چند برسوں سے۔ روز ہی ایسا آ رہی ہوں ۔۔۔ اتنا سا تو ہے ۔۔۔

جس یہ بچھڑے بڑا بھی بچھڑے سے بیل بن گئے۔ اگر گزرتے پر اتنا بھی وہ لاتا ہی ۔۔۔ یہ جو سیاں کیسے گئے آتے ہیں؟ زمانے میں سے تو آتی بچھڑ کر بڑھ لیں ۔۔۔

وہ لمحے کی بھی کہ منہ ایک ہی نشانی ۔۔۔ میرے کو لے سے لگا چلا آیا میرا بچہ ۔۔۔ اور سے بچھڑ نہ جائے بھی کہ بھر ۔۔۔؟

ڈھولک کے گیت گانے سے گاتے گزری گانے والیاں بھی تھوڑ وہ گھڑی کی شے کر گھڑی ہو جاتی ہے

صدا دل ہے نام آئے گا اب کے برس

ایسے ٹھوکے دے سے گزر جائے کہ سب بالیوں کے دل ہل اٹھے

اللہ رے میرا بام بھی اونچا ہے آئے

اب ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا کے رخ کو دیکھ کر یہ وراگ

شروع کیا — ایسا لگا گاڑی بان گاڑی ہانکنا بھول گئے —

اندر کی گاڑی گھوڑے کے قریب سے گزری تو زینت پھر سے سماجت بولیں —

"چھوٹے میاں — دلّی ہے ہولی کی — یہ دگاڑی — کوئی دوسرا گیت چھیڑ دے۔"

چلتے گھوڑے پر چڑھ میاں نے مسکرا کر تان اونچی کی اور میگھ ملہار شروع کر دیا۔

اللہ جانے چڑھ میاں کے میگھ ملہار نے اثر دکھایا یا بارش ہونی ہی تھی کہ جھڑ جھڑ بوندیاں پڑنی شروع ہو گئیں اور باغ تک پہنچتے پہنچتے تو اچھی خاصی جھم جھم جھم ہو گئی —

گاڑیاں، گھوڑے، بگھیاں سبھی دھڑ دھڑاتے ہوئے باغ میں داخل ہوئے اور سنبھلتے سنبھلتے گاڑیوں اور گھوڑوں پر سے چھلانگیں مار مار کر اترنا شروع کر دیا —

دادا ابا چلاتے رہے — ارے کمبختو ذرا تھمو، ارے گھوڑوں کے تو رسی ڈال دو تھامو — سنبھل کر اترو — مگر دادا کی کون سنتا تھا — بگڑا مزاج کس کا تھا —

جمّن خان نے آم، نیم اور پیپل کے مضبوط ڈالوں پر جھولے ڈال دیئے تھے۔ باغ کی مالن دیبا جھونپڑی میں رہتی تھی۔ اس نے چار پائی میں آ کر ہرے ہرے پتّوں اور گھوڑے بہت پھولوں سے سجا کر جھولے

بنانے اور دیگوں پر پلیٹ رکھے تھے۔

جھڑ جھڑاتی ہوا، ہلکی پھلکی رم جھم، کوئی تیز جھونکا ہوا کا آتا تو موٹی موٹی بوندیں ٹپک جاتیں، ایسے میں سہاگنوں اور کنواریوں کے گیت پیا ملن کے گیت، برہ کی تانیں، کمسن گنگناتے تھے۔ بس سماں بندھ گیا۔

گھر سے چلتے ہوئے ترازکوں نے بڑی چالاکی سے کہا تھا کہ ہم الگ ہی الگ رہیں گے اب کون اماں بی کے بیچ میں رہتا ہو وہ دھما دھم مچائی کہ اللہ دے اور بندہ لے ـــ جھولوں کی پینگیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ـــ ایک گوری سی ماں تھی کہ ایک آم کے پیڑ سے لگی خاموش خاموش بیٹھی تھی ـــ

لونڈیوں نے مل جل کر انگیٹھیاں جمع کیں اور ان کے بڑے بڑے چولھے سلگا دیے تھے، اب کڑھاؤں میں بیسن گھولا جا رہا تھا، پھلوریوں کے لئے میدہ گوندھا جا رہا تھا۔ جو میٹھے کے رسیا تھے ان کے لئے الگ کڑھائی میں گلگلے بنائے جا رہے تھے۔ اماں بی ذرا کی ذرا خبر لینے ادھر ہو جاتیں پھر ادھر آجاتیں جہاں لڑکے لڑکیوں نے ادھم مچا رکھا تھا۔

سلیمہ بی سب لڑکیوں میں سب سے اچھا گاتی تھیں۔ کھلے فرفرے گانے کی اجازت نہ تو ان کی ماں نے ہی دی نہ تو اماں بی ہی اس کی رضا دار تھیں۔ ہاں کسی موقعے سے اگر سبھی نے فرمائش کر دی اور کچھ گا دیا تو بری بات بھی نہیں اب سب کی سب سلیمہ بی کی جان کو آگئیں۔

— اے سلیمہ بی وہ گیت سنا دو نا جو تم نے اس دن اماں بی کی چھٹی

سے ڈھول پہ گا رہا تھا۔

"ارے یہ کرن ڈھول کے گیتوں کا وقت ہے! اس وقت تو کوئی چلتی سی چیز ہو جائے — ان۔"

"اچھا تو پھر وہی سنا دو — بیری ہو گئیں رتیاں تم بن —"

"ہائے اللہ — " سلیمہ نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا — "اور جو اماں جی سن لیں — کہیں گی شرم و حیا لا کے طاق رکھ دو۔" "ہے اب پیا ملن کی چاہت ہو رہی ہے — نا! میں نہ گانے والی۔"

"اونہہ — اماں بی تو ادھر پڑی ہیں باتیں بنا رہی۔"

"اور جو اتنے سارے لڑکے ہیں۔ کوئی بے ادب تو —؟"

"بچے بچے ہی کچھ نا کر کے علیم میاں لے اڑیں گے۔ ان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔!"

"دھت بے شرم۔ وہ تو میرے بھائی لگیں گے۔"

"ایسے ہی بھائی لگیں گے — سب معلوم ہے۔ اس دن خالہ اماں آئی تھیں تو تم تو پی اپنے کمرے میں جانے کیا کر۔ پھر تھیں ادھر آنا بی نے کسی کام سے تمہیں آواز دی — تمہیں یاد کیسے نہ ہو گا کہ اس دن تم نہائی دھوئی تھیں۔ تمہارے گیلے بال کمر سے اوپر چوٹی پہ جھول رہے تھے۔ سوتے سرخ تول کا پاجامہ اور دھانی انگرکھا — تم تو پان دے کر چلی گئیں اور ادھر جناب خالہ اماں پان کھانا بھول گئیں۔ تمہیں دیکھتی ہی رہیں اور جب اماں بی نے تو ہم لڑکیوں سے پوچھا

کہ سلو بی بی کی شادی کرن سے منگنی پہ ٹھہری ہے — ہمیں معلوم
تھا ... جب بار بار شادی کی بات پوچھی کہ ہم آپ ہی کہہ دیتے کہ ابھی
تو بات ہی نہیں لگی تمہیں تو شادی ٹھہرنے کا کیا ذکر — اور پھر تو
جناب معلوم ہی بات آپ کرتے

کرن سی خالہ اماں کا ذکر ہے بھئی — مجھے نہیں معلوم
سلیمہ بھابی کریں گی۔

ارے — اتنا بھی نہیں جانتی میری بھولی بی — دریا میں کیسی کسی
ہوری کا ذکر کر رہی ہوں — ؟ ارے وہی رحیم چچا کے رشتوں جو بہن لگتی
تھیں [illegible] ناک تھی ... اتنی بڑی کی بڑی کیل لٹک رہی تھی سے

سلیمہ کو ہنسی آ گئی — ناک میں کیل بھی ایسی رہی نہ تھی [illegible]
ہماری لڑکیوں میں [illegible] کہ انہیں دیکھو ذرا — بڑی سی
بیسی بڑی سی اور کیل [illegible] — بیاہی ہوئی [illegible]
سہاگ کا [illegible] ذکر [illegible] ہیں لیتیں سے

سلیمہ [illegible] دیکھ [illegible] نے شعر کا دیا۔

اب یاد آیا میری جو کرے

بہت [illegible] کرنی یاد نہیں آتا جاتا ہے

اری بچ تو ہے — یاد وہ آتا ہے جو دور ہے، وہ تو سامنے آپ
کھنچا چلا آیا ہے، دیکھتی نہیں اُدھر — کیسے اِدھر ہی نگاہ لگائے بیٹھا
ہے — ؟

"ارے یہ کدھر سے ٹپک پڑے" رضیہ حیرت سے بولی۔

"چنو میاں، اجمل بھائی اور یہ تینوں یار غار ہیں — یہ اجمل بھائی پکڑ لائے ہوں گے — ورنہ انہیں کیا پتہ لگتا تھا کہ ہم ساون منانے باغ چلے ہیں۔"

بیا بی نے دیکھا جمو میاں ایسے اونچے اونچے پینگ مار رہے تھے اور نگاہ ڈالتے تھے سیدھی سلمیٰ پر...

"میں تو کہتی ہوں اگر بات ہو گئی تو ایسا برا بھی نہیں چھوکرا" تنو ہنستی ہوئی بولی۔ "اماں بس تم خود دیکھنا بٹیا سیدھی جمو کی ناک میں گھس جایا کرے گی اور جناب چٹا پٹ چھینکیں آیا کریں گی۔"

"وحشت — ایسی بے شرم لڑکیاں میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔"

"تو آج دیکھ لو۔"

"تو یہ بات چل رہی تھی گانے کی اور بیچ میں بشارت کا قصہ چھیڑ گیا۔" صابرہ چہک کر بولی —

اتنے میں دولہن پاشا بھی وہاں آ کر بیٹھ گئیں — گوری گوری صورت، اس پہ مستی کا جل کی بہار، ہری ہری پینا دن — اور پھر بھرے بھرے تو تھیں، جیسے نور کھل گیا تھا۔ جمو اور دولہن پاشا کی عمروں میں کوئی خاص فرق نہ تھا — بڑے بے ڈھنگے مذاق بھی کر جاتی۔

"بھائی میاں ہوتے تو کیا مزہ ہوتا — کس کی مستی اور کس کا کاجل — بس پار کر دیتے سب۔"

دولہن پاشا بھی مذاق خوب سمجھتی تھیں، شرما گئیں مگر ہنس کر بولیں ۔۔۔ "لگتا ہے تمہیں جلال بھائی نے دیکھ لیا ہے جبھی سارا [illegible] غائب ہے ۔۔۔"

نقو بولی ۔۔۔ "ان کا کچھ نہ پوچھو ۔۔۔ سدا سنگھار غائب رہتا ہے۔"

شمو جھینپ گئی ۔۔۔ "اتنی بڑی بڑی باتیں مت کرو ۔۔۔ تم پر بھی یہ دن آنے والا ہے"

دولہن پاشا ہنسنے لگیں ۔۔۔ "تم لوگوں کے مذاق تو چلتے ہی رہیں گے کچھ گانے بجانے کا سلسلہ تھا اس لئے میں بھی چلی آئی ۔۔۔ کرو گانا تھا جبھی ۔۔۔!"

بی سلیمہ اب بہانے نہ بنا سکتی تھیں، ڈھولک بھری تھی، ڈور تھام کر انہوں نے پینگ بڑھائی اور تان اونچی کی۔

بیرن ہو گئیں رتیاں تم بن
دریا ہو گئیں اکھیاں تم بن
اب کے برس بھی آئے نہ بلما
برسیں کیسے بدریاں تم بن

شمو، رجو، نقو، عشرت، سکینہ، عائشہ اور بھی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں مل کر گوری ماں کو گھیر لائی تھیں مگر وہ سب کا ساتھ دینے کی بجائے الگ تھلگ سی بیٹھی تھی اور اب گیت کے بول تو جیسے جگر کے پار اتر گئے تھے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ادھر رم جھم بارش اور اُدھر رم جھم آنسو — دولہن پاشا نے غور سے ماں کو دیکھا — اگر کچھ بولتیں تو ضرور ہی ماں کا بند حوصلہ ٹوٹ ہی جاتا۔ ان کا اپنا دل کانپ سا گیا —

"بیٹی کا جنم بھی کیا مصیبت ہوتا ہے، مگر اللہ کی رحمت سے منہ کون پھیرے، کیسے پھیرے —؟"

قدیر میاں کی یاد ان کے دل کو کانٹے چبھو گئی — انہیں شادی کے بعد کی پہلی برسات یاد آ گئی — جب پہلی بدلی چھائی تھی اور پہلا چھینٹا پڑا تھا — پہلی بار بجلی چمکی تھی اور وہ ڈر کے کانپ اٹھی تھیں۔

قدیر میاں شرارت پہ اتر آئے "ڈر لگ رہا ہوگا — ہے نا؟"

"کیسی خوفناک بجلی ہے خدایا — اللہ میں تو مر ہی جاؤں گی"

"ہمارے ہوتے بھلا ایسا ہوگا — "وہ ہنسے — "اچھا ڈر لگتا کیسے ہے، یعنی دل بھی چاہتا ہوگا نا کہ بس دبک کر بیٹھ جاؤں" وہ معنی خیز انداز سے شرارت بھری ہنسی ہنسنے لگے۔

"بڑے شریر ہیں — میں سمجھ گئی تھی کہ حضور کے دل میں بدی آ گئی ہے"

"ڈر کا یہ مطلب تھوڑی ہی ہوا کرتا ہے"

"تو پھر اور کیا ہوتا ہے؟ اب دیکھو نا بچوں کو ڈر لگتا ہے تو کیسے بندوں کی گود میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں"

"توبہ — ہم اللہ سے ڈر گئے — "ہنستے ہوئے بولے۔

"اچھا نہیں تو نہیں — مگر تم ادھر کر بیٹھ جاؤ — ڈر بھی نہیں

گئے گا اور یہاں سے بارش کا منظر تو دیکھو ___ اتنا اچھا دکھائی دے رہا ہے ___ وہ دیکھو سامنے پہاڑ نظر آ رہی ہے نا ___ ؟

میں ایسی پاگل ___ دھن میں آگے بڑھتی گئی ___ کہاں ہے پہاڑی دیوار سی ___

بڑی ہی بھول ہو خدا قسم ___ اکرم پیچھے سے لپٹا کر بولے ___ پہاڑ کی کرن سی بیٹھی ہے یہاں ... ہم بھی ہم ہیں یہ پہاڑ کی طرح اڑے کھڑے ہیں ___

اس پہاڑ کا سہارا کتنا مضبوط ہو تم ہے بادلوں، بجلیوں اور گرج سے بچا لیتا ہے! خود سہن کر جاتا ہے ___ کیا کبھی ان کو اس سہارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہوگی ___ ؟

گیت کبھی کا ختم ہو چکا تھا صرف بھولی ہوا میں پیچھے مڑتے جا رہے تھے ___ سُر اونچے اونچے پینگ لے رہی تھی اور تان تھی کہ اونچی ہو اونچی چلی جاتی تھی ___

اب کے برس بھی آئے نہ بلما
اب کے برس بھی آئے نہ بلما
اب کے برس بھی ___

سلمیٰ بی ___ دولہن باشہ بچے ہوئے دماغ سے لگتیں۔
جیسے یہ وہ کے راگ نہ چھیڑو ___ کوئی دوسری چیز . . . .
سب کے زوردار قہقہے اٹھے ___ آپ تو میاں کی یاد میں

مگن ہو گیا ۔۔۔ "وہ گیت تو کبھی کا ختم ہو چکا ہے بھابی پاشا۔"

دولہن پاشا نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف شور پکار، اونچے اونچے جھولے، تلسی کی خوشبوئیں، ہنسی، قہقہے، بے فکر جوانیاں ۔۔۔ ادھر لڑکوں نے جھاڑیوں پر چڑھ چڑھ کر بندروں کا سا نقشہ کھینچ رکھا تھا۔

"چلو گوری ماں ۔۔۔ ادھر آموں کے جھنڈ کی طرف چلتے ہیں۔" دولہن پاشا نے گوری ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا ۔۔۔

گوری ماں نے بچے کو اٹھایا اور دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بچے نے آنکھوں میں گدگدی سی محسوس کی ۔۔۔ ننھا سا منہ بنا کر چھینکا اور چلانے لگا۔

"با ۔۔۔ با ۔۔۔ !"

گوری ماں کا منہ بھنچ گیا ۔۔۔ "تیرا کوئی بابا نہیں ہے کسے پکارتا ہے بیٹے؟"

"ایسا نہ کہو گوری ماں ۔۔۔" دولہن پاشا کانپ کر بولیں۔ "اللہ میاں کو تمہارے اور بیٹے کے لئے زندہ رکھے، ایسا کیوں کہتی ہو؟"

"زندہ تو وہ ضرور رہیں گے مگر میرے اور میرے بچے کے لئے نہیں۔ انہیں بازاری عورتوں کا سہاگ بنا رہنے دو بھابی ۔۔۔" تھوڑی دیر رک کر بڑے کرب سے بولی۔

"اللہ جانتا ہے بھابی پاشا ۔۔۔ کلیجہ پک گیا ہے ۔۔۔ مجھے اپنا اتنا خیال نہیں مجھے تو بس رہ رہ کے ان ہی اور ان ہی سے بڑھ کر بابا میاں

پر ترس آتا ہے —— بچہ تو ہوں نہیں کہ سمجھوں نہ —— دوسروں کی ہنسی جیسے کسی نے قید کر لی ہے —— اماں بی تو عورت کا دل رکھتی ہیں میں جانتی ہوں میرے احساس کی وجہ وہ اپنے غموں پر بھی ہنسی اور جھوٹ کا پردہ ڈالے رہتی ہیں مگر ابا میاں کو اتنا ضبط نہیں ہے، وہ مجھے دیکھتے ہیں اور سسک تڑپ جاتے ہیں —— میں کیا کروں ——؟

ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے —— "اور آپ دیکھتی ہیں حویلی میں کوئی ایک بھی تو نہیں —— خالہ، ممانی، رشتوں کی بہنیں، لڑکیاں، بچے —— سب ہی تو ہم سے کمتر ہیں اسی لئے منہ لگاتے ڈرتے ہیں مگر سب کی نگاہیں مجھے پوچھتی رہتی ہیں —— "میاں نے چھوڑ دیا نا؟ گھر بیٹھ گئی نا ——؟

دلہن پاشا کچھ دکھ پا رہی تھیں ——

"میں تو سمجھتی تھی بھابی پاشا کہ میں بس گڑیاں کھیلنے، شوہر بہلانے اور کھانے کے لئے ہی پیدا ہوئی تھی مگر ہوش کے اس موڑ پر آ کر مجھے پتہ چلا کہ میں تو گورکن بننے کے لئے پیدا ہوئی تھی کہ دل کی قبر کھود کر دفن کروں اور ارمانوں اور آرزوؤں کی رسوائی کی لاشوں کو دفن کیا کروں ——"

"گوری بی اماں خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو —— میرا کلیجہ کانپتا ہے —— تم کیسی بھیانک باتیں کر رہی ہو ——"

"ہاں سچ بھابی پاشا —— اب میرا زندہ رہنے کو جی نہیں چاہتا پتہ نہیں دل میں کیسی کیسی خوفناک تمنائیں اٹھتی رہتی ہیں ——"

بھابھی پاشا نے غور سے شند کو دیکھا۔

"اس سے اچھا تو یہ ہے کہ خود ہی زہر کا پیالہ آپا میاں کو اپنے ہاتھوں پلا دو —"

گدری ماں نے تیزی سے سر اٹھا کر بھابھی کے منہ کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو چمک رہے تھے۔

* * *

شام کے سائے گہرے پڑنے لگے تو اماں بی نے ٹن ٹن چھان شروع کر دی۔ یہاں تو تیتر پنجروں سے چھوٹ گئے تھے — ایک کو بلاتیں تو دوسرا بھاگ جاتا — دوسرے کو پکارتیں تو تیسرا بھاگ جاتا۔

اماں بی نے چڑ کر جبّن خاں کو آواز دی۔

"بڑے حضرت — تم گاڑیاں لگوا دو — جنہیں آنا ہے آئیں ورنہ پیدل آئیں کہ پاؤں نہیں ٹوٹے ہیں کچھ —"

آدھ گھنٹے کے اندر اندر گاڑیاں لگ گئیں اور مرغیوں کی طرح خود ہی سب کے سب گھوڑوں کے آس پاس جمع ہو گئے —

پانی میں جان بوجھ کر بھیگے اور دو ہی بچی کسر حوض کے پانی سے پوری کر لی — سب سردی سے بے ٹھٹھرے اٹھے۔ بڑے سرکار دونوں بڑے دروازے کے پاس کھڑے تھے

"کیوں جبّن خوب مزہ رہا نا —؟"

"تو بچ مزہ رہا — کمبخت میرے پیر میں موچ آ گئی، آنے والوں

گھر آیا ہو گا مزے سے

بڑے ماموں میاں چڑ کر بولے۔

- آپ سے ان مرد ننگے پوتوں کے ساتھ میں کہیں نہیں جانے کا کمبختوں
نے اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی خوش ہی آ لیا ہے

بڑے سرکار ہنس کر بولے ۔۔۔ تو اجی حضور آپ سے کہا تھا کس نے
کہ تشریف لے جائیں۔

- کہنا کون آپ کی بیگم صاحبہ نے مجھے بھاڑے کا ٹٹو سمجھ رکھا ہے۔
کہ جہاں کہیں بھیجیے لگا دیتی ہیں بھیجے

- ارے یار کہاں آ گئی ۔۔۔ بڑی بھابی میاں ۔۔۔ ایسا بھی کیا غصہ
ہو گیا بچوں سے ۔۔۔ آخر تو بچے ہیں

بڑے ماموں میاں مسکرائے ۔۔۔ منجھلی ماں ۔۔۔ تو سب بچوں کو
دو گھڑی کا کر دے گی۔ جب دیکھو تب پیشت بنا ہی کے لئے تیار بیٹھی

منجھلی گاڑی سے بڑی ماں اور دولہن پاشا اتر گیا ۔۔۔ سب بولے۔

- کہو ماں دولہا بھائی جی ۔۔۔ کیسی سیر رہی

- جی آپا میاں ۔۔۔ بڑا سہانا موسم تھا ۔۔۔ خوب اچھی سیر ہوئی، لوگ نے
بجانے بھی ہوئے، گیت راگ بھی خوب چھیڑے

آپ بیٹی کی طرف مڑے ۔۔۔ بڑی ماں نے سرخ آنکھوں کو
چھپانے کے لئے بچے کو سامنے کر لیا ۔۔۔ میں بھی ضرور چلتی آپا میاں
مگر منے کا امتحان گرم تھا اس لئے اسی کے لئے بیٹھی رہی

— اسی لئے آنکھیں بھی سرخ ہیں شاید ——— بڑے سرکار نے دکھ کے ساتھ کہا۔

گوری ماں نے گھبرا کر اپ کو دیکھا اور اندر چلی گئیں۔

* * *

رکی ہوئی بارش تیز ہو گئی اور چھما چھم مینہ برسنے لگا۔ سوندھی سوندھی خوشبوئیں ہر طرف سے اٹھنے لگیں —— کھانے والے کی کسے سدھ تھی، حلق تک تو ٹھونس کر آئے تھے۔ سب یونہی پڑ رہے۔

آدھی رات کے وقت جب بڑے سرکار اپنے کمرے میں سوتے ہوئے تھے کہ کھڑکی سے پانی کی بوچھاڑ آنے لگی —— اٹھ کر انہوں نے پٹ بھیڑنے چاہے تو ان کے کانوں میں سریلی اور چبھتی ہوئی دردناک آواز پہنچی ——

بیرن ہو گئیں رتیاں تم بن
دریا ہو گئیں اکھیاں تم بن

بڑے سرکار نے سر نکال کر دیکھا —— چبارے کی طرف اندر والے سائبان کے کھمبے سے لگا لنگارو ہلکے سروں میں گا رہا تھا۔ ——— آنسوؤں کا نم ہوتا تو آواز رک جاتی پھر ابھر آتی۔

بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں بڑے سرکار نے دیکھا کہ گوری بھی ہے، بھیگا ہوا ہرا آنچل اس کے سر پہ کانپ رہا ہے اور آنکھیں دریا ہو گئی ہیں ——

کوئی چیز سیدھی بڑے سرکار کے دل میں جا چبھی اور وہ دل پکڑ کے بستر پہ جا پڑے۔

٭ ٭ ٭

آنکھوں میں ستارے

گاؤں سے شہر کا فاصلہ بس اتنا تھا کہ بیل گاڑی سے چلتے چلتے، صبح دس بجے نکلے، — سہ پہر کے تین بجے شہر پہنچ جاتے۔

اس دن کوئی دو بجے کے قریب گھوڑا گاڑی آئے، قدیر میاں جلدی جلدی آئے اور سلام کر کے اباپ کے سامنے بیٹھ گئے — اباپ نے حیران ہو کر پوچھا —

"خیر تو ہے میاں — بغیر اطلاع دیئے، بغیر کسی کو ساتھ لئے کیسے آگئے اکیلے ہی اکیلے —؟

قدیر میاں نے گردن جھکالی — تھوڑی دیر رک کر بولے۔

"ابا میاں — آپ جانتے ہیں کلمۂ بد منہ سے نکالنے سے کچھ نہیں

ہوتا ۔۔۔ ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اللہ نہ کرے کل آپ کی آنکھ بند ہو گئی تو ظاہر ہے سب کاروبار مجھ ہی کو سنبھالنا پڑے گا ۔۔۔ اب تو آپ ہیں جو ذرا سی پریشانی پر پریشان اور بدحواس ہو کر پوچھ بیٹھتے ہیں کہ میاں خیر تو ہے ۔۔۔! کل تو یہ سہارا بھی نہ رہے گا بڑے جھمیلے ہیں کہ سب کچھ سہنا پڑے گا۔"

بڑے سرکار حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھتے رہے۔

"میں اور کچھ تو نہیں، بس یہی کہہ رہا تھا کہ آپ اتنی ذرا سی بات پر دل دکھا بیٹھے کہ اکیلے کیوں آ گئے ۔۔۔ دھوپ میں کیوں آ گئے۔ بارش میں کیوں آ گئے ۔۔۔" ہنس کر بولے ۔۔۔ "اس وقت تو میں اس لئے آیا ہوں کہ یہ تمہاری دوکان پر کوئی دوسرا مختار مجبورے کا۔ کہیں ۔۔۔ پہلے والے آدمی کو تو میں نے برخاست کر دیا ہے۔"

بڑے سرکار اپنی جگہ سے اچھل پڑے ۔۔۔ "تمہارا مطلب کہیں حامد میاں سے تو نہیں ہے ۔۔۔؟"

قدیر میاں نے سر جھکا لیا۔

"تم بچے ہو میاں ۔۔۔ میں جو بوڑھا ہو رہا ہوں۔ اعضا میں یہ جھکاؤ کسی بیماری یا کمزوری سے نہیں آیا ۔۔۔ میں نے شاق دوپہریاں اور سرد گرم راتیں اس بیٹھک پر سے ہو کر گذری ہیں تب کہیں جا کر یہ دن ہاتھ آیا ہے ۔۔۔ یہ دن اتفاقاً آیا کہ کمر جھکنے لگی ہے ۔۔۔ مگر یہ جھکی ہوئی کمر ہمیں شرمندہ نہیں کرتی ۔۔۔ اگر اپنے بل بوتے پر کمایا، محنت کی

اور اس کا پھل پایا تو کیا بُرا کیا — ؟ کچھ دیر رکے، اور دم لے کر بولے —

"تم نے حامد میاں کو نکال دیا — ان کی ذات پر تو مجھے اتنا بھروسہ تھا کہ تم پر نہیں — خود اپنے آپ پر نہیں — آخر انہوں نے کیا کیا تھا —؟؟"

"حساب بتانے سے انکار کرتے تھے ابّا میاں اصاف کہتے تھے کہ بڑے سرکار کے ہوتے میں آپ کو کچھ نہیں مانوں گا — میں نے کہا گاؤں جا رہا ہوں لا دیئے اپنے ہاتھوں ابّا میاں تک منافع پہنچا دوں تو بولے "میں آپ پہنچا دوں گا"

بڑے سرکار ایسے اللہ والے تھے کہ سیاہ و سفید کی انہیں کوئی خبر نہ ہوتی — قدیر میاں دوکان کے منشیوں سے روپیہ بٹورتے جاتے اور الٹے سیدھے بہانے جوڑتے جاتے، بڑے باپ کے بیٹے! اور پھر آگے چل کر خود ہی سرکار ہونے والے تھے — ذکر آخر ذکر ٹھہرے بجتے بھی تو کیا کہتے — بدرو مانگتے تو بیس نکال کر دیتے — حامد میاں سے ان کی ایک نہ بنتی تھی —

بڑے سرکار نے گہری گہری نظروں سے بیٹے کو تاکا —

"بس اتنی سی بات — ؟ وہ تیز لہجے میں بولے —

قدیر میاں بوکھلا گئے — حیرت سے ابّا میاں آپ اتنی بڑی بات کو اتنی سی بات کہتے ہیں — یہ میری ہی نہیں آپ کی بھی عزت کا سوال

ہے۔ ہمارا ہی نوکر اگر ہم پہ بھروسہ نہ کرے گا تو ——

"خاموش —— بڑے سرکار مضبوط اور بھاری لہجے میں بولے۔

"آگے کچھ نہ کہنا —" پھر بولنے لگے۔

"بڑوں کی عزت کرنا سیکھو میاں —— حامد میاں نے تمہیں پیسہ نہ دیا تو تم میں کوئی ایسی بات دیکھی ہوگی کہ بھروسہ نہ کیا ورنہ ان کا ایسا چلن نہیں ہے کہ مالکوں کی عزت نہ کریں۔ تم تو تم ہو اگر زینت ان جا کر ان سے پیسے مانگ کر لا دیتے میں آپا میاں کر دے سے آؤں تو —— تو وہ جھٹ پوٹلی نکال کر دے دیں گے —— بھروسہ دنیا میں بڑی چیز ہے —— حامد میاں ایسے ویسے آدمی نہیں ہیں میں جانتا ہوں —— آج پیسے نے تجھے بڑھا دیا۔ اور انہیں گھٹا دیا کہ وہ میری دکان پہ نوکر لگے ہیں مگر ہیں تو ہمارے ہی خون کا ایک حصہ —— مجھے ان کی باتیں معلوم تھیں —— میرے بیٹے پہ اپنا خون تک گرانے کو تیار رہتے ہیں —— بیٹے کا منہ دیکھ کر وہ چپ ہو گئے ——

"خیر اب اس بات سے کیا لینا دینا —— میں نے ان کا حساب بھی صاف کر دیا ہے۔"

"اور اب دکان پہ کون ہے؟"

"جی ابا میاں تو میں نے اپنے بھروسے کا ایک آدمی بٹھا دیا ہے۔"

قدیر میاں نے تڑ تڑاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا بیٹے —— تم نے اچھا نہیں کیا ——

"بڑے سرکار، بار بار بیٹھے جاتے اور سنبھلتے پاتے ـــ رک رک کر بولے۔

"پھر اس وقت گاؤں آنے کا کیا مطلب تھا ـــ؟"

"میں یہ کہنا چاہ رہا تھا ابا میاں کہ اپنی دوکان سے آس پاس ہی اور دو چار بیوپاریوں نے برتنوں کی دوکانیں کھول لی ہیں اور دن بھاری بکری پر اس کا اثر تو نہیں پڑ رہا ہے ـــ شاید خوا بکری نہیں بھی ہے ـــ میں چاہتا تھا برتنوں کو چھوڑ کر اور کوئی کاروبار شروع کرتے؟"

بڑے سرکار گم سم ہو گئے ـــ

"تم جانتے ہو میاں کپڑوں کی دوکان، جو ہماری سب سے بڑی دوکان تھی، شیخوں کی حرامی پن کی وجہ مدت ہوئی بیٹھ چکی ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نے اپنا سارا روپیہ کھیتی باڑی میں لگانے کی بجائے، دوکانوں پر لگایا ـــ شہر میں ہماری تین دوکانیں تھیں۔ کپڑوں کی، برتنوں کی اور پھر جلیبی سا ایک ـــ وہ دوکان تو گئی، اب برتنوں کا یہ حشر ہو تو پھر کیا کیا ـــ؟ اتنا یہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی نہیں لگتی میاں ـــ اگر ایک دفعہ بہاؤ کا رخ نشیب کی طرف ہو جائے بس تو ہو چکا ـــ تم نے کبھی دیکھا بھی ہے کہ چڑھاؤ پہ پانی چڑھا ہو؟ دولت اتنی ہی مشکل سے آتی ہے بیٹا جتنا کہ پانی نشیب سے اوپر چڑھتا ہے ـــ آج دوکانیں بیٹھ جائیں گی ـــ کل یقیناً کھیتی باڑی کی باری آئے گی ـــ کھیت گھٹ پڑ جائیں گے، زمینیں بک جائیں گی ـــ ساکھ ڈوبتے کیا دیر لگے گی ـــ؟ اور تمہیں معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا ـــ؟"

ایسا نہ سوچو میاں ــــ ایسا نہ کرو۔ مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے، جتنی محبت مجھے تم سے، رقو ماں سے اور میری گودی ماں سے ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر، اپنی عزت سے ہے، اپنے نام سے ہے۔"

قدیر میاں چپ چاپ کھڑے تھے۔

"جاؤ بیٹا ــ حامد میاں کو پھر سے بحال کر لو ــــ نیک آدمی ہیں میرے بچوں کو اپنے ہی بچوں کی طرح دیکھتے ہیں۔ تم نے اگر بیچ میں کوئی غلطی کی بھی تو وہ اتنے بڑے دل کے مالک ہیں کہ تمہیں معاف کر دیں گے ــ چھوٹے دراصل اسی لئے تو غلطیاں کیا کرتے ہیں کہ بڑے معاف کر دیا کریں۔"!

مسکراہٹ کا جنازہ

اس رات تدبیر میاں گھر پر ہی رہے ـــ اماں بی نے دیکھا کہ بڑی ہی مدت بعد بیٹے آئے ہیں تو جھٹ سیج لگا دی ـــ دولہن پاشا کا کمرہ تو سدا دلہن ہی بنا رہتا تھا ـــ یہاں کیا دیر لگتی تھی، ذرا اشارہ ہوا اور کمرے میں رات سے دن پڑ گیا ـــ

تدبیر میاں پلنگ پر بیٹھے ضرور مگر ایسے بے چین بے تاب جیسے کسی نے چادر پر کانچ کی کرچیں پھیلا دی ہوں ـــ دولہن پاشا سے تیوڑوں بھی بات نہ کی ـــ بڑی لگن سے پاس آئیں، پان لگا کر دیا مگر وہ یونہی پڑے کروٹیں بدلا کئے ـــ

ـ آپ تو شہر جاتے ہیں تو گاؤں کو بھول ہی جاتے ہیں ـ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کسی کی زندگی آپ ہی کے دم سے ہے !

قدیر میاں جو اب تک سُن رہے تھے۔ پلٹ کر بولے۔ ذرا طنز سے ۔۔ "اور جو ڈھیروں کام سنبھالے ہوتے ہیں!؟؟"

"کام ۔۔ کام ۔۔ کام، سدا کام ہی کام ہے تو انسان دنیا سے منہ تو پھیر نہیں لیتا ۔۔۔ ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ بوڑھے باپ کی کمائی ہوئی دولت کو یونہی چھوڑ دوں، چاہے کتے کھالیں چاہے بے ایمان نوکر۔؟"

اس انداز سے قدیر میاں کبھی بات نہ کرتے تھے۔

دلہن پاشا نے ذرا حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"ہائے اللہ ۔۔ یوں بھی تیز ہو کر بات نہیں کیا کرتے۔؟"

قدیر میاں پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے ۔۔ "تیز ہو کر بات نہیں کیا کرتے ۔۔ جس کے بدن سے خون نکلتا ہے کمزوری اسی کو محسوس ہوتی ہے دوسرے کو نہیں ہوتی ۔۔ ابا میاں نے اتنی محنت سے یہ دنیا بنائی، اماں بی کو کیا حق لگتا ہے کہ سارے کنبے کو جوڑ کر رکھیں یوں جیسے شادی رچی ہو ۔۔ جب وقت پڑا تھا اس وقت تو کسی نے ساتھ نہیں دیا۔ اب حویلی پہ نظر ڈالو تو لگتا ہے کہ پورا خاندان یہیں جمع ہو گیا ہے ۔۔ ان لوگوں کو ہمارا کیا درد ہوگا ۔۔ حویلی کے اتنے سارے لوگوں کا خرچہ بھی اتنا تھوڑا نہیں ہوگا ہزاروں کا ہوگا ۔۔ مفت کی روٹیاں توڑنے والے یہ کہاں سوچتے ہوں گے کہ بیٹھ کر کھانے سے تو ندی کا پانی بھی پورا نہیں پڑتا۔"

دولہن پاشا نے قدرے نرمی سے کہا۔

"اے ہے یوں بھی نہ کہئے جی — خدا کو بھول کر بات نہیں کیا کرتے — حویلی میں جو کوئی بھی رہی مصیبت کے مارے ہی رہا۔ پاس پیسہ آیا تو ماں باپ سے نہ دیکھا گیا کہ ان کے اپنے لوگ یوں دانے دانے کو ترسیں سو بلوا لیا — ابا میاں کا اپنا دل بھی بڑا ہے۔ اللہ میاں نے رزق بھی خوب دے رکھا ہے وہ تو سچ ہے کہ بیٹھ کر کھانے سے ندی کا پانی بھی پورا نہیں پڑتا مگر یہ ندی اللہ رکھے ایسی ہے کہ کبھی نہیں سوکھنے والی۔ ابا میاں نے اتنا کچھ کمایا ہے کہ چھ پشتیں بھی راج رہیں تو بھی ختم نہ ہوئے"

"چھ پشتیں راج رہیں اور پھر بھی ختم نہ ہوئے" قدیر میاں طنز سے ہنسے — "تم اللہ جانے کون سی دنیا کی بات کرتی ہو؟ اگر بے ڈھنگے خرچ کا یہی عالم رہا اور کھانے والے یونہی بڑھتے رہے تو چھ چھوڑ ایک پشت بھی نہ پنپ سکے گی"

"ایسا برا کلمہ منہ سے کیوں نکالتے ہیں آپ — اللہ نہ کرے جو کبھی ایسا ہوئے!"

"ایسا کہنے سے کچھ ہوتا جاتا نہیں — اب اتنا سا ابا میاں کو خیال دلا دو اتنا کہ کوئی دوسرا دھندہ کر ڈالیں۔ برتن تو اوندھے پڑ گئے — تو ملتے ہی نہیں — پیسے کو پیسہ کھینچتا ہے۔ اگر دو کی جگہ پانچ بھی پہلے پہل اٹھ گئے تو ہوا کیا؟ آگے تو فائدہ ملے گا؟"

گڑیا میاں نہ معلوم کہاں رہتے ہیں۔ بس آ جا کے رحم کرنا اور لٹانا خوب آتا ہے ۔۔۔ یہ نہیں معلوم کہ پیٹ میں بیٹا ہے اور بیٹے کو بھی جی لگے ہوتے ہیں، سال ہوتا نہیں ہے کہ گود بھر جاتی ہے۔ کچھ تو خیال چاہیے۔

تدبیر میاں ایسے گرم رہے کہ بی بی سے پیار کی ایک بات تو نہ کی ۔۔۔ نہانے دھونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اماں بی کو بڑی بے ڈھب بات یہ لگی کہ دنوں بعد تو میاں پلٹے اور چولہے پر جھلوتی تک نہ چڑھے ۔۔۔

اماں بی کو حلالی بی کی بات آئی ۔۔۔ میاں بی بی کے دو بستر ہو جانا برے دنوں کی نشانی ہے۔

لاکھ جہیز جوڑ جاوے ہیں ڈھیروں سونا چاندی آیا جو میاں کے پیار کی بات ہی اور ہوتی ہے ۔۔۔ میاں جو تیوہار لٹھے کی ستھنی بھی پیار سے لا کے دے تو جو تورے کے جہیز کے لہنگے میں وہ بات نہیں رہتی ۔۔۔ عورت کا دل تو بس میاں کی محبت چاہتا ہے، اس میں غریب، امیر کا سوال نہیں، دل تو خدا نے ایک سے بنائے ہیں، آرزوئیں اور تمنائیں بھی ایک سی ۔۔۔ لاکھ سسرالی واری نیاری جاتے ہوں مرد کے پیار کا ایک بول عورت کے روپ کو سہا جاتا ہے ۔۔۔ مرد کی پیار بھری سانسیں عورت کے گالوں پہ گلاب کھلا رہی ہیں ۔۔۔ تدبیر میاں غصے غصے ہی اٹھے اور چل دیئے ۔۔۔ بی بی نے بستر برابر کیا تو

تکیے کے نیچے سے مخمل کی اودی ڈبیا نکلی ــــ کھول کر دیکھا تو اس میں گلے کی نازک سی جگنی تھی ــــ اودے اودے مخمل میں جھم جھم چمک رہی تھی ــــ میاں تو دیسے ہی چلے گئے ــــ ضرور بی بی کو دینا بھول گئے ــــ ڈبیا اٹھا تو میاں پہ پیار آ گیا اور رات والی بات پر رونا۔

"کام کے آدمی ہیں ــــ بار پڑ گیا ہے اتنی جدائی میں۔ دل جل ہی جاتا ہوگا۔"

ڈبیا کھول کر پھر سے جگنی دیکھی ــــ "اگر میاں پیار سے گلے میں پہنا دیتے تو کیا جی خوش ہو جاتا" ــــ بڑا دکھ ہوا دل کو، کہ شادی کے بعد پہلی بار تو کوئی چیز لائے اور وہ بھی ایسے دم کہ غصہ چڑھا ہوا تھا۔

پھر بھی انہیں غصہ نہ آیا کہ جس کے دل پہ بیتے وہ جانے ــــ ہمارا کیا گھر کی بیٹھنے والیاں ــــ ذرا آنگن میں نکلو تو دھوپ سر پہ تپتی محسوس ہوتی ہے، اور وہ ہیں کہ بے چارے دھوپ اکاتار، جاڑے برسات، گھوڑا کواتے چلے آتے ہیں۔"

پیار سے جگنی کو دیکھا، اور چہکتی ہوئی اماں بی کے پاس پہنچ گئیں ــــ

"دیکھا اماں بی ــــ کتنی پیاری جگنی ہے۔"

اماں بی نے ہتھیلی پہ رکھ کر جگنی دیکھی اور پسندیدہ نگاہوں سے تاکتی ہوئی بولیں ــــ "کس کی ہے۔"

دلہن پاشا کے منہ پر شرم کی سرخی کھیل گئی "وہی لائے تھے۔"

"وہی لائے تھے — ؟" امّاں بی ذرا حیرت سے بولیں "تو پھر یہ ڈبیا میں کیوں پڑی ہے — اسے تو تمہارے گلے میں جگ مگانا چاہیے تھا — ؟"

امّاں بی نہیں سوچ سکتی تھیں کہ میاں کوئی چیز لائے اور وہ یونہی سرہانے پائینتی پڑی کی پڑی رہے — انہیں یاد تھا کہ جب جب بھی بڑے سرکار نے کوئی زیور بنوایا — چاہت سے لائے اور ہزار محبتوں کے ساتھ بیوی کے جسم پر سجائے۔

"ویسے ہی ذرا خرچ کی بات پر الجھے سے تھے، شاید دھیان اتر گیا ہو —"

"ایسا کیا دھیان ہے موا — ارے مرد تو جب چاہت سے کوئی چیز لاتا ہے تو سارے دھیان پیچھے رہ جاتے ہیں اور بس یہ یاد رہ جاتا ہے کہ آج بی بی کو خوش دیکھنا اور خود خوش ہونا ہے —"

دلہن پاشے مسکرانے لگیں — "آدمی ہی ٹھہرے، دھیان دھرا نہ دھرا —"

امّاں بی کا دماغ جھن جھنا اٹھا — "آج پانوں کی جھڑی بھی تو نہیں چڑھی تھی —!"

دلہن پاشے سی ہی سی مسکراتی اور ہتھیلی پہ انگلی رکھے، ٹھٹکتی ہوئی، اپنے کمرے کو جا رہی تھیں۔

آنگن کے پیڑ پر سے کائیں کائیں کرتا کوّا اڑا، اور دلہن پاشا کے سر پر ٹھونگ مارتا ہوا، اڑتا چلا گیا ۔۔۔

اماں بی کا پورا جسم کانپ گیا ۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔۔۔

ڈوبتا چاند

دولہن پاشا کے دن پورے ہو گئے ــــ امّاں بی نے صد صدقے
کہلوا دیا ــــ بیٹا میرا، بیٹی میری ــــ ہائے میرے ہی گھر جئیں گے دو
فخری بیگم نے بھی کچھ نہ کہا ــــ اور یوں کہتیں بھی کیا ــــ؟
پہلا زچگی جاپا کروا لیا سو کروا لیا ــــ کون ہر ہر بار ایسے چونچلے
کرتا پھرتا ہے اور بیٹی کا تو یہ ہے کہ بیاہی گئی اور پرائی بھئی ــــ
بیٹے پر پھر بیٹا ہوا ــــ اماں بی نے دل ہی دل میں خوشی منائی
کہ اچھا ہی ہے جو اللہ نے بیٹا دیا ــــ بیٹیاں پیدا کرکے فائدہ بھی
کیا ہے ــــ کتنی بھی محنت، محبت نیا نچھاور کرو ــــ پرایا مال
پرایا ہی ٹھہرا ــــ

اماں بی نے پوتے کو گود اب سے لگا کر پلنے میں یا شاکر بڑے سرکار کی گود میں دیا ـــ اللہ رکھے بالکل دادا کی صورت ہے۔

"بیگم ـــ ایک چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو دوسرا جل اٹھتا ہے اب دیکھو ہمارے گھر میں بھی نت نئے چراغ جل رہے ہیں، مگر یہ ننھے منے چراغ بھی حقیر نہیں ہوتے۔"

اماں بی نے اجنبی اجنبی نگاہوں سے بڑے سرکار کو دیکھا۔

"آپ ایسی بات سناتے ہیں تو میرا جی آدھا رہ جاتا ہے۔ یہ کون موقع تھا بھلا چراغوں کے جلنے بجھنے کی بات سنانے کا ـــ؟"

دنیا ہے ہوتی ہوتی باتیں ہیں بیگم ـــ ہم کیا کہیں گے؟ پیدا ہوئے پلے بڑھے، مصیبتیں جھیلیں، تکالیف اٹھائیں، پھر دن پلٹے اور نصیب جاگے ـــ اب چلتی کا وقت ہے ایسی ہی باتیں منہ پر آتی ہیں۔

اماں بی نے اپنا ہاتھ ان کے منہ پر رکھ دیا ـــ میں نہ سننے والی ایسی باتیں۔ آپ آنکھیں بند کر لیں تو میں کس کو دیکھوں گی ـــ اندھی ہو جائیں یہ آنکھیں جو آپ کو جاتا دیکھیں ـــ

بڑے سرکار نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اماں بی کے سر پر رکھ دیا۔

"دیکھو بیگم ـــ ادھر دیکھو ـــ رونے دھونے کی بات نہیں ہے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہم بڑے نصیبے والے رہے کہ ہر سکھ ان آنکھوں نے دیکھ لیا ـــ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے دل میں مرتے وقت کوئی آرزو، کوئی حسرت، کوئی تمنا باقی نہ رہے۔ اللہ کا

احسان ہے کہ اس نے خوب گزار دی۔ بس اب کیا باقی ہے؟

تیسرا بچہ تھا تو کیا ہوا؟ اماں بی کے دل کے ارمان ایسے تھوڑی ہی تھے کہ ختم ہو جاتے — دھوم دھام تو ہونی ہی ہوتی تین دن تک ہمیشہ کی طرح گانا بجانا بھی ہوتا رہا — بھلا پیدا ہونے والا بڑا ہو کر کیا کہتا کہ بڑی بہن اور بھائی کے وقت تو دنیا جوڑ لی اور میرے وقت ڈھول بھی نہ دھب دھبایا۔ چھٹے دن دھوم دھام سے کھانا بھی کھلایا —

بڑے سرکار اس دن باہر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے تھے آس پاس ملنے جلنے والے عزیز رشتے داروں کا جمگھٹا تھا۔ جو کہ ہمیشہ ہی وہیں گھیرے رہتا تھا — رشتے کے اتنے بچوں کی ایک ٹولی آتی اور رواروی ہونے لگی — گڑ چھواروں اور بتاشوں پر چھینا جھپٹی تھی — منجھو میاں، گورے گٹھے، موٹے تازے، بھولے بھالے چار پانچ برس کی عمر — ان سے بڑے بڑے بچے بھی ساتھ تھے چھینا جھپٹی میں ان کے ہاتھ ایک چھوارہ لگا — دھپ سے زمین پر بیٹھ کر وہ رونے لگے۔

بڑے سرکار کو بچے بڑے پیارے تھے — غریب کے ہوں یا امیر کے، خوبصورت ہوں، بدصورت، سبھی کو چاہتے بلکہ بدصورت اور غریب بچوں کو زیادہ ہی چاہتے — بولے —

"امیروں کے بچوں اور خوبصورت بچوں کو دنیا ہی پیار کرتی ہے
اللہ غریب اور بدصورت بچوں کا بھی تو دل ہوتا ہے۔ ان کا بھی دل تو
چاہتا ہوگا کہ کوئی ہمیں پیار کرے" اور پھر روتے بچے تو ان سے
دیکھے ہی نہ جاتے۔ لاکھ کوئی کہے "نا میاں ―― اسی طرح تو بچے
بگڑتے ہیں کہ جہاں ضد کی اور پوری کر دی" تو بولتے۔

"ارے میاں اتنی باتیں نہ بناؤ۔ تمہارے ماں باپ نے بھی
تمہاری ضدیں پوری ضرور کی ہوں گی ―― پھر ان بچوں کے وقت تم
آڑے کیوں آؤ ―― بڑے ہو لیں اللہ خود ہی سمجھ عقل دے دے گا۔"

چھٹکی نے چھوڑ کر منجو میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں میاں روتے کیوں ہو؟"

"بڑے بھائی نے ہمارے سارے چھوارے چھین لئے توڑ کے
لیے ہیں وہ بسور کر بولے۔

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ ہم تمہیں بہت سے منگوائے
دیتے ہیں ―"

جھبو کو آواز دے کر بولے "ذرا اندر سے چھوارے تو لائیو؟"

منجو میاں کے بڑے بھائی بنن میاں تیزی سے بول اٹھے

"اندر سے نہیں ―― ہم تو رفو بھائی کی نکاح خوانی میں لٹائے گئے
چھوارے بتاشے لوٹ کر لائے ہیں۔"

"رفو بھائی ―― وہ کون سے رفو بھائی؟ بڑے سرکار ذرا حیرانگی

سے بولے۔

"وہ — وہ اس دن دو بجے جب گھر اپنے ہاں آئے تھے تو —
اور گوری خالہ کو گود میں اٹھا کر لے گئے تھے"

"گوری خالہ کو گود میں اٹھا کر لے گئے تھے — ؟" بڑے سرکار نے
جیسے خواب میں بڑبڑا کر کہا —

"اپنی گود میں — ان کا دولہا آیا تھا — ؟"

"ہاں وہی تو — لیکن تو ہم ان کی شادی میں بری لے کے گئے
تھے — گئے تھے — ... جھوٹے"

بڑے سرکار نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب سہما ہو کر رہ گئے تھے۔
کسی کو حقیقت حال کا علم نہ تھا مگر بچے اور نوکر بھی جھوٹ نہیں کہا
کرتے۔ یہ ان کے دل کو خوب معلوم تھا۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولے۔

"بیچارہ — اکیلا بھی کب تک رہتا — اچھا ہی کیا جو گھر بسا لیا —
جوان بھی کا تنہا رہنا اچھا بھی تو نہیں ہے"

کیسے کاٹوں رین اندھیری

اس دن وہ جیسے آنسوؤں کا سینہ چیر کر چھوڑی تھی کہ بس بڑے سرکار تو بستر سے لگ ہی گئے۔

اماں بی زمانہ دیکھے ہوئے تھیں، آنکھوں میں دھندلاپن دھوپ میں بیٹھے بیٹھے تو نہ آیا تھا، عمر بسر کرتے تجربہ ملا تھا، بھانپتیں پہچانتیں ضرور مگر کہتیں کبھی کیا ــــ بیٹی کا غم ان کے جی کو بھی روگ بن کر چمٹا ہوا تھا۔

یہ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ مائیں بیٹوں کو زیادہ پیار کرتی ہیں اور باپ بیٹیوں پر بھی جان سے نثار ہوتے ہیں اور پھر گوری بی ماں تو سب سے چھوٹی اور سب سے لاڈلی تھی، اور یہ پیار یوں بھی شدت اختیار کر گیا تھا کہ وہ نصیبوں کے ہاتھوں دکھیا ہو کر رہ گئی تھی ــــ مگر بھی ایسی

کوئی پکی تو نہ تھی۔ کھانے کے لیے اور دھوم مچانے کے دن تھے کہ سہرے کی لڑی چڑھ گئی، مگر ملے وہ ایسے کہ دس پندرہ دن ساتھ رہے ہوں تو رہے ہوں، پھر کوکھ ہری کر، اپنے کھیل سپاٹوں میں لگ گئے۔

بڑے ماموں خیر خبر لینے پھیرا کیا کرتے تھے، دو چار دن رہ کر واپس ہوتے۔ منافع بہنوئی کی ہتھیلی پر لا دھرتے۔ بڑے سرکار کو بھی بڑے ماموں میاں پر پورا بھروسہ تھا، بہن کی ایسی محبت تھی بڑے ماموں کو کہ ساری عمر یوں ہی گزار دی۔

اماں بی جس وقت بیاہ کر آئیں ان کی آنکھ کا تارہ ٹوٹتا تھا۔ بہنوئی ملے قسمت سے وہ ایسے کہ بس دال روٹی سے خوش تھے مگر یوں نہیں کہ سالے آ ٹکتے تو عمر بھر ساتھ نباہ جاتے، ان دنوں تو کسی کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی بار ہوتا تھا۔ ویسے بڑے ماموں کا جی تو کیسے کیسے کلپتا کہ ساری عمر بہن کے پاس ہی رہیں۔

بادل برسے تو آسمان صاف نکل آیا۔ مصیبتیں گئیں تو وہ ملنے بھی گئے کہ کسی کو ایک وقت کا کھانا کھلانا بھی بار ہوتا تھا ــــ اب تو اماں بی کو گھر بھرنے کی سوجھی ــــ کیا غریب کیا امیر بھلا کے رشتے داریاں نہیں لگی ہیں ــــ کس کے خاندان میں غریب نہیں ہوتے؟ اماں بی سے بھلا دیکھا جاتا ــــ؟ چھوٹی ماں ہیں تو آپ بھی آئیے، بڑی خالہ آپ بھی آ جائیے ــــ تائی روان بھلا بڑھاپے میں کہاں جائیں۔ آپ بھی یہیں رہ جائیے ــــ پھر کسی کے نواسے، پوتے تو کسی روز کسی کی چار بیٹیاں تو کسی

کے شادی کے لائق جوان بیٹے —— وہی کچا دالان کہ جہاں سدا دھول اڑتی رہتی تھی اب اسی جگہ حویلی کھڑی تھی —— حویلی بھی کسی رنڈی کے کوٹھے کی طرح سدا آباد رہتی —— بہن سے عید ملنے کو بڑے ماموں آئے، عید ہو گئی —— ملنا ملانا بھی ہو گیا —— بیٹھے کو ہوتے ہیں تو گلے میں پھندے پڑ پڑ جاتے ہیں —— قدم ہیں کہ رکے جاتے ہیں، آنکھ ہے کہ برسی جاتی ہے —

بہن نے کہا بھی —— "بھائی میاں اب شادی کر لو تو یہ زندگی سہل کٹے"

بھرے دل سے بولے —— "نہیں بہن —— ایسا ہی شادی کرنے والا ہوتا تو کبھی کا کر لیتا —— بہن کی یاد اپنی جگہ ہے۔ اس کی کمی بھلا کون پوری کرے؟ کہنے والے کہتے بھی ہیں کہ دنیا میں ایسا بھائی دیکھا نہ سنا کہ بہن کی یاد میں پھوٹ پھوٹ کر روئے جاتا ہے، مگر کیا بولوں منجھلی ماں تو تو میرا دل تھی۔ اب دل ہی چلا گیا تو جیون بھی کیسے تو ہی بتا دے؟

بہو وہ یادیں بڑی پڑ گئیں —— ایسے بھی دل والے بھائی کہیں ہوا کرتے ہیں —— ؟" "بھائی میاں، ایسی ہی ممتا محبت ہے تو وہ کیوں نہیں جاتے میرے پاس سے؟"

بڑے ماموں کو چھوڑ کر خود تین بہن بھائیوں کی بہن تھیں — وداعی کے وقت کلا پچھاڑ کھا کے اور چھاتی پیٹ پیٹ کر روئے تو بھی —— یوں جیسے تو دل نہیں ڈھلا جاتا ہو مگر یہ تو دنیا جہان کی ریت ہے۔ سبھی کو ایک دن بھولنا پڑتا ہے سو بھول گئے۔

مگر بڑے ماموں کا حشر سب سے جدا رہا ـــــ بہن کیسے گھڑی گھڑی
بے معلوم تھا ـــــ بہانوں بہانوں سے بہنوں کو ٹٹولتے جاتے۔
کبھی جوار کا بھٹا اوٹ آئے تو کبھی گیہوں کی ہری ہری بالیاں۔ کبھی
گنّے کا ڈنٹھا ـــــ تیرے گاؤں میں تو اچھی فصل ہوتی ہے ہیں نا؟ ماں تو
ماں تھیں شادی کا ارمان لیے ہی رہ گئیں۔ بہنوں نے بھی کہا،
خود مجھلی ماں کہہ کہہ مری ـــــ مگر بولے ـــــ

"نہیں اماں ـــ ابھی تو نہیں بعد کو دیکھیں گے۔"

اب تو اماں بھی گئے کہ بار ہو گئیں ـــــ چپ رہ گئے ـــ ماموں
الجھ کر بولیں ـــ "اے ہے واہ ایسا کرنا کہ دن بھر جو ناک کٹا پاؤ گے"
سمدھیانہ بھر سے میاں ہوتا ہے۔ ناک رکھنی ہی پڑتی ہے۔
اب تک تو یہ حال تھا کہ خود مجھلی ماں کے میکے والے اونچے تھے اور قادر
میاں کی گری تھی ـــــ مگر اب وقت نے رخ پھیرا تو ہری نادر میاں
حویلی والے بابے اور سمدھیانے والے جہاں کے تہاں رہے ـــــ بہنوں کے
ان اوپڑے میں لڑکے بیٹھے والے نام دھرتے گے ـــ

"بہنوں کے گھروں پر آپڑے ہیں ـــ"

یوں اپنے گھر کے بادشاہ تھے تو ایسے تو تھے ہی کہ دسترخوان
پر ایک نہ ایک مہمان ضرور ہی رہتا ـــــ اور تم جانو مہمان گھر کا
آدمی ہوتا نہیں۔ ایک آدھ چیز تو زیادہ کرانی ہی پڑتی ہے ـــ؟
بہن بھائی کے تو سدا سے جانتے تھیں بات کچھ بھی کر گئی نہیں۔

بولیں ـــ اللہ میرا سہاگ آباد رکھو، تم مرا ہی جیئیں، بچہ جنتی ہے تو بڑے
پڑے والے پیٹ سی کھانے آتے ہیں۔ کوئی آیا کھانے، نام دھرے گا۔ ان
منہ تو ہوئے کسی کا ـــ بھائی میاں قسم ہے مولا کی، تم میرے گھر نہ رہے
تو میں قسم بٹھادوں گی ـــ ہاں۔

بھائی بہن کے آگے ہاتھ جوڑ دیتے ـــ دیکھو منجھلی ماں تجھے قسم ہے
جو ابھی بڑی قسم بٹھائی ـــ مجھے تیرا فائدہ لگے، یہ پاس کرنا نہیں ہے
جیسا تو بولے گی ویسا ہی کروں گا۔

بہن دل بڑھانے کو بولیں ـــ ایسا ہی ہے تو اپنے دیتے کوئی کام
لگالیا کرو۔ احساس نہ رہے کہ چوکھٹ کی روٹی توڑ رہے ہیں ـــ کھیتوں
کی نگرانی ہی سہی۔

بڑے ماموں کا جی خوش ہو گیا ـــ بہن کے پاس رہی دو بچے، بہن
کے بچوں کو اپنے ہی جگر گوشے سمجھتے، یوں پیار کرتے جیسے اپنے خود کے
بچے ہوں ـــ

منجھلی ماں نے دو ایک بار کہا تو بول پڑے ـــ ماں منجھلی ماں دیکھو میں
دیتا ہوں کہ مجھے شادی بیاہ کے لئے فضول مجبور نہ کرنا۔ بس یہی میرے
سب کچھ ہیں، تو خود تو مجھے اپنی بچی سی لگتی ہے، دیکھو میرا جی بھر جائے گا
بندگی سے، مجھے مجھے، دو دو کی سمجھائی تو نے ہے!

دو دو۔ خدا خیر کرے، کوئی بات ہے یہ؟ اب میں کہتی ہوں ایسی
بہن بھتیجوں کی محبت ہوا کرے تو بھائی گھر ہی نہ بسایا کریں ـــ نہیں اگر

رہ جائے میری بھاوج میرے ساتھ ——— کون منع کرتا ہے؟"

بڑے ماموں کو تاؤ آگیا ——

"دیکھ منجھلی ماں تو نے دنیا کے سارے بھائیوں کو میرے ساتھ ملا کر اچھا نہیں کیا —— میرے جیسے دل گردے کا ایک بھائی تو پیدا ہونے دے —— ہاں ۔"

بڑے سرکار کو بھی ان پر بڑا اعتماد اور محبت —— یوں جیسے چھوٹے بھائی ہوں —— بڑے سرکار نے ان کو پٹنے کے دربار میں پہنچانا چاہا بھی، مگر یہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر دور ہو گئے ——

"دیکھو میاں، دل کو لگتی ہوئی کہوں گا۔ یاد رہ جانا —— پیسے کی موہ مایا ایسی ہوتی ہے کہ اچھے اچھوں کے دل پھوٹ جاتے ہیں —— پیسہ روپیہ ہاتھ میں کھیلے گا، انسان کا بچہ ہوں فرشتہ نہیں۔ شیطان ڈولے رہتا ہی ہے، فرشتوں میں میرا شمار ہوتا نہیں، ہوش بہکے تو اپنا آپ تو کھو ہی دوں گا، تم سا بھائی اور منجھلی ماں جیسی ماں بھی چلی جائے گی —— یہ تو میں ہرگز نہ کروں گا۔"

بڑے سرکار کیسے ہنس ہنس کر چھیڑتے —— بھئی حضرت بہت ہوا دل بہلا لیا کرو، ایک آدھ گانا سن لیا تو کیا ہوتا ہے؟ اور میں تو کہتا ہوں گانا چھوڑو، کبھی رات بھی گذار لی تو کیا ہوا ——؟

"گانے بجانے اور رات دن گذارنے کا سوال نہیں ہے میاں پیسے کی دمک بڑی تیز ہوتی ہے۔ میں کنگلا ہی بھلا کہ روپیوں میں تو

بھولن — ہاں میاں آنکھ اللہ نے دی ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک تماشہ دیکھ لیا ہے —

یہ دبی دبی چوٹ بڑے سرکار کے بھائیوں پر پڑتی تھی بات ٹھیک بھی ہوتی — بڑے سرکار پھر بھی ہنس کر بول ہی گئے۔

"ارے میاں لوگ شک کرتے پھریں گے نا"

"کیا شک کریں گے — ؟ یہی کہیں گے نا کہ نامرد ہوں ؟ اچھا تو بھولن — پھر ؟؟ کسی کے گھر کی بیٹی تو کرنے نہیں جاتا نا ؟"

مذاق سے تو کہتے ہی رہتے پھر بڑے سرکار نے بھی ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا — زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا، مہینے دو مہینے میں ایک آدھ چکر شہر کا لگاتے اور منافع بھولن کی ہتھیلی پر لا دھرتے۔

اب کے شہر سے آئے تو رنگ ہی اور دیکھا — سورج لاکھ بادلوں میں چھپا رہے اس کی ہلکی ہلکی چمک تو چھپی نہیں رہ سکتی، بادلوں کا سینہ چیر کے اس روشنی کا راز کھول دیتی ہے۔ تو یہ میاں لاکھ چھپاتے گیا تے رہے، اور بڑے ماموں کو کنوارے تھے اور شریف قسم کے آدمی بھی، پھر بھی رکھ رکھاؤ سے بھانپ ہی گئے کہ ان جوانی کا بوجھ سنبھلا نہیں — چوک ہوتی اور کیسی ہوتی کہ حویلی کی بنیادوں میں ہی بلاسٹ لگ جائے —

واپسی ہوتی تو بھولن سے جا ملنا یا کہ اب کی بار بکری اچھی نہیں ہوئی منافع کیا پڑتا ہے ؟

بڑے ماموں کی زندگی کی خوشیاں اگر کسی کے دم سے تھیں تو بس بھتیجے بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں کے دم سے ۔۔۔ دیکھا مزید کہ پرندہ آنکھوں سے چھوٹا جا رہا ہے مگر منہ چھوڑ کے بولنے کی بات نہ ہوتی —— بھو... کی حالت دیکھ کر بستر سے لگے ہیں گذشتہ پر ... رخصت ہو رہا ہے کہ پتہ تک نہیں لگتا کہ بستر پر کوئی ہے بھی یا نہیں۔ بڑی ہی زندگی سے ہارے ۔۔۔ زندگی بھر بیٹھ گیا۔ خوشیاں اٹھائیں۔ اگلے وقتوں میں ہی بھر کے اپنے بھی قریب بیٹھے تبھی وہ خوشیاں ملیں مگر اب کہ ان کا ہی دم ہر دم ساتھ چھوڑنے کو ہوا جا رہا۔ بات کیسے کہہ دیں کہ پرندہ سے ... پنجرہ چھوڑنے شروع کر دیتا ہیں ۔۔۔

رات گئے تک وہ سارے ... باتیں کرتے رہے مگر بڑے ماموں نے ... بھی اپنی پریشانی ظاہر ہونے دی۔

دل دل ٹھہرا

موجو میاں بچپن ہی سے قدیر میاں کے گہرے یار غار تھے،
سیدھے سادے سے آدمی، پیدا ہوئے پلے بڑھے، جوانی آئی ماں باپ
نے جہاں سمجھ میں آیا شادی کر دی — بیوی بھی سیدھی سادی عام
سی لڑکی — کبھی ایک بستر کا دوسرا بستر نہ ہوا — لڑائی جھگڑے
کس میاں بی بی میں نہیں ہوتے —! ان میں بھی ہوتے تو دو گھڑی اداسی
آتی اور جھگڑے سے چلے جاتے — پیار کے دو بول میاں نے کہے اور بس
بی بی من گئیں —

کھاتے پیتے گھرانے سے تھے۔ چھوٹے لوگ ہمیشہ بڑوں کی نقل
کرتے ہیں وہ اچھی بات ہو یا بری — موجو میاں کے باپ نے دیکھا،

بڑے سرکار نے شہر میں دکانیں ڈلوا دی ہیں تو خود نے بھی دو چار سو کے سامان کے ساتھ شہر میں دستیوں، پائتابوں، رومالوں کی دکان لگوا دی —

چھوٹے پر ہے نہ بڑے پر — سب قسمت پر بات ہے۔ بڑے بڑے راجوں کے راجے بھیک مانگتے پھرتے ہیں اور بھیک مانگنے والے راج رچیں، سب قسمت کے کھیل ہیں — اب ان کی دکان بھی خوب چل نکلی تھی۔ موجو میاں کے چھوٹے بھائی خود نگراں تھے، کسی کو بیچ میں رکھا نہیں جو منافع آتا اپنے ہی گھر آتا۔ البتہ موجو میاں کو سمجھدار اور بڑے تھے۔ سال چھ مہینے میں ایک آدھ بار نیا مال اتروانے شہر ضرور آتے

جتنوں کے برتے بھی بھلے ہی ہوتے ہیں — اب گھر بیٹھے کو بھی بیٹھے تو سوری شیطان ہو جاتے مگر موجو میاں تھے ٹھکانے کے آدمی۔ قدیر میاں سے یہ اتنا یاری چل آتی تھی دیکھا تو بڑا افسوس ہوا کہ بال بچے دار آدمی خواہ مخواہ بیکار ہوا جا رہا ہے۔

- میاں، اتنا یاد رکھنا، عزت اور روزی کبھی ایک جگہ نہیں ٹکا کرتے۔

قدیر میاں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

- جب دل پر آ کے پڑتا ہے تب پتہ چلتا ہے، خدا سے دعا ہے کہ تم بھی کسی کی زلف میں الجھو — پھر ایسی بات کہو تو جانوں۔

- بھلے آدمی جانے پہچانے کی کون تک ہے۔ اچھی خاصی ہو گی

ہے، پیارے پیارے بچّے ہیں۔ ایک حرامزادی کے پیچھے سب کو چھوڑ رکھا ہے۔"

قدیر میاں سُرخ پڑ گئے ۔۔۔ موجو میاں سمجھ گئے۔

"تم مجھ ایک کا منہ بند کر دو گے مگر رنڈی تو چوک کی ہنڈیا ہوتی ہے جس کا جی چاہے گا چکھے گا تم کس کس کا منہ بند کرتے پھرو گے؟"

"ہاں ہاں تم بڑے بزرگ بنی کر آئے ہو نا ۔۔۔ جانتا ہوں سب جانتا ہوں کس کس کی لنگوٹی ہوتی ہے۔"

موجو میاں نے ذرا حیرت سے انہیں دیکھا۔ "رنڈی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے عقل بھی کہیں دوڑ گئی تمہاری تو ۔۔۔ بھلے آدمی گاؤں بھر میں کسی کسی نہیں معلوم کہ تم کیا کرتے؟ کیا کھاتے ہو کیا پیتے ہو ۔۔۔؟"

"میں اگر شراب پیتا ہوں تو کسی کے باپ کا کیا لیتا ہوں۔"

قدیر میاں جھینپ پڑے۔

موجو میاں کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔۔۔ "شراب؟ تم شراب بھی پینے لگے قدیر ۔۔۔!"

قدیر میاں چونکے ۔۔۔ پھر سنبھلے ۔۔۔ "اس میں حیرت کی کون سی بات ہوئی دوست؟ محفل رنگ پہ آ جاتی ہے تو سب پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں ۔۔۔ نہ ہوئے تم۔ جس دن ایک تڑپا دینے والی غزل کے ساتھ اختری نے میرا دم ہی لے لیا۔"

انتہائی غلط طریقہ ہے ہمارے بزرگوں کا ـــــ مرجو میاں دکھ کے ساتھ بولے۔ کہ شادیوں میں رنڈیاں نچواتے ہیں اور یوں اچھی خاصی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں۔

- زندگی برباد نہیں ہوئی دوست ـــــ اب آباد ہوئی ہے صحیح معنوں میں۔

- قدیر میاں لوٹ آؤ ـــــ خدا کے لئے لوٹ آؤ، ابھی تو کچھ نہیں گیا ـــــ کچھ بھی نہیں گیا ـــــ مگر وہ دن دور نہیں کہ سب کچھ چلا جائے گا ـــــ سب کچھ چلا جائے گا اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے دوست، یہ رنڈیاں لاکھوں کی جائداد منٹوں میں خاک کر دیتی ہیں اور پھر بھی محبت نہیں کر سکتیں۔

- یہ نصیحتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی دوست۔ قدیر میاں لاپرواہی سے بولے۔ اس وقت تو جیب میں کچھ ہو تو دلا دو۔ تمہیں معلوم ہے بندے نے کبھی کسی کی پائی بھی نہیں رکھی۔

- پائی کا یا لاکھ کا سوال نہیں ہے قدیر ـــــ تم اگر مانگو تو جان بھی حاضر ہے مگر ایسے کاموں کے لئے تو میں ایک دمڑی بھی نہ دوں ـــــ ایسے دوست جو کہ ایسی غداری نہیں کرتی۔

- بہت ہمدرد ہو گئے ہو میرے۔

- تمہیں معلوم ہے چچا میاں کی حالت دن بدن گرتی جاتی ہے۔ تم ہی ایسے ہو کہ حالات پر قابو پا سکتے ہو، بڑے میاں کا آخری وقت

ہیں تو سکو دے دوں میاں، وہ بھی دعا ہی دے دیں گے برا تو نہیں چاہیں گے ــــ بعد میں تو تم ہی تم ہو گے

" اور کچھ ؟" طنز بھرے لہجے میں قدیر میاں بولے ۔

" میں کوئی مولوی ملّا تو ہوں نہیں کہ وعظ جھاڑتا پھروں ــــ"

مو جو میاں ذرا الجھ کر بولے ۔" ہاں دوست ناطے ایک بھلی بات کہہ دی۔ یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ میں گاؤں جا کر ساروں میں کہتا پھروں گا کہ قدیر میاں بہک گئے ہیں ــــ جسے خود اپنی پرواہ نہیں دوسرے کیا کریں گے ۔ حد یہ ہے کہ خدا بھی ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیتا "

اختر کی پائلیں کئی دنوں سے سنار کے گھر پڑی تھیں بات یہ ہوئی تھی کہ شہر میں آگرے سے کوئی رنڈی دو تین دن کے لئے بلائی گئی تھی۔ اس کے ٹھاٹ باٹ شہر والیوں نے بھی دیکھے ــــ سب سے زیادہ جی کو بھائیں اس کی پائلیں، جن میں جھڑ جھڑ کرتے گھنگھرو لگے تھے۔ اختر نے دبے دبے لفظوں میں اس کی تعریف کی تھی اور قدیر میاں بس تل گئے کہ یا تو پائل آئے گی نہیں تو جان جائے گی۔

اب اختر لاکھ منع کرتی بیٹھی یہ سنتے ہی نہیں۔ جب تو اس وقت ہاتھ میں تھا نہیں، سنار کو نمونہ بتا دیا اور کہہ دیا کہ ابھی کے سو دو سو رکھ لے اور سونا اپنے پاس سے لگا کر پائلیں بنا دے ــــ ناپ تو میں تو ہی دستیاب ہو گا ۔

اب سنار کا آدمی بار بار سندیسے لاتا تھا کہ اپنی چیزیں اٹھا لیں مگر ان کی جیب ہلکی ہو رہی تھی۔ موجو میاں نے الگ ہاتھ دکھایا — غصّہ تو بڑا آیا پر پرائے آدمی پر کیا بس چلا بیٹے — حامد میاں کو مدت ہوئی نکال باہر کیا تھا۔ دوکان یوں ہی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی ہاتھ تنگ تو تھا ہی — اختر کے سامنے نیچے بھی نہ پڑنا چاہتے تھے، مگر دیکھو شہر کا ایک دوکاندار کئی مرتبہ بات کر چکا تھا — اٹھتے بیٹھے سارے کاغذات انہی کے نام سے ہوا کرتے تھے۔ اِدھر اُدھر توڑ جوڑ ملائے اور لاکھ کی دوکان خاک کر دی —

"رنگ رنگ خواب مرے"

یہ اسی دن کی بات ہے جس دن قدیر میاں نے دوکان اُٹھا دی تھی —

شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور حویلی پر ایک پژمردہ سا سناٹا چھایا ہوا تھا — دھوم مچاتی ہوئی حویلی، سہمی سہمی سی دکھائی دے رہی تھی، بیٹھک کے ساتھ والے بڑے کمرے میں جہاں بڑے سرکار کا اٹھنا بیٹھنا تھا، ایک بڑا سا پلنگ پڑا ہوا تھا جس پر بڑے سرکار لیٹے ہوئے تھے — کمرے میں گہرے رنگوں کی شطرنجی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے میں چھوٹا سا تخت بچھا ہوا تھا — اس پر جاء نماز — پاس ہی تسبیح رکھی ہوئی اور چاندی کی رحل پر قرآن شریف — یہی

بڑے سرکار کے نماز کی جگہ تھی، صبح کی نماز تو وہ مسجد میں پڑھتے اور باقی اکثر نمازیں گھر ہی پر ہوتیں —

بڑی بڑی آنکھیں، جنہوں نے زمانے کے غم اور خوشیاں دیکھی تھیں، بند تھیں، پلکیں بار بار کانپتیں اور پھر وہ وحشت سے آنکھیں کھول دیتے — پاس ہی کرسی پر حکیم صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی بے تاب نگاہیں بار بار آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں پر پڑتیں اور پھر بڑے سرکار کے چہرے پر تھم جاتیں۔

"حکیم صاحب۔ میں مروں گا نہیں" بڑے سرکار ان کی پریشانی بھانپ کر، ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولے "مرتے وہ ہیں جنہیں کوئی دکھ ہوتا ہے، غم ہوتا ہے، پریشانی ہوتی ہے۔ اولاد کے دکھ کا بوجھ وہ سہار نہیں پاتے اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ میں بہت قسمت والا ہوں حکیم صاحب اور پھر اللہ کے فضل و کرم سے خوشحال بھی۔ مجھے موت آئے تو کیا آئے"

بڑے ماموں میاں نے درد سے بھری آواز میں کہا "اللہ ایسا ہی کرے میاں — اور ایسا ہی ہوگا — "

حکیم صاحب نے تردد کے ساتھ بڑے سرکار کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا — اور پریشانی سے سر ہلا کر بڑے ماموں کی طرف دیکھنے لگے۔

دو چار دن اور گزر گئے — بڑے سرکار کا وہی حال رہا — بار بار تقدیر میاں کو یاد کرتے — غنودگی کے عالم میں ان کا نام لے کر پکارتے اور ذرا جب حواسوں میں آتے تو اپنے آس پاس اتنا جمگھٹا

دیکھ کر، دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے بولے —

"قدیر میاں پاس ہوتے تو اچھا تھا — دل چاہتا ہے وہ سامنے رہیں — مگر اچھا ہے کام کے آدمی ہیں کام ہی میں لگے رہیں، ادھر ادھر بھٹکتے رہنے سے دل بھی جگہ پر نہیں رہتا۔"

بڑے سرکار کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی، دل میں درد سا اٹھتا اور وہ ضبط بار بار دبا لیتے، وہ چھپا لیں کر تھا، لیکن ویسے مگر بڑے ماموں میاں بھانپ گئے اور حکیم صاحب کو بلا ہی لائے — دو چار دن سے یہی عالم تھا — اور بس قدیر میاں کی یاد کا گلہ — بڑے ماموں میاں نے حبیب خان کو گھوڑا دے کر شہر روانہ کر دیا۔ چھوٹے میاں کو لینے آئیں اور ممکن ہوا تو ساتھ میں شہر سے کسی اچھے ڈاکٹر کو بھی لیتے آئیں —

قدیر میاں اُنکے پہلا بچے، ہوسٹل سے نکلتے ہی تھے کہ حبیب خان گھوڑا لئے آ پہنچے — اُسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ذرا ٹھٹکا پھر اطمینان سے بولے —

"خیر تو ہے —؟"

"کہاں کی خیر میاں — بڑے سرکار، بہت بیمار ہے ہیں" وہ آنسو پیتا ہوا بولا —

"مجھے تو کوئی خبر ہی نہیں —" وہ فوراً تشویش سے بولے۔

"بڑے سرکار خود ہی یاد کرتے رہے اور خود ہی منع بھی کرتے رہے اچھا

تو ماموں میاں نے مجھے بھجوا دیا ہے کہ آپ کو لیتا آؤں۔"

کرائے کی گاڑی کر، ڈاکٹر کو ساتھ لے، جب قدیر میاں گاؤں پہنچے تو دھوپ اتر رہی تھی۔

حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی آپس میں جانے کیا کیا باتیں ہوئیں مگر بڑے ماموں بھانپ گئے کہ اس پرشکوہ عمارت کا سب سے مضبوط ستون، اب اس عمارت کو کھوکھلا بنانے والا ہے۔

قدیر میاں کو دیکھ کر بڑے سرکار کے چہرے پر رنگ سا چھایا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ان کے ہونٹ بھینچ گئے — قدیر میاں کو پاس بلا کر انہوں نے بڑے وقار سے پوچھا۔

"اب کے کتنا منافع ہوا میاں —؟"

قدیر میاں نے کوئی جواب نہ دیا — دیر بعد بولے۔

"ابا میاں — پہلے آپ اچھے ہو جائیے، آپ کی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ یہ وقت ایسا ہے کہ آپ خاموش رہیں، باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

"اب کے کتنا منافع ہوا میاں —؟" بڑے سرکار نے اس انداز سے پوچھا گویا وہ پہلی بار پوچھ رہے ہوں اور قدیر میاں کی کوئی بات انہوں نے نہ سنی ہو —

"ابا میاں۔ میں نے کہا نا —؟"

بڑے سرکار ذرا سا اٹھے — تکیے کا سہارا لیا، اپنا ہاتھ

قدیر میاں کی پیٹھ پر رکھتے ہوئے بولے۔

۔۔ اب کے کتنا منافع ہوا میاں ۔۔؟

قدیر میاں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ بڑے سرکار کی آنکھوں میں اندھیرے جھیل رہے تھے۔

بڑے سرکار مضبوط سی آواز میں بولے ۔۔ تم نے دوکان بیچ دی ہے نا میاں ۔۔؟

قدیر میاں سہم کر ذرا پیچھے ہٹے مگر بڑے سرکار نقاہت کے باوجود تیز آواز میں کہے گئے ۔۔

۔۔ مجھے معلوم تھا ۔۔ آج سے نہیں کل سے نہیں، بلکہ اس دن سے معلوم تھا جب تم نے حامد میاں کو نکال باہر کیا ۔۔ میں اسی دن جان گیا تھا ۔۔ وہ ذرا کی ذرا سانس لینے رکے ۔۔

۔ میں اسی دن جان گیا تھا جس دن تم کاؤں آئے تھے اور بار بار دوکان اٹھا دینے کو کہتے تھے۔ اتنی بڑی بات کوئی یونہی نہیں کہا کرتا میاں ۔۔ تم کوئی دوسرا کاروبار کرنا چاہتے تھے نا ۔۔ یہی کاروبار تھا نا تمہارا کہ دوکان کے منافع سے رنگ رلیاں مناتے رہو ۔۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا ۔۔ مجھ سے کسی نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا، مجھ سے میری عمر، میرے تجربے نے کہا ہے ۔۔ یہ بال یہ بال جنہیں مصیبتیں جھیل جھیل کر سفیدی بخشی ہے، یہ بال بھی بھاری برف ڈھلی ہوئی ہے، یہ اعضا، یہ اعضا جو آج کمان کی طرح

جھکے ہوئے ہیں، یہ دل جو آج رہ رہ کے دھڑک اٹھتا ہے یہ مجھ سے کہتا رہا ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے — میں اسی دن جان گیا تھا کہ تم شہر میں کیا کرتے رہے ہو؟ میں جان بوجھ کر ٹال گیا میں اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا صرف اس لئے کہ ممکن ہے تم سنبھل جاؤ بال بچے والا آدمی "کسی کے سمجھانے سے نہیں سمجھا کرتا — اپنی محبت اپنی عقل، اپنا مستقبل خود نگہبانی کرتا ہے — مگر تم —

ایک لمحے کو رک کے پھر اسی گرج کے ساتھ کہنا شروع کیا:

"تم نے کچھ دیکھا، مجھ سے کون کہتا؟ میں خود بھانپ گیا تھا کہ تم کدھر جا رہے ہو — اور یہ بھی سمجھ رہا ہوں کہ تم نے دوکان بیچ دی ہے اور پیسے کھرے کر لئے ہیں — پیسے کھرے کر لئے ہیں تاکہ اس کیلئے زیور بنوا سکو — رنگین کپڑے خرید سکو اور —

قدیر میاں نے بری طرح چونک کر باپ کو دیکھا۔

"میں تو اسی دن سے جان گیا تھا جب کہ تم آئے اور باہر دیوان خانے میں رات گذاری — بیٹا یہ سفیدی عمر نے دی ہے دھوپ نے نہیں — ہفتوں بعد مرد بیٹے، بیوی سے چھوٹا ہوا اور دیوان خانے میں اپنی بیج سجائے — تم نہیں سمجھے ہوگے کہ میں اتنا چالاک ہو سکتا ہوں — ایک بوڑھا جو تمام زندگی کی نگاہوں میں بے بس ہوتا ہے وہ اتنی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے؟ وہ بے چاری اندر ہوتی اور تم باہر — یہ تمہارا کیا میل تھا — تم نے کسی اور

کی آغوش کی گرمی ڈھونڈھ لی ہے اسی لئے تم بھٹکے جاتے ہو، بات یوں کرتے ہو جیسے کسی سے ڈر رہے ہو — تم سہمے سہمے سے دکھائی دیتے ہو اس لئے کہ تم ایسے ہرن ہو جس کا پیچھا کوئی شکاری ضرور کر رہا ہے، یہ تمہاری غلطی تھی بیٹے کوئی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکتا تھا — تم اپنے مالک آپ تھے — یہ تمہاری جھجک بالکل غلط چیز تھی۔

اگر تم اپنے آپ کا خیال نہ کر سکتے تھے تو ان بچوں، ان معصوم جانوں کا تو خیال ہوتا جو دن گذر جاتے ہیں اور باپ کی صورت کو ترس ترس جاتے ہیں — اس بے بس عورت کا تو خیال کیا ہوتا جس کی سیج بھی تمہارے ہی دم سے سجتی ہے — تم تو ادھر اُدھر بھٹکو اور وہ غریب اپنے احساسات اپنے جذبات کو کیا کرے — ؟ گھر چھوڑ کر نکل جائے — ؟ دیوروں جیٹھوں کی بغلیں گرم کرتی پھرے — ؟ کیا تم... کیا تم...

ڈاکٹر صاحب نے سہارا دے کر ان کو لٹا دیا۔

"آپ کے لئے اتنا بولنا چالنا ٹھیک نہیں ہے صاحب، اس سے بیماری بڑھ جائے گی۔"

"بیمار کون ہے ڈاکٹر صاحب" — بڑے سرکار ہلکے سے مسکرائے "میں نے اپنی زندگی میں کوئی بیماری نہیں جھیلی۔ یہ اپنے پرائے چھوٹے بڑے غم ہیں کہ دل کو لپٹ پڑے ہیں — اسے آپ بیماری سمجھتے ہیں — ؟"

تدبر میاں چپ چاپ بیٹھے تھے ان کا ذرا سا منہ نکل آیا تھا۔
نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔

- میں تم سے کوئی بات نہیں کہنا چاہتا ـــ ماشاء اللہ سے سمجھدار ہو ـــ مگر اتنا یاد رکھو کہ اس گھر کے بڑے تم ہی ہو گے۔ اس گھر کے ہر فرد کی ذمہ داری تمہارے کاندھے پر پڑتی ہے۔ تمہاری ماں کی جس نے نو ماہ پیٹ میں رکھ کر تمہیں دردوں سے پیدا کیا ـــ اس بیوی کی جس نے تمہارے لئے اپنا گھر چھوڑا ـــ اپنا دیس چھوڑا ـــ ماں باپ بھائی بہن اپنے پرائے چھوڑ دیئے ـــ اور تمہارے لئے بچے پیدا کئے۔ اس بہن کی، جس نے دنیا کا کوئی سکھ نہ دیکھا اور بڑھاپے کی حدود میں آ گری ـــ اس کی آنکھیں بھی کبھی دیکھیں ـــ ؟ جن آنکھوں میں اس عمر میں جوانی کی چمک اور شوخی ہونی تھی وہاں آنسو اور سنجیدگی ہے ـــ زندگی بہت بڑی ہے میرے لال۔ بہت بڑی اس میں دکھ بھی اتنے ہی ہیں جتنے کہ سکھ ـــ میں تم سے کیا کہوں۔ اب میں تم سے کچھ کہنے کے لئے کبھی نہیں آؤں گا۔ کبھی نہیں آؤں گا۔

بڑے ماموں میاں نے چونک کر بھنو کی طرف دیکھا جو تھکان کے باوجود کہے جا رہے تھے۔

- بس یہ نہ بھولنا میرے بیٹے کہ اس حویلی کی بنیاد میں پانی نہیں تمہارے باپ کا خون تھا ـــ ارمان تھے، آرزوئیں تھیں اور زندگی تھی ـــ اس زندگی کی لاج تمہارے ہاتھ ہے اسکی زندگی جس کی گود میں

ہزاروں زندگیاں زندہ رہیں اور رہ رہی ہیں ۔"

تقدیر میاں یوں بیٹھے تھے گویا ہر احساس سے عاری ہوں جیسے سُن رہے ہوں نہ سمجھ رہے ہوں۔

"ہم نے اپنے باپ کی آرزو پوری کی جن کا دل چاہتا تھا کہ اس چھپر کے نیچے کوئی چھوٹی موٹی سی عمارت کھڑی کریں — ہم نے کچھ نہیں کیا بیٹا۔ ہمارے اللہ نے کیا۔ جس جگہ چھپر تھا آج وہاں اتنی بڑی حویلی ہے۔ یہ حویلی بھی سجائی ہے جیسے کوئی دلہن — یہ دلہن بیوہ نہ ہو جائے۔ ابھی اس نے سکھ ہی کیا دیکھا ہے؟ ابھی تو ایک پشت گذری ہے۔ آئندہ یہاں سے بڑی بڑی ہستیاں نکلیں گی — بیٹا تقدیر سنو میں تم سے صرف تم سے اس دلہن کا سہاگ چاہتا ہوں — میں نے اپنے باپ کی بات کی لاج رکھی تم اپنے باپ کی بات کی لاج رکھنا۔"

بڑے سرکار کا دم چڑھ آیا تھا۔ حکیم صاحب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر گم سم سے تھے — ڈاکٹر نے اشارہ کیا تو دھیرے سے بولے۔۔

"اب مت روکئے ڈاکٹر صاحب — یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ان کی زبان بند کی جائے۔"

بڑے سرکار نے ذرا سا سر گھما کر ادھر ادھر کا جائزہ لیا — اماں بی سامنے ہی ذرا سے فاصلے پر دبی دبی ہچکیوں کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں —

"آپ نے تو اس دلہن کا سہاگ چاہ لیا اور جو اس دلہن کا سہاگ لٹا جا رہا ہے — کتنے برس ہوتے ہیں اس ساتھ کو، جو اس اٹوٹ بندھن کو — کوئی جھٹکا ایسا نہ لگا کہ اس مضبوط بندھن کو توڑ دیتا — میرے خدا، میرے مالک اس نتھ کی لاج تو ہی رکھیو۔"

ہلکی پھلکی سی تین ماشے کی نتھ بی اماں کے کلیجے سے لگی ہوئی تھی۔ شادی ہوئی اس وقت بڑے سرکار کی حیثیت اتنی کہاں تھی کہ ماں بہو کے لیے ڈھائی تیرہ تولے والی نتھ لے جاتیں۔ یوں خاندانی ریت نبھانے کو نتھ لے جانا ضرور تھا سو تین ماشے کی ہی چڑھا دی —

بی اماں کو یاد تھا کہ شادی کے بعد ایک بار برے دن پڑ گئے تھے — براتی کے لیے اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کھیت سوکھے تو زیور رکھے جا سکتے تھے — گھر کی ساری بری بھلی چیزوں پر آفت آئی — نہ دیکھا تو نتھ کی طرف۔

"سہاگ کی نشانی اور بزرگوں کے گھر بڑے — گھر سے نکلے ہی کیوں — اللہ نہ وہ وقت لائے۔"

اب وہ نشانی نہ باقی تھی مگر وہ بھرپور سہاگ ہی لٹا جاتا تھا جس نے اس بڑھاپے میں بھی زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بنا رکھا تھا۔

بڑے سرکار نے بند آنکھیں کھول لیں اور پھر بند کر لیں —

ان کی پلکیں کانپ رہی تھیں —

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں — میں بالکل اچھا ہوں — میں بالکل اچھا ہوں — میں بالکل اچھا ہوں"

اماں بی بیکل ہوتی بڑھیں — ادھر سے گوری ماں، رقیہ ماں، خالہ پھوپھیاں، بچی، تائی، لڑکے لڑکیاں، اس وقت وہ شرم اماں بی سے برسوں دور تھی جو ان سے سما لگی لپٹی رہی — کبھی کسی کے سامنے بڑے سرکار سے منہ اٹھا کے بات نہ کی۔ جب کبھی ہلکا سا پلو سنبھالتی ہوتی تھیں۔ ساس نندوں کی موجودگی میں میاں کے سامنے ہلکی سی ہنسی بھی منہ پہ نہ بکھری۔

بال الجھے الجھے — آنسو برساتی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں پلو پیچھے پیچھے گھسٹتا ہوا اور جھپٹتی ہوئیں —

"میں نہیں جانے دوں گی — نہیں جانے دوں گی — میرا دل پھٹ جائے گا — میری آنکھوں کی روشنی چلی جائے تو میں اندھی ہو کر کیسے جیوں گی — ؟"

بڑے سرکار نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور تالوں کو دیکھا۔

لال لال پردہ اٹھا اور دولہے میاں کمرے میں داخل ہوئے۔ چھوٹے سے پلنگ پہ چھوٹی سی دلہن لجائی سی بیٹھی تھی — پھولوں کے مہکتے گجرے اور عطر اور الائچی کی خوشبو —

دولہا میاں نے گھونگھٹ کا ذرا سا کونا اٹھا کر منہ دیکھنا ہی

چاہا تھا کہ گٹھری سی دور سرک گئی —

"افوہ — اتنی شرم ہے تو اتنی ہی ہے جو نبھے"

گٹھری اور سرکی — یہ اور قریب آئے — پتنگ کی بساط ہی کتنی — دونوں پاس پاس ہو گئے — "دیکھو آج ہم کس قدر قریب ہیں — دعا کرو کہ اللہ سدا یوں ہی رکھے!"

دولہن شرمائی لجائی اور زیادہ جھک گئی — دولہا میاں نے اپنے ہاتھوں سے گھونگھٹ بنا کر منہ کھول دیا —

"میں تو آج تک یہ سمجھتا تھا کہ چاند آسمان پر چمکتا ہے مگر لگتا ہے کہ میں بھی اتنے دنوں بدھو ہی رہا"

زمین پر آتے ہوئے چاند نے اپنی نگاہیں اٹھائیں "اور میں یہ سمجھتی تھی کہ سورج صرف آسمان پر ہی جگمگا سکتا تھا۔ لیکن یہ جھب کا اجالا دیکھ کر مجھے کچھ اور بھی سوچنا پڑا" — گھونگھٹ پھر رخ روشن پر چھا گیا۔

"چاند پھر بادل کی اوٹ میں —؟" دولہے میاں نے مسکرا کر گھونگھٹ بالکل ہی کھول دیا اور اپنے ہاتھوں گلابی ناک میں نتھ پہنا دی۔

"تم نے ابھی ابھی مجھے سورج مانا ہے نا — دیکھو یہ اسی سورج کی ایک کرن سی تمہارے ناک میں چمک رہی ہے، اب میں تمہیں دعا دیتا ہوں کہ سدا روشنی سے کھیلو"

دولہن نے اپنا کپکپاتا کلیجہ تھام لیا اور دل ہی دل بولی۔

"اللہ — یہ سورج سدا میرے آنگن میں جگمگاتا رہے۔"
گھونگھٹ پھر سایہ کیے ہوئے تھا — لال لال ستاروں بھرا گھونگھٹ — چمکتی ہوئی مانگ — کاجل سے بھری آنکھیں مخمور آنکھیں، پھولوں سے لدا جسم — پھول کھل رہے تھے مہک رہے تھے — سارے میں خوشبو اڑ رہی تھی —

بڑے سرکار نے بند آنکھیں کھولیں — پلکیں آپ ہی آپ پھر مند گئیں —

کہیں سے سفید سفید بادل آئے — ہوا کے زور سے لال لال گھونگھٹ اڑ گیا اور سفید بادلوں نے اس کی جگہ لے لی — چمکتی ہوئی افشاں کے ذرے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ آنکھوں کا کاجل پھیکا پڑ گیا — پھول مرجھا گئے — وہ جگمگاتا سورج غروب ہو گیا —

بڑے ماموں کے ہونٹ دانتوں میں بھنچے ہوئے تھے انہوں نے بڑے کرب کے ساتھ بہن کو دیکھا اور اٹھ کر نماز شروع کر دی —

"اب یہاں کوئی نماز نہیں پڑھے گا۔"
اماں بی نے مڑ کر دیکھا —
بڑے ماموں نے قرآن شریف اور رحل اٹھا کر طاق میں رکھ دی —

"اب بڑے سرکار کبھی قرآن شریف نہیں پڑھیں گے۔" اماں بی کھڑی ہو گئیں —

"بڑے ماموں نے تسبیح اٹھا کر کیل سے لٹکا دی۔

"اب بڑے سرکار تسبیح پھیرنے کے لئے کبھی اس کمرے میں نہیں آئیں گے — کبھی نہیں۔"

اماں بی پتھر کی طرح ساکت اور جامد کھڑی تھیں ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے، آنکھیں پھٹی ہوئی، اور چہرہ سفید اور ستا ہوا۔

بڑے ماموں قریب آئے — اور قریب — اور قریب۔ پھر بہن کا ہاتھ پکڑ کر بولے —

"دیکھو — یہ کمرہ دیکھو — یہاں کچھ نظر آتا ہے — میں نے کہا تھا۔ منجھلی اماں اب یہاں کوئی نہیں آئے گا — اس آرام کرسی پر کوئی نہیں بیٹھے گا — اس تخت پر کوئی اپنا ماتھا نہیں رگڑے گا۔ یہ حقہ دیکھتی ہو — ؟ یہ لے — اب اسے کوئی نہیں چھوئے گا۔ خدا اور سامنے آ منجھلی اماں — یہاں دیکھو — کتنا اندھیرا پڑ گیا ہے۔ یہاں اماں — یہاں چراغ جلا دے — آنسوؤں کے ہی سہی۔ اجالا تو ہو جائے گا — ارے منجھلی اماں — یہاں اندھیرا پڑ گیا ہے — تیرا دولہا مر گیا ہے — تیرا سہاگ لٹ گیا — تیرے گھونگھٹ کا لال رنگ سفید پڑ گیا — تیرے ہاتھ کی کانچ کی چوڑیاں کرچی کرچی ہو گئیں تو بیوہ ہو گئی ہے منجھلی اماں — تو بیوہ ہو گئی ہے!

اماں بی نے سوئے ہوئے انداز سے سر کا پلو کھینچا اور آنکھوں کے سامنے کر لیا —

• لال رنگ سفید پڑ گیا ہے؟

• ہوں — وہ بچوں کی سی معصومیت سے بولیں — میں بیوہ ہو گئی ہے؟؟

• میں بیوہ ہو گئی ہے!!

• بھائی میاں — اماں بی نے ایک جگر کے پار اتر جانے والی دلدوز چیخ ماری — میرا سورج مجھے واپس کر دو جسے میں برسوں اپنے آنچل میں چھپائے رہی — میری روشنی لا دو بھائی میاں — تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو نا بھائی میاں میری اتنی سی بات پوری کر دو۔ میرا سورج لا دو — میرا سورج —..

شام کا پیلا گہرا سناٹا بن کے حویلی پر چھا رہا تھا۔ ندی کے اس پار سورج غروب ہو چکا تھا۔

نینن جوت بھی کھودی سجنا

جب آنکھوں پر جوانی کا بھوت چڑھتا ہے تو بینائی بھی جیسے
زائل ہو جاتی ہے — قدیر میاں کی آنکھوں اور دل پہ
اندھیرا چھایا ساری دنیا بھول بیٹھے — نہ یہ خیال رہا کہ بیوی
ہے نہ یہ خیال آیا کہ ننھے بچے ہیں — بس جو ہے میرا ہے —
لاکھوں کا دھنی ہوں میں

اب میرے ابا کا کیا گیا — رنڈیوں کے پیچھے ہیں بہت سارے
دین سے تو گئے ہی تھے کیا دنیا سے بھی گیا — کس کی محبت کہاں کی غیرت۔
باپ کا مرنا بجائے اس کے کہ خون کے آنسو رلاتا — یہ اور سے کھلے جا لگے
ہوگئے — یہ سمجھ لیا کہ بینک کا تالا تھا جو کھل گیا — وہ دونوں کا

لٹکا ہوا کانٹا نکلتا ہے تو اس کی بھی قدر اکسک محسوس ہوتی ہے، ان کے جانے تو جیسے عید ہو گئی — یوں منہ دستی میں چھپا کے روتے نا تو دنیا سمجھتی بھی بھلا کیسے کہ باپ کا غم ہوا ہے۔ دسواں، چالیسواں بھی خوب زور شور سے کیا — بس باپ کا اتنا ہی حق لگتا تھا جو پورا کر دیا — اب کیا رہ گیا — جو مرنے والے مر گئے، اپنے ساتھ کوئی قبر نہ لے گئے — جی بھر کے خوشیاں منائیں — کس بات میں ان کے لئے دل لٹکایا جائے — یہ زندگی تو اپنی ہے۔

باپ کی زندگی میں ہی ان کا کیا ڈر تھا — اب تو خود ہی مختار تھے — پہلے اگر مہینے میں ایک بار گاؤں جایا کرتے تو اب چار مہینے میں ایک بار پلٹتے — پلٹے تو پلٹے، نہیں تو اس کی بھی فکر نہیں۔

ایک دن موجو میاں اپنے کاروبار کی خبر لینے شہر آئے ہوئے تھے — رستے میں قدیر میاں سے مڈبھیڑ ہو گئی — کنکھیوں چلے جا رہے تھے — نہ چہرے پر کسی کے لئے غم کا تاثر، نہ آنکھوں میں کسی کے لئے ہمدردی — موجو میاں نے سلام کر کے مزاج پوچھے تو گھڑی کی گھڑی رک گئے — موجو میاں اس انتظار میں ہیں کہ اب بیوی، بچوں، ماں کی خیریت پوچھتے ہیں، تب پوچھتے ہیں، وہ تو یونہی ادھر ادھر کی ہانکتے رہے — پانچ دس منٹ کھڑے رہے، پھر ہوں ہاں کر کے بڑھ لئے۔

"اچھا تو پھر چلتے ہیں، ذرا کام ہے۔"

"کیا کام ہے ایسا؟" سوجو میاں نے خواہ مخواہ ٹانگ اڑائی۔

"وہاں سے ملنا تھا۔"

"وہاں سے؟" سوجو میاں حیرت سے بولے۔

"اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔۔۔ مکان کے سلسلے میں ملنا تھا۔"

"مکان؟" سوجو میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر بولے۔

"کیوں بھلا؟"

"پھر کل ہیں بھی بھلا کتنے دن۔ پھر دن گنا۔"

سوجو میاں چپ نہ رہ سکے۔ "اور جو یہ پوچھو تو میاں تمہیں شہر بسنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔ دوکان تھی سو تم نے بڑھا دی۔۔۔ کپڑے کی دوکان تو زمانہ ہوا ختم ہو گئی۔۔۔ اب ہیں دیکھو تو شہر میں ایسا کاروبار ہی کیا ہے کہ تم رکو۔"

"کیوں۔۔۔ جلد ساز کی دوکان نہیں ہے کیا۔۔۔؟ جیسی بھیس ہزار سے کیا کم مالیت کی رہی ہو گی۔"

سوجو میاں تیزی سے بولے۔۔۔ "اگر آپ کا کرم شامل حال رہا تو وہ بھی دو دن کا پار ہو جاتی ہے۔"

قدیر میاں نے انہیں ذرا غصے سے دیکھا۔ "ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کر رہے ہو۔۔۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔"

"بھابھی، بچوں سے جا کر ملو ۔۔۔ خود ہی سمجھ آ جائے گی" چڑھ کر موجو میاں بولے۔

"اوہو ۔۔۔ بہت خیال والے ہو گئے ہو"

"یقیناً ۔۔۔" وہ بات پر زور دے دے کر بولے۔ "اور اس طرح تو رنڈیوں کے چکلے میں نہیں پڑا ہوں ۔۔۔ گھٹی کا ناچ تمہارا نکلا چھوڑ دیگی۔ دیکھ لینا ایک دن ۔۔۔" سر پہ دھوپ چمک رہی تھی ۔۔۔ موجو میاں ذرا گرم ہو کر بولے ۔۔۔ "ذرا اس دھوپ کو مٹھی میں بند کر کے دیکھو۔ آتی ہے کیا ۔۔۔؟"

"میاں ۔۔۔ میں نے اپنے باپ کا کہا نہیں مانا تو تم تو ذرا دور کے ہو" پھر ان سے تو قدیر میاں صاف سیدھے لفظوں میں بولے۔

"تم جیسوں پر غصہ ہونا حماقت ہے ۔۔۔ رحم البتہ ضرور کھایا جا سکتا ہے" موجو میاں ہمدردی سے بولے۔

تین دن بعد قدیر میاں شہر سے لوٹے تو اموں میاں بیٹھک میں ہی بیٹھے تھے۔ کچھ کاغذات ان کے سامنے دھرے ہوئے تھے اور وہ دیکھ بھال کر رہے تھے۔

اموں میاں کے سامنے انہوں نے اپنی تجویز رکھی تو ان کی آنکھوں تلے گہرا اندھیرا چھا گیا۔

"میں زبان تو نہ ہلاتا مگر تم نے ساری پونجی ہے اس لئے کہتا ہوں

کر کری فائدہ تو نظر نہیں آتا اس میں "

" فائدے نقصان کا آپ مت سوچئے ۔ یہ بتائیے سولہ ہزار میں اتنی بلڈنگ مہنگی ہے یا سستی "

ماموں میاں نے پھر تیسری ہی بات سنائی — مگر میاں اتنی بڑی بلڈنگ میں رکھو گے کیسے — ماشاء اللہ سے میاں خود اتنی بڑی حویلی ہے اور اگر کبھی شہر چل دیں تو یہاں پر کھیتوں کی نگرانی کون کرے گا — زمین جائداد سب ہی کچھ تو یہاں پہ ہے — اور پھر بھلی اماں تو یہ گھر چھوڑ کر مرتے قدم نہ نکالے گی "

" آپ کو کس نے کہا کہ میں پورے خاندان کو سمیٹ رہا ہوں "

تدبیر میاں تنک تنک ہو کر بولے —؟

" تو کیا تم اکیلے رہو گے —؟ ماموں میاں حیرت سے بولے ۔

" پھر سب کو لے جا کر کروں گا بھی کیا "

" تو میاں پھر اتنا بڑا گھر لینے کی ضرورت بھی کیا ہے " ماموں میاں ملاحت سے بولے ۔

سختی سے تدبیر میاں بولے — ضرورت ہو گی تبھی تو لے رہا ہوں — ذرا نرم پڑ کر بولے — ابا میاں کی تجوری کی چابی کس کے پاس ہے —؟

" سب کچھ میرے ہی پاس ہے میاں — ماموں میاں ٹھنڈی سانس بھر کر بولے — کاغذات قفل کنجی، سب کچھ نہ جانے

ہوئے بھی مجھے اپنے ہاتھ سے لینا پڑتا ہے —— منجھلی ماں تو مردہ زندہ
برابر ہی ہے۔ دلہن پاشا کی اتنی اونچ نیچ نہیں ہے —— اماں سب
میں کھورا ایسا ہو گیا ہوں کہ سب کچھ سمجھتا رہتا ہوں —— ان کی
آنکھوں میں نمی جھلکنے لگی مگر وہ چھپا گئے —"

ماموں میاں میں آپ سے ایک بات اور کہنے والا ہوں۔"

ماموں میاں نے ان کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

"ابا میاں کا وقت ابا میاں کے ساتھ گیا —— وہ شان و شوکت
وہ بڑی بڑی باتیں، وہ تمکنت، ان کا کیا ان کے ساتھ گیا۔ جو صلاحیت
کمانے اور خرچ کرنے کی ان میں تھی، وہ ہم میں لاکھ جتن کر کے انھیں [illegible]
نہ آئے —— مجھے آپ صرف اتنا ہی سمجھا دیجئے کہ حویلی میں جو ڈھیر
سارے لوگ بھرے ہوتے ہیں ان کا کیا مصرف ہے ——؟"

چھوٹے ماموں میاں بری طرح چونک گئے —

"تمہارا مطلب ہے میاں —— تمہارا مطلب ہے —— وہ رکتے
گئے —— زبان سے آگے کچھ نہ نکل سکا۔۔"

"ہاں ہاں میرا مطلب ہے کہ اب وہ بات گئی کہ بہتی ندی کی
طرح روپیہ آ رہا ہے اور خرچ ہو رہے ہیں —— حویلی تو پروں کی طرح [illegible]
ہوتی ہے —— اور اب میرے کندھوں میں اتنا بار نہیں کہ مفت کی
پالوں ——"

نہ چاہتے ہوئے بھی ماموں میاں نے کانپتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ

رکھ لیے ۔۔۔ بس میاں بس ۔۔۔ تمہارا گھر ۔ تم مالک ۔ جو جی چاہے
کرو مگر خدا کے لیے مجھے بیچ میں نہ ڈالو ۔۔۔ میں کچھ نہ سہار سکوں گا ۔ میں
بیمار منجھلی ماں سے کیا؟ کچھ ملا سکوں گا ۔ وہ دلہن پاشا کو کیا منہ دکھاؤں گا
اور پھر کرتا دھرتا تم ہی ہو ۔۔۔ نام سارا میرا مشہور ہو جائے گا ۔
ماموں میاں نے حویلی خالی کروا دی ۔۔۔ اب تک تو میری جیسی گذری
اچھی ہی گذری ۔۔۔ آخری وقت میں کیا اپنے منہ پر خاک مل لوں ۔۔۔

قدیر میاں نے خالی خالی آنکھوں سے ماموں کو تکا اور بولے ۔

اچھا ۔۔۔ تو میں ہی سب انتظام کر لوں گا ۔

عیش کے دن گذرتے دیر نہیں لگتی ۔ قدیر میاں کے جاتے تو
ماموں پر دنیا پھیرتے میں لگا ۔ برس گذر گئے ادھر ننھے ننھے بچے جو گھٹنوں
چلتے تھے ۔ توتلی باتیں کرتے تھے اب سمجھدار سیانے ہو گئے تھے ۔۔۔
صفیہ اب تھیں کہ جوانیاں ابھر گئی تھیں اور دوپٹہ اوڑھنے کی تمیز آپ
آ گئی تھی ۔۔۔

دلہن پاشا اب ویسی دلہن پاشا نہ تھیں کہ سر اور منہ چمکارتی رہیں
ہاتھوں میں جھم جھم تو سے کے کڑے ہیں پھیکے آگے ناچتے ۔ گلا بھر سونے
کے ہار چھپا کلی ، کھسر ، انگلیوں میں انگوٹھیاں ، پیروں میں جھنکی پائل
خدا نے دیا دونوں طرف سے اتنا تھا کہ کبھی کمی نہ پڑتی ۔ پاس میں رکھا ہوا
تھا مگر دن بیتتے میں تو پہاڑ سے بھی بہ جاتے ہیں ۔ اب جھکا جھول

زیوروں کی بجائے بس ناک میں ہلکی سی کیل، ہاتھوں میں تولہ تولہ بھر کی چار چار
چوڑیاں ـــ کانوں میں ہلکے پھول۔ بس ختم ـــ گلے میں تولہ بھر پھولوں کی مالا
رو۔ کمال بہت میں پروئی ہوئی ـــ اب جگر مگر کرتے بھاری لباس کی بجائے
سادے سیدھے رنگین ہلکے دوپٹے، کرتے اور معمولی کپڑے کا پاجامے۔ بہت
کہیں آنا جانا ہوا تو اطلس کا پاجامہ چڑھا لیا۔ اور جھلمل کا دوپٹہ اوڑھ لیا
گھر کی ذمہ داری اپنے آپ اماں کے ہاتھوں میں آ پڑی۔ اور جب ذمہ داری
پراں آ پڑے تو اس کی رنگین دن ختم ہو جاتے ہیں۔ بزرگی کا احساس، جیسے
جینے بھی نہیں دیتا۔

اماں بی کسی کے بیچ میں حقیقیں نہ دیتے ہیں ـــ ان کے کیسے کیسے ارمان
تھے ـــ سدا بڑی سرکار سے کہا کرتیں۔

"ذرا قدیر کے بچے سیانے ہو لیں اور گھر گرہستی کرنے کا ڈھنگ سیکھ جائیں
تو جانے بس ہم دونوں بڑھاپے میں الگ ہو جائیں گے۔ الگ ان معنوں
میں نہیں کہ اپنا چولہا ہانڈی الگ کر لیں۔ بس بیٹھ کر بیٹے بہو کی زندگی دیکھیں
اور خوش ہوا کریں۔"

کل کی خبر کسی کو نہیں رہتی۔ اماں بی کے ہزار ارمان پورے ہوتے ہوتے
بھرے ہوں گے۔ ارمان جیسے جل کر رہ گیا۔ کہاں وہ دن کہ کوئی کام ہو تو
ہو اماں بی بیٹھی گردش پیش رہیں ـــ تجربے کی ہیں سے ادھر لیں جھر جھر پیسہ کال
کر رہی ہیں۔ سامان منگوا رہی ہیں۔ گھر بھر میں دھوم مچا رہی ہیں۔ اب
وہی اماں بی حقیقیں کہ ایک کرنے میں پڑی کراہتیں۔ کیا زمانہ سامنے آیا گیا ـــ

دیر ہو گئی تو اس کی شکایت بھی نہیں ملے تو وہ بھی بڑا اچھا ہے۔
جیسا چلتا ہے چلنے دو۔ ان کے سر کا آنچل۔ لال آنچل کیا کہ رنگیں زندگی
کی ساری خوشیاں لہا چلی گئیں ـــ

تقدیر میاں ادھر مستقل طور سے شہر میں رہنے لگے تھے۔ ہاتھ اونچا
ہی تھا۔ روپے پیسے کی کیا کمی انہیں تھی۔ ایسے باپ کے بیٹے تھے کہ چار گاؤں
وہ تک جن کا نام تھا۔ روپے پیسے کی کمی کس کو تھی؟ دیکھنے میں یوں شان آ لوتی
ہوئی تھی مگر آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور بہتی ندی کا جیسا اٹھاؤ ہو تو پھر دریا
کہاں سے پٹے ـــ؟

جائیداد کی نگرانی بادل نخواستہ بڑے ماموں نے اپنے سر لے لی۔ مگر ایسے
الٹے رخ پر ہوائیں چل رہی تھیں کہ بچاؤ ممکن نہ تھا ـــ سال چھ مہینے میں
تقدیر میاں گاؤں آتے اور زمین کا ایک نہ ایک ٹکڑا بیچ جاتے۔ بڑے ماموں
میاں سمجھاتے، دبے دبے منع کرتے ہی رہ جاتے مگر یک نہ سنتے ـــ نتیجے پانی
کا زور وہ زور گیا حتیٰ کہ سدا رخصت رہنے لگے۔ بھی ہوتا تو کس کے سنتے تھے؟

بادل ابھی ابھی برس کر کھل گئے تھے ـــ ہر طرف ایک عجیب سی تازگی
چھا گئی تھی ـــ سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی
بڑے ماموں حویلی میں داخل ہوتے ٹھٹھک کر رک گئے۔ تمام ادھر ادھر دیکھتے ہوئے
بچھڑے زمانے میں آ گئے۔

وہ نہیں پا سکے ـــ آج بادل برسا تھا سامنے اور وہ عجیب دکھ سے

لہجے میں بولے۔

دولہن پاشا نے سر اٹھا کر دیکھا "ہاں ماموں میاں۔ بڑا ساتھ تھا مگر—" گلے میں پھندہ سا پڑ گیا اور انہوں نے آنسو پینے کی ناکام کوشش میں مسکرانا چاہا—

"اگر قدیر میاں باغ نہ بیچتے تو کیا بگڑ جاتا؟ مگر انہوں نے تو جیسے عزم کر لیا ہے کہ اپنے دادا کی اس زمین کے چپے چپے کو تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔ وہ باغ تو خیر ان کے نام پہ تھا، جھوٹی دستخط بنا کر کاغذ پر بیچ کر ڈالے اللہ جانے کیا ہو گیا ہے بے چارے کی عقل کو"

"ماموں میاں مجھے کسی سے شکایت نہیں۔ کوئی غم نہیں۔ ہاں دکھ اگر ہوتا ہے تو بس ان ہی کو دیکھ کر— ان کا دل بھلا کیا کہتا ہوگا ماموں میاں۔ میرا دل اللہ جانے کیوں بیٹھا جاتا ہے یوں جیسے کچھ ہو کر رہے گا"

ماموں میاں کرب سے مسکرائے "اب یہ حالت ہو گئی ہے بیٹا کہ اس کے بعد اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہوگا بھی کیا؟"

ماموں میاں تھوڑی دیر رکے پھر بولے "میں تیرا دل تیرے میاں کی طرف سے میلا نہیں کرنا چاہتا بیٹا مگر مجھے معلوم ہے کہ اب تیرے دل میں صبر کرتے کرتے برداشت کی وہ قوت آ گئی ہے کہ چاہے تو پہاڑ کا سا غم بھی اپنی چھاتی پر رکھ لے اور اف نہ کرے"

دولہن پاشا نے بڑے تعجب سے سر اٹھا کر ماموں میاں کی طرف دیکھا منہ سے تو کچھ نہ کہا مگر جیسے آنکھوں نے پوچھ لیا۔

ہوا کیا ہے؟

قدیر میاں نے مختصر کر کے باقاعدہ گھر والی بنا لیا ہے دولہن پاشا —
اب وہ کچھ زیادہ کرایہ دار نہ رہ جائے گی — مکان، جسے انہوں نے اپنی بیوی کے لیے خرید رکھا
تھا مگر وہ خود اتنا کافی کر رہے تھے اب جب دیکھا کہ بڑھاپا دروازے پہ جھول رہا
ہے تو بلا پس و پیش گھر لے آئے ہیں — بڑھاپے میں اور بیوی کا کوئی ساتھی نہیں
ہوتا ہے تو لیجیے — میں نے اسے دیکھا ہے، فکر تم نہ کرو انسان ہے بھی
نہیں — دولہن پاشا! ہو تو بیچ آ گیا ہے بھی کیسا — دیکھو بیٹا تھوڑی دیر تک
رہا کر جب تک ... قدیر میاں کا ساتھ نہ چھوٹے گی۔ اور
جب وہ دیکھے گی کہ اب فقیری آگئی ہے تو خود بھاگ کھڑی ہوگی۔ ورنہ کہیں بھی
رنڈیاں کسی کے گھر بیٹھا کرتی ہیں؟ نہیں تو ... کے مزے کی بات
ہوتی ہے۔

دولہن پاشا نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ بس ماموں میاں کی طرف دیکھتی
رہیں جیسے خالی الذہن ہوں۔ بڑی دیر بعد اتنا پوچھ سکیں —

ماموں میاں۔

جانے کیا کہتیں مگر ماموں نے سر اٹھا کر ان کا منہ دیکھا تو آنکھیں
بھیگ رہی تھیں — ماموں میاں نے سر جھکا لیا۔ یہ تھوڑی دیر بعد بولیں۔

جائیداد کا اب کیا حال ہے؟

جس پہ ماموں نے ہاتھ ملتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔

بیٹا تمہیں معلوم ہے بڑے سرکار کتنے دل والے تھے؟

کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا ـــ مدد کا فروں کا حشر تو ان کی زندگی
میں ہی ہو چکا تھا تمہیں یاد ہے ـــ نہیں بیٹی پھر تمہیں تمہارے سامنے
ہی تھیں ـــ یقیناً تمہیں گذر جاتیں اور یہ دولت ختم نہ ہو پاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ
بھی جیتی لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو کہ خود اپنا ساتھ دینا آتا ہے۔ بڑے سرکار
کی کیا زندگی تھی؟ انھوں نے کیا کیا نہ کیا ـــ؟ ان کی لگن۔ ان کی محنت اور
مسلسل پریشانیاں ـــ زندگی نے انھیں سنبھال لیا اور دانشوروں کے دشمن ہوگئے۔
بیٹا یہ نہ سمجھو کہ دولت آ گئی تو سدا ساتھ رہے گی ـــ دولت ضرور ہے مگر
ڈھنگ چاہیے۔ کھانے کا ـــ تاکہ اب اسے کھو کر دولت کو جانے۔ آگئی دیر نہیں
لگتی جتنی آنے لگتی ہے ـــ بلکہ سمجھو تو یہ چیونٹی کی چال سے آتی ہے اور جاتی
ہے ہاتھی کی چال سے ـــ اب اس آنے اور جانے کا فرق سمجھو اور اپنی حالت
کا جائزہ لو ـــ پھر مجھ سے یہ سوال کرو۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسے
بے ڈھنگے، خرافات اور فضول باتوں ـــ اب تک یہ جائداد کام ہی
کیسے دے گئی ـــ اب تک تو جائداد ہاتھوں میں کشکول آ جاتی تھی۔ مجھے
تو بس وہی کہانی یاد آتی ہے جیسا کہ ایک بادشاہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک
نے گھر بھر دیا اور گھر لٹا دیا ـــ دوسرے نے شاہ راہوں کو خالی کر دیا ـــ
اور یہ سب کچھ ہوتے دیر بھی نہ لگی ـــ میں سدا اپنی اماں سے پوچھا
کرتا تھا کہ اماں یہ باقی ساری دولت بھلا کیسے جاری ہی جا سکتی ہے
اماں جواب دیتی تھیں۔
بیٹا روپے کے ساتھ پاؤں ہوتے ہیں ـــ جتنی جلدی وہ چلتے

اور کوئی نہیں جانتا ۔

لگتا ہے آج وہ کہانی خود ہم پہ بیت رہی ہے —— کہاں ہے وہ میرا شہزادہ جس نے رعیت کو سکھ دیا اور گھر بھر دیا کہ دل دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے —— کہاں چھپ گئیں وہ آنکھیں کہاں کھو گئی وہ ......مسکراہٹ ؟؟

قطرہ قطرہ لہو شہ ماموں کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا ۔

سہاگن بیوہ ـ

رنڈی پیشہ چھوڑے تو چھوڑے، پیشہ نہیں چھوڑتی۔ اختری نے تیلیاں
سا گھر تاکا تو ایسا تاکا کہ بس عمر بھر کی فکر کر لی۔ کہاں سے آتا ہے، کدھر سے
آتا ہے، اس کی اس کو کیا غرض، کسی کا گھر جلے اور کوئی آگ تاپے۔ ایسے
ہی رنڈیوں کی تمنا خیال ہو اگر سے تو ان کا رستہ ہی بیٹھ جائے۔

حویلی کہ سدا جہاں میلوں ٹھیلوں کی سی دھوم دھڑک رہتی تھی۔ ہتی تھی
اب کیسی ویران پڑ گئی تھی، — نئی نویلی سہاگن کی طرح سجی سجائی حویلی
جیسے بیوہ ہو گئی — کہاں تو چھت پر ہری ہری لال لال چھت گیریاں
لگی ہیں، ان میں پھول ٹنکے ہیں۔ کھمبوں پر رنگین کاغذ کی جھلمل پتیاں
مڑھی ہوئی ہیں۔ دیواروں پر قمقمے جڑنے سے جھم جھما رہی ہیں، اور

اب یہ حال کہ مٹوں گرد اٹ رہی ہے — کس کے پھول، کہاں کے نگینے کاغذ — برسوں پہلے کے کاغذ بوسیدہ و بوسیدہ ہو کر ٹوٹ گئے ہیں کہیں کہیں رہ رہ ان سی لٹک رہی۔ سب چھتوں پہ جالے اٹ گئے ہیں۔ قدیر میاں کہ جنہیں باپ کے بعد اس حویلی کو بسانا تھا۔ بھولے بسرے بھی نہ پلٹے جیسے کوئی رشتہ ناطہ ہی نہ ہو —

اس دن ایسا ہوا کہ کئی زمانوں بعد قدیر میاں کا قدم پلٹے۔ ان کا چڑھتا زمانہ کبھی کا بجھ چکا تھا مگر تپش ابھی تک باقی تھی — اب بھی تن تو ہی ٹھاٹ باٹ سے — کرتے کی کلائی چڑھا کر اور جلتے پیر سنبھال کر بڑے ماموں میاں بیٹھک میں بیٹھے تھے — دیکھتے کیا ہیں کہ قدیر میاں چلے آتے ہیں — بڑھ کر لگنے سے دل کی فکریں اور چہرہ کی پریشانی تھوڑی ہی ڈھک سکتی ہے — جسم لاکھ ڈھک جائے۔ سلام کر کے کرسی پہ بیٹھ گئے — چہرے سے الجھن سی ٹپک رہی تھی۔

ادھر جب سے قدیر میاں نے دیکھتی آنکھوں اور جوتی تو اس گھر کا گھروا کر دیا تھا، ماموں میاں ان سے کھنچ گئے تھے — ماموں میاں نے جواب میں یوں دیا جیسے مکھی اڑاتے ہوں — یہ خود ہی مسکرا دیے۔

"کیا زمانہ آگیا ہے ماموں میاں کہ اپنے بیگانے سب آنکھیں پھیر لیتے ہیں —"

بڑے ماموں نے دیکھا اور خود بھی طنز سے مسکرا دیے۔

"ان میاں دیکھنا کیا زمانہ آ لگا ہے کہ اپنے بیگانے سبھی

آنکھیں پھیرے بیٹھے ہیں۔ دنیا داری کی [illegible] مزا ہے [illegible] کیا
کیا گندگی ہے۔ یہاں تو دل جل رہے ہیں اور ان کو [illegible] کی پڑی
ہوئی [illegible] رہتی ہے کہ صاف [illegible] اور اختر اور قدیر میاں پر [illegible]۔ قدیر
میاں کا سنسنا گیا — کچھ نہ بولے۔

خود بڑے ماموں ہی ذرا دیر چپ رہ کر بولے "آنسہ [illegible]
"انسان کا بچہ ہو یا کبھی تو دل چاہتا ہو گا کہ [illegible]
میری ماں مجھے پیار کرے"

بڑے ماموں کا پورا جسم کانپ گیا۔ انسان کے [illegible] تعجب
ہوتا ہے کہ تمہیں بھی اپنے انسان ہونے کا خیال آیا — [illegible]
ہوئی اس وقت تو اپنے دل کا خیال نہ آیا — [illegible]
پہل کی چھڑی بھی تھا — وہاں سے نہ چھوٹی ہو گی [illegible] اور
آرزو کی دولت کچھ خیال نہ آیا — بہت خوب میاں [illegible] دل والے
ہو — بہت زمانہ شناس اور دنیا دار معلوم ہوتے ہو۔

قدیر میاں اس انداز سے سنتے رہے جیسے دل [illegible] ہو۔
"انسان ہی بہکتا ہے انسان ہی سنبھلتا ہے — [illegible] بھی
ہو سکتا ہے۔"

"سب کچھ برباد کر کے اب سنبھلنے کا خیال آیا ہے [illegible] اگر اپنے
[illegible] اتنا [illegible] ہوتا تو [illegible] بھی دکھاتے۔ سچ کہا ہے [illegible]
کا رونا اس بیٹے کے جوتے پونچھنے کے کام آتا ہے — [illegible]

اس کی بڑی تکلیف کا خیال نہ آیا ——— جانتے ہو صغریٰ ماں کی شادی اسی سال کر رہی ہیں ——؟ اللہ تمہیں سلامت رکھے کہ زمین کا ذرہ ذرہ بیچ بچا کر برابر کر دیا ——— ہاتھ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں اور بیٹی کو ڈولی چڑھانا ہے ——— کیسے ماں باپ ہو میاں کہ چھاتی پر بیٹی دھری ہے اور بوجھ محسوس نہیں کر پاتے ہو ——؟

قدیر میاں نے اس ساری باتوں کے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اٹھ گئے ——— دروازے میں کھڑے ہو کر سنسناتے ہوئے چھانکا۔ گھر میں ایسا سناٹا کھنچ رہا تھا جیسے میت اٹھ جانے کے بعد ہوتا ہے۔

پلنگ پر ایک کونے میں اماں بی لیٹی ہوئی تھیں، نحیف و نزار۔ باورچی صغریٰ ماں بیٹھی ہوئی چھیلی چھیلی کر ان کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ وہ بار بار انکار کے طور پر سر کو ادھر ادھر ہلاتیں۔ مگر صغریٰ ان کے منہ میں چھالیا دیتی۔

دلہن پاشا کٹوری سپاری کے دو بیٹے ہیں اور تھی ہوئی چکیاں ٹانک رہی تھیں ——— کچھ صغریٰ ماں کی شادی کا سلسلہ تھا۔ قدیر میاں نے غور سے دیکھا تو انہیں یاد آ گیا کہ یہی چکیاں کبھی دلہن پاشا کے گورے گورے ہاتھوں پر جگمگ کرتی تھیں ——— کوئی ناگوار سا اس کے دل میں دب گیا۔

باہر ڈیوڑھی کے آنگن میں دونوں بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ قدیر میاں نے مڑ کر ایک نظر ڈالی اور یوں جیسے کسی کو ڈر گیا ہو اور پھر ان کی نگاہ اپنے بیٹے پر آ کر جم گئی ——— بڑے بیٹے مبارک میاں کا بھی ایسا تھا جب گلی ڈنڈا کھیلتی تھی۔ کیسا اٹھان تھا ——— ہو بہو اپنے باپ کا تھا۔ اور پھر

بڑے گھروں کے بچے کر کھانے پینے کی ادبی چیزیں ہوتی ہے ایسی بھی
غضب کی بدصورتی بلاتے ہیں — غریبی آئی تھی اب چار دن سے۔
ورنہ پھر بچپن سے زندگی کو مضبوط ملی تھی اور خوب ملی تھی۔ بس لگتا
تھا کہ اپنی جوانی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے ہیں۔

چھوٹے میاں تو باپ کو دیکھتے ہی اندر دوڑ گئے۔

"ابا جان آئے ہیں — ابا جان آئے ہیں" — بڑے میاں بھی
کھڑے ہو گئے — کچھ ہاتھ میں تھامے ہوئے۔

باپ بیچارے ان کے پاس جا کر ٹھہر گئے — سر پر ہاتھ پھیرا
اور بڑی محبت سے بولے۔

"کیوں بیٹا کون دوا پیا ہے؟"

— چھوٹے میاں چھالیا بہت پکتے ہیں ابا — سامنے آپ آ جاتے
تو آپ کو بھی دیا ہے اچھو میاں نے خرید کے ہو۔

"اچھا" باپ بیچارے بولے۔

وہ ایسی بات تو آ پاکے لڑکی ہی فکر تھی تو بس یہ کہ جیسے بھی ہو
صفیہ اپنے گھر کی ہو جائے — بیٹوں کا ساتھ تو نہیں ہوتا — لڑکے
سے تو کیا ہو گئے رہے تو کیا گزر گئے بھی تو — لڑکی تو ساتھ
ہمارے پیا لائے — تھی۔ کہی نہیں جا سکتی کہ جیسا کہ کی نکاح
پڑے گی — مجبوری کہی نہیں جا سکتی کہ جوانی کس تک ٹھہرا ہو

بہو کہلانے کو ہردم تیار ——— جانے کدھر —! اچھا یہی ہوتا ہے کہ جس
کی امانت اس کے ہاتھ سونپ دی جائے ۔

اماں بی کے ہوتے دولہن پاشا کو عمر بھر کوئی فکر نہ رہی — نہ رہتی
مگر اب ان کا خاندان مردوں میں کہاں باقی رہ گیا تھا — دیکھنے میں یوں
ابھی خاصی نظر آتی تھیں مگر بیٹھی رہتیں جیسے اپنا آپا بھول گیا ہو —
خالی خالی نگاہوں سے بس آسمان کو تکے جا رہی ہیں — نہ کسی سے بات نہ
چیت ۔ بس بہت ہوا تو انگلیوں پہ تسبیح چل گئی ۔ روتے روتے آنکھیں
بھی دھندلا گئی تھیں — ان سے کیا آس تھی —؟

صفیہ ماں کی شادی چھوٹے ماموں کے بڑے سالے جمیل میاں سے
ٹھہری تھی —— وہ بھلا ایسے بڑے رئیس نہ تھے مگر گھر کی دو چھوٹی چار
کھیتیاں تھیں ——— کچھ نہ کچھ ساکھ اب بھی باہر تو بنی ہوئی ہی تھی یعنی بھی
اللہ گندہ ہوتا ہے تو اندر سے ——— باہر سے بھلا پہچانے بھی کون ۔ اندر
کیا گت بن رہی ہے ——! وہ یوں وہ بار بار ایسے تو بس بڑے سرکار کے نام
سے مرعوب تھے اگر وہ چھوٹی دمڑی کا جہیز نہ دیتے تب بھی کچھ گلہ نہ تھا
ان کے لئے تو یہی بہت تھا کہ بڑے سرکار کی بیٹی اٹھائی ہے ۔ دولہن پاشا
کا بھی کہنا تھا اگر کل کے کرتے آج ہی کر لیں تو ابھی ہاتھ پیلے کر دیں
اور دل ہلکا پڑے ——

ہلکی ہلکی سی دھوپ تھی —— اماں بی اپنی سوکھی ماری ٹانگوں کو دھوپ
دینے کے خیال سے انگنائی میں کھٹولی ڈالے پڑی تھیں — دولہن پاشا

آئیں اور قریب بیٹھ گئیں ——

"اماں بی ——" انھوں نے رک رک کر کہا۔

اماں بی نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر سورج سے اوٹ کی۔ بہو کو دیکھا مگر کچھ نہ بولیں۔

"اماں بی میں چاہتی تھی آپ سے کچھ بات کروں۔"

اماں بی نے ذرا حیرت سے دیکھا —— منہ سے پھر بھی کچھ نہ بولیں —— وہ ہمت ہار کے بیٹھ گئیں۔

"اماں بی آپ خود گھر کی بڑی ہیں، مجھ سے تو یہ نہ ہوگا کہ کسی کام کو کرنے کی آپ کی مرضی کے بنا، آپ ہی آپ سنبھال لوں۔"

اماں بی بس بے نور آنکھوں سے گھور کر دیکھے جاتی تھیں۔ دلہن پھر ذرا رک کے بیچ میں بات شروع کی ——

"اماں بی آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ پہلے ہم کیا تھے اور آج کیا ہو گئے —— جس گھر میں ساتھ نوکر لگے رہتی تھیں لینا دینا جیسے کسی کی شادی بیاہ رہتا ہو، آج تو اللہ ہی جانتا ہے کہ ہم لوگوں کی کیا گت ہو رہی ہے۔ پھر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ بھوکے تو نہیں رہتے —— برا بھلا جو کچھ ہے کھانے کو ہے —— ہاتھی، گھوڑے، گاڑیاں، بیل بچھڑے تھے، ایک ایک کر کے سب اس پیٹ کے دوزخ کی نذر ہو گئے۔ اب تو ہر طرف خاک اڑتی ہے —— کل کی کون جانے کہ ابھی اور کیا ہونا ہے —— وہ رک گئیں —— پھر کہنے لگیں ——

"اماں بی بیٹی کا ساتھ بڑا پیارا ہوتا ہے آپ کو بھی معلوم ہوگا۔
آپ نے بھی ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں اٹھائی ہیں اب صفورہ کو دیکھ کر میرا
دل سہما جاتا خون خشک ہوا جاتا ہے کہ اس کا کیا ہوگا — میں چاہتی ہوں
کہ اس رمضان کے بعد جیسے بھی بنے اسے وداع کر دوں۔ اس کی قسمت
سے لاکھ تو کہاں کی گی ورنہ اللہ ہے۔ جہاں تک ہے نصیب مجھے یہ جانا ہوگا
اماں بی نے پھر بھی کچھ نہ کہا — رابن یاشہ نے دوبارہ سے کہنا شروع کیا۔
"اماں بی آپ کچھ تو کہیں — کچھ تو راستہ دکھائیں — میں جانتی ہوں
اس وقت آپ کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی — یہ گھر کا رہتا آپ کی طرح
ہوتا آپ دونوں کی جگہ سر اٹھاتیں اور دوسری جگہ بڑا ہے — اور آتا جب آپ
کی بیٹی کی شادی کا وقت آئے گا وہ تو آپ کے اکلوتا لال ہیں اور بھی کی عزت
آپ دونوں کی جگہ ایک بھی نہیں اٹھا سکتیں — میں جانتی ہوں — سب
کچھ جانتی ہوں اماں بی — مگر اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا —"

اماں بی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے — انہوں نے اس بچی کو
چپ کرانے کی کوشش بھی نہ کی — پھر اپنے آنسو پونچھے اور بھرائی آواز
میں کہنے لگیں جیسے ان کی خوشی کا پیالہ بھر گیا ہو —
ورابن یاشہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"... کپڑے کی طرف سے کچھ کوئی خاص فکر نہیں ہے [illegible] کام
کا تو ہو رہا ہے — کپڑا [illegible] آپ نے [illegible] دیا۔
اور سسرال سے [illegible] میں چاہتی ہوں

کہ اس زیور میں سے آدھا تو صغریٰ آپا کو دے دوں اور آدھے میں بیٹیوں کے حصے لگا دوں، ان کی دلہنوں کے نیچے سے دباتی رہوں پھر انہیں کی تعلیم و تربیت پہ خرچ ہو گا اور پھر پیسے تو خرچ ہو جاتا ہے کس کام کا ہے اور کاٹ رہی ہیں، مجھے کہاں سے

آپا بی نے ٹھوڑی پر گرتے ہوئے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کر لیے۔

میں صدقے جاؤں شکر گزار ہوں آپا بی۔ آپ نے اپنے ارادوں سے مجھے کر دیں، ہم تو ہیں آپ اپنے بچے نہیں، بیٹی کے سسرال والے تو بات بات کو اچھالتے رہتے ہیں۔۔۔ آپا بی نے کہا دوستانہ۔

دلہن پاشا نے ادھر ادھر دیکھا اور صغریٰ کو آواز دی۔۔ بیٹی کپڑوں کے صندوق میں جو میری گٹھڑی کی سی رکھی ہے — ہاں ہاں وہی اور وہاں جو رکھی ہیں وہ اٹھا کر تو لانا۔

تھوڑی دیر بعد صفیہ آئی اور بولی — کہ ان سے صندوق کا کھٹکا ہی نہیں کھلا۔ مجھے تو دکھائی نہیں دیتی۔

دلہن پاشا مسکرا کر بولیں — تمہیں میں دل لگا ہو گا یا پھر مجھ ہی سے نہیں مل رہی ہوں گی — اے بیٹا ادھر دھیان سے دیکھو وہیں سیدھی طرف رکھی ہے۔

اب کی صفیہ ذرا جھلا کر ہوتی آئی اور بولی — امی جی میں نے آپ کے سارے کپڑے الٹ پلٹ کر ڈالے مگر کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا۔

دلہن پاشا بے زاری سے اٹھیں اور تو پہلے کی دوسرے کا گھر سا تھا۔

وہ سادہ [illegible] جیسا ان کو گیں [illegible] ہیں — [illegible] بیٹا آپ ہی کے لیے
آئی ہوں۔

دلہن پاشا کا صندوقچہ تھیں [illegible] الماری میں دیکھا۔ تو سارے کے سارے کپڑوں میں دیکھا، مگر کہیں کچھ نہ ملا — پھر شہ میاں سے پوچھا کسی نے کچھ پتہ نہ دیا۔

[illegible] پوچھا اس نے [illegible] کہا [illegible] زیورات کی صندوقچی نہیں تو [illegible] نہیں دیکھی — پھر [illegible] بہت تھا میرے کپڑوں میں [illegible] آکر پوچھا انھوں نے بھی کچھ نہ بتایا — دلہن پاشا کا [illegible] ہو گیا — ایک ایک سے پوچھتیں کوئی کچھ جانتا ہو تو بتائے [illegible] میں [illegible] گلی آئی اور دیکھ کے شہ میاں اور [illegible] بیٹھے پچکے [illegible] آئے —

ماں [illegible] پوچھا شہ میاں تم نے میرا انگوٹھیوں کا صندوقچہ کہیں دیکھا ہے؟

ہاں دیکھا تھا۔

کہاں ہے — کہاں ہے بیٹا — بولو شہ میاں [illegible] بالکل [illegible] کے [illegible] ہیں —

شہ میاں نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور بولے: وہ تو میاں [illegible] کے [illegible] انھوں نے مجھ سے آپ کے بعد کا صندوقچہ مانگا، ہم نے پوچھا بھی کہاں لے جاتے ہیں [illegible] تمہاری اماں کا سارا زیور [illegible] کا ہو گیا اب

اسے چلو اکر نیا کر دو بیٹھی گئے —

دلہن پاشا کے جیتے ہوئے آنسو تھم کر رک گئے۔ دولہن کا سارا خون جیسے جم گیا — ساکت ہی ہو گئیں — بچے یہ سماں دیکھ کر گھبرا گئے اور سعد نے لپکے۔ دادی سے جا کر بولے —

دادی بی — دادی بی! امی کو تو دیکھئے کیا ہو گیا ہے؟ دادی بی آنکھیں بند کئے یوں ہی پڑی رہیں —

گوری بی اماں نے بھاوج کے منہ پر پانی کا چھینٹا دیا اور زور زور سے ہلا کر بولیں۔

— بھابی پاشا — بھابی پاشا — ہوش میں آؤ تو دیکھئے خدا — کیا غضب نہ کیجئے —

یکدم جیسے ابال سا آیا اور دلہن پاشا پوری طاقت سے چیخ چیخ کر رونے لگیں — بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر وہ صحن میں دوڑیں اور اماں بی کے گلے سے جا لپٹ کر بولے اور زور زور سے رونے لگیں —

— اماں بی — اماں بی، ہم لٹ گئے — تباہ ہو گئے برباد ہو گئے اماں بی ہمارا آخری سہارا بھی چھن گیا۔ اماں بی میرا شہزادوں کا زیور چلا گیا۔ میں کیا کروں اماں بی —؟

اماں بی کی ساکت پتلیوں میں حرکت سی ہوئی اور وہ جیسے خواب سے چونک پڑی ہوں —

— زبیدہ — تیرا زبیدہ — کون لے گیا۔ کہاں لے گیا۔ کیسی ڈر بات؟

— سعد کے ابا لے کر چلے گئے اماں بی۔ اب خدا کیا ہو گا۔ میرے چھوٹے چھوٹے

بچے — ہائے ان بچوں کا اب کیا سہارا ہوگا — اماں بی سے وہ ہاتھ مل مل کر رو رو کر پوچھ رہی تھیں — اتنا اتنا بھی نہیں بچی اماں۔ میرا سونا تھا۔ زندگی بھر کی کمائی تھا — ہائے میں کیا کروں۔ سب کچھ چلا گیا آماں بی۔ بس یہ انگوٹھی بچی ہے گی، دو چار تولے اور تھوڑی رہ گئی — سب کچھ چلا گیا آماں بی۔ ساری زندگی چلی گئی ہے

اماں بی نے آنکھیں اٹھا کر بڑے صاف سے گھر کی طرف دیکھا۔ خالی کمروں کمروں کی طرف۔ جیسے سہاگ لٹ جانے پر سہاگن کو زیب زینت کر کے بٹھا دیا جاتا ہے اور صورت پر اداسی ویرانی چھا جاتی ہے۔ ایسے ہی سجائے سجائے گھر، یہ خالی اور سونے کمروں میں جھانک رہے تھے۔ پھر آنگن کی طرف دیکھا۔ جہاں گودی ماں کا بچہ کیا گھٹنوں گھٹنوں سے ستون دار کرنے کے پیچھے بھاگ رہا تھا — پھر ان کی نگاہیں دلہن پاشا اور بچوں پر جم گئیں۔ سب کے روتے ہوئے چہرے اور آنسو برساتی آنکھیں ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں —

سب کچھ انہوں نے عجیب کرب انگیز انداز سے دیکھا۔ پھر ڈوبتے لہجے میں بولیں۔

— سورج ڈوب گیا کیا — یہ اندھیرا کیسا ہے ہے؟

یکدم انہوں نے بہت زور سے انتہائی وحشت سے ایک قہقہہ لگایا اور پیچھے ڈکر رو رو بہت گئے — دلہن پاشا کے بچے ہوئے آنسو رک گئے۔ منہ کھلا رہ گیا۔ انہوں نے گھبرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اماں بی ہنستے ہنستے بے حال ہوئی جا رہی تھیں

٭٭٭

دِل لخت لخت

بڑے ماموں میاں کے طلائیں رہ ماشاءاللہ صحت صحت آگئی اب سب کی ماں بن بیٹھے۔ ہر ایک کی فکر، ادا ہر بچی کو لگی ہوگی۔ دلہن پانے کے ارمان گھیر کر رہ گئے تھے۔ بہو کا غم اور ساس کا غم کر دیکھتے ہی دیکھتے جین کا دماغ الٹ گیا۔ گھر کی ماں تو سسرا کی گود لگی تھی جو چند روز جنت اس کے منہ کو چپکی لگی تھی ڈھلتی ہی نہ تھی ـــ بچے تو بچے ہی ٹھہرے ـــ اماں بی کا کیا حال تھا ـــ؟

بس جب دیکھو تب اپنے آپ بڑبڑا رہی ہیں اور حساب جوڑ رہی ہیں۔

"دیکھو قدیر میاں کی بارات چڑھنے والی ہے۔ کتنی گاڑیوں کا انتظام کروانا ہوگا ـــ؟

"بڑے سرکار سے جا کہو حجرے میں ساٹھ موتیوں کی لڑیاں ضرور بچی ہیں۔ میں نے منت مان رکھی تھی کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سہرے کی ہر پھول کی لڑی کے بعد ایک موتیوں کی لڑ ہوگی اور بیچ میں سونے کا جھمکا ـــ

"اے یار اور چیلوں سے جا کہو کہ ہنسانی میں جتنا ہو گھی ڈالیں یہ اس شادی کی دیگ کا مزہ ہی کیا سوا جسے کھا کر ایک بار تیروں کی آنتیں نہ بیٹھ جائیں ـــ

"بیٹا جینی ہم نہ جانیں ـــ ارے ہمارے بیٹے کی گھر پہلی بار جھوری ہے۔ ہمیں بیٹی بھی بیٹے سے بڑھ کر پیاری ہے۔ دال کے بجائے جوتی کی کھچڑی پکے۔

کھسکے رہی اور چھال زیوری — کہ مر گئی —

ادھر دلہن پاشا صفیں کہ وہ مہینے کے اندر ہی اندر آنکھوں میں انگلی اٹھی
بھر گروہ کے جو گئے — ایک ایک کا لوں کی ہڈیاں ابھر کر نکل آئیں — قدیر میاں آفری
بار کیا تنے کہ رہی سہی جائیداد کو بھی آگ لگا کر بیٹھے تھے — کہاں تو وہ گھر کی
کھیتیاں باڑیاں اور سونے کا روں کی بھر مار آمدن کہ جیسے بارش کے پانی کی طرح چھپر
چھپر برستا تھا۔ اور اب یہ دن کہ دانے دانے کی محتاج ہو گئی تھی۔ گھر کے
استعمال کے ٹھیکرے ٹھوکرے، تھوڑے بہت برتن باسن اور گھریلو سامان
ہی باقی رہ گیا تھا ورنہ اب حویلی میں کیا دھرا تھا — !!

بڑے ماموں میاں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا اور اس دن تو
ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ صفیہ ان کی شادی کے لئے توڑ جوڑ
کرنے اٹھے۔ جائیداد تو آگے ہی ختم ہو چکی تھی۔ وہ کا اللہ کہ باپ بیچ باچ کر
آگ لگا چکے تھے۔ اس کا گہنا زیور الگ — جا قدرداں سے لے کر بیٹھے
پھر شادی کیسے ہو؟ — بڑے گھرانوں میں بھی پھیل گئی تھی کہ بس حالت گرنے کو
ہو رہی ہے — باپ دادا کا ہی نام باقی رہ گیا تھا — پھر بھی بیٹی اٹھانی
ہی تھی —

کون سوچ سکتا تھا دلہن پاشا کہ جب وہ دروازے سے کبھی ہاتھی جھومتا
تھا — رات بھی آتے کا ادا اپنے آنکھوں ....

ماموں میاں کی آنکھوں سے پھر سلسلہ شروع ہو گیا — دلہن پاشا
سرد آہوں میں کہا —

" تو ماموں میاں کیا آپ گھر کے برتن بھانڈے بیچ دے رہے ہیں؟"
بڑے ماموں میاں نے بڑے کرب سے پیمو کی صورت دیکھی۔ " اور کیا بیٹی
تجھے اب بھی آس ہے کہ اتنے بڑے بڑے دیگچوں اور دیگوں میں پھر کبھی کھانا پکے گا۔
اب تو ہم موت کی طرف دیکھتے ہیں — آگے کی کون جانے ہے؟"
" مگر ماموں میاں — کھانے والے پاس پڑوس والے کیا سوچیں گے کہ
ہم نے اپنے کھانے پکانے کے برتن بھی بیچ دیئے"
" کوئی کچھ نہیں سوچتا بیٹی — ہمیں کیا کہنے کے لئے منہ نہیں ہے کہ —
بات بیچ ہی میں رہ گئی — کہنے کے لئے منہ ضرور تھا مگر وہ بات کہاں
تھی جسے منہ سے نکالتے — دلہن پاشا نے کچھ نہ کہا —
بڑے دکھ کے ساتھ ماموں میاں بولے — " کب دیگوں کی ان کی ضرورت
ہی باقی نہ رہ گئی تھی۔ گھر میں اور بھی تو بہت برتن ہیں۔ مگر بیٹی ان پر بھی
پڑا ہے۔ سب پر حال روشن ہے"
تھوڑا بہت زیور دلہن پاشا کے انگ پر باقی رہ گیا تھا اور پھر کچھ سونے
دھات بیچ رکھی تھی — اتنا زمانہ بیت گیا تھا دلہن پاشا کی شادی کو۔
کپڑے بھی کہاں تک ساتھ دے پاتے۔ اور پھر ان کا تو یہ حال تھا کہ سدا
بڑھی کی دلہن بنی رہتیں — ایک ٹکا ٹکا یا جوڑا جسم سے اترتا تو ادھر
ساس دوسرا جوڑا تیار کر دیتیں۔ ایک بار ایسے ہی اس نے شوق کے سونے
سادے گلابی ریشم کی اوڑھنی کرتا پہن لیا تو ساس نے لتے لے ڈالے۔
" اے میں کہوں اب کرن بھی کیا ہے تمہاری۔ بڑھی تو ہو گئی ہیں۔"

بھلا یہ بھی کوئی پہننے اوڑھنے کے دن ہیں؟ اے بیٹا یہ ریشم بھی کیوں چڑھا یا ۔ سادا سیدھا سوتی کپڑا پہن لیتیں بس تھا۔

بھاری سے بھاری جوڑے ۔ دن رات پہنے رہتیں کہ کوئی بھی آجاتا تو پہلے یہی سوال کرتا ۔

”کہاں کی تیاری ہے دلہن بی بی ۔“

ساس کہتیں ۔ تیاری بھلا کہاں کی ہوتی ۔ نئی نویلی دلہن ہے گھر ہی کے تو پڑے ہیں ۔ اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب آگے پیچھے دو دو بچے کھیلتے تھے ۔ یوں بھی پہن کر نیا نویلا رہنا پڑتا تھا۔

بھاری بھاری کار چوبی کامدانی کے جوڑے دن رات پہن پہن کر چیتھڑ کر دیتے ۔ آگے کی خبر کسے تھی کہ ایسا بھی دن آئے گا ۔ اللہ رکھاں تو کار چوبی جوڑے ۔ روزمرہ پہننے اب شادی بیاہ کیلئے بھی نہ جڑیں گے اور ابھی کپڑے دلانے بیٹھے ہیں ۔ بچے بچے بھی بڑے بیٹیاں بیاہنے پہ چڑھنے لگیں۔

پھر بھی شادی بیاہ ، منگنی رسم آجانے اور عید بقرعید کے نئے چند جوڑے بچے ڈال رکھے تھے ۔ ان سلے ہوئے جوڑوں کا بھی دن کو ڈر تھا ۔ ہتھیار ۔ کپڑوں کی طرف سے تو فکر چھوٹی ۔ پر زیور بھی پاس کا خیال تھا اور ادھر بڑے ماموں میاں کے بچی کرونگی لگا ہوا تھا کہ دو بیٹے والے گھر چڑھ کے آئیں گے تو خاطر کیسے ہوگی ۔ جوڑے کے نئے روپے کہاں سے جائیں گے ۔ اور پھر خرچ تو بیاہ میں ہوتا ہی ہے ۔ سب کچھ سو روپیہ بار سلائی دستی تو دینا ضرور تھا ۔ یہ سب سر پر تھا

کیسے ہوگی سے کہاں سے ہوگی؟ اور دولہن پاشا اُدھر ماموں میاں
چھپکے چھپکے رو رو جاتے اور ایک دوسرے سے آنسو چھپاتے جاتے۔

ماموں میاں نے دو ایک بار اشارہ سے کہا کہ ہم دولہن پاشا کا عقد پڑھا لیا جائے
جائے، مگر دولہن پاشا کے میکے والے بجھ سے گئے تو کیا۔ اگر دولہن پاشا گھر سے جائیں
تو ان کے گھر کی پھوٹی کوڑی بھی نہ اٹھا سکیں۔ بیٹی کو ایک بھی پیدا ہوا ہے اور سسرال
بھی۔ میکے کی عزت بھی اس کی اپنی عزت اور سسرال کی ناک بھی اس کی اپنی ناک۔
بیاہ کر سسرال آئی ہے تو اس کا ایمان بن جاتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا
ہے اسی ہاتھ کی لاج کا بوجھ ہمیشہ اٹھائے رکھتا ہے۔ غیرت والی بیٹیاں دولہا کے ان
کے گھر میں بسنا بستا ہے اور میاں کے لئے ان کا تڑپتے ہوں تب بھی میکے آتی ہیں تو
منہ پر ہنسی اور دل میں بشاشت۔ ... کے سینے پڑے ... کی اپنی آنکھی کا ... ہے
سفید پوشی کی رہا ... کی ناک بھی نہ ہو۔ اور میکے والے بھائی بند جانیں کہ وہ
کا مال کھاتی ہے۔ دولہن پاشا کے ایسے صبر سے قدردان ہو جاتی تھیں
کہ دولہے میاں کے ... بھول کے ساتھ ساتھ ... لپٹی ... رہیں
تھیں ... بیچ ... کو ... بھی ... ایک ... آیا!
ٹھیک ... جالی تھی ... سے اٹھائی ہو ... کر
ہاتھ پھیلائیں تو عزت کے ... ہاتھیں۔ بڑے ماموں کی بات پر انھوں نے
دعا ہی دیا، اللہ کا فضل تھا، گھر بیٹھے جنتی بھلی پیٹ بھر روٹی مل جاتی
تھی مگر شکر سے ہاتھ کا ... آیا تو ... بھی ... رکھو تھیں۔

ایک دن دولہن پاشا نے تمام عمر کی ... بیٹے ... اور ... دو ...

ہی کر ڈالیں۔ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ گھر بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ وہ سجاوٹ بناوٹ کا ساز و سامان۔ فانوس، جھنڈے، چراغ، آئینے سب کدھر گئے؟ گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتیں اور دل بیٹھا جاتا۔ بیٹے امراؤ کو بلا کر ایک ایک کمرہ دکھا دیا پھر تب۔ وہ منہ سے کیا بولتے، بس سر جھکا لیا۔

سارا سامان تم نے ہی اٹھوا دیا؟ بھرے دل سے بولے۔

آپ نے سنا ہو، دلہن پاشا نے مجھ سے کہا۔ سمجھ گئیں۔

کیوں۔ ابرہ۔ امراؤ نے آنکھوں بھرے لیے جیسے انہیں سوالی کر دیا۔

اور ہی اب بیچ رہے ہیں پیٹ کا دوزخ کیسے بھرا جاتا ہے؟ امی کیسے۔ بوڑھی پھر چپ رہ گئے۔

تو دلہن اولاد نے کیا سوچا ہے کہ امراؤ میاں بڑی حویلی کی سجاوٹ تک بک رہی ہے۔ اف۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔

انہیں یاد ہی نہیں تھا۔ ورنہ بھی نہ کچھ۔ وہ دوڑ کے اندر بیٹے۔ سوال کر بیٹھا سارا سامان اس اندر سے چلا گیا ہے جیسے جھوٹ نہ رہنے دیا گیا ہو؟

امراؤ پاشا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

تو دلہن۔ سامان تو نے کٹوا دیا۔ کے ہاتھوں بکوا دیا جو حویلی کا ذرہ

بھرے سامان کی چھت تلے سے بیٹا ان کا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔

دلہن پاشا کا دل کٹ کے رہ گیا ان کی آنکھوں میں آ گیا اور موٹے موٹے آنسو ان کے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔

٭ ٭ ٭

”شیشوں کے محل میرے“

اور یہ اس دن کی بات ہے جب بڑے ماموں میاں خود ہی دولہے والوں کے ہاں جا کر شادی طے کر آئے ۔ جمیل میاں کی اماں نے ذرا اس بات پر حیرت کا اظہار کیا بھی کہ دولہن والے ہو کر آپ ہی شادی طے کرنے آ گئے ۔ مگر بڑے ماموں میاں سب کے بڑے تھے، سبھی گھر والے ان کے اپنے تھے وہ ہر کسی کا کام کر سکتے تھے ۔ پھر بھی چھوٹی بیگم نے پوچھا بھی ۔

”صدیقن کیوں نہ آ گئیں ۔“

یہ بات بنا کر بولے ۔ ”کئی دنوں سے آنے کا کہتی تھیں مگر گھر کے کام کاج سے فرصت ہی نہ ملی ۔ اب آنے والی تھیں تو بڑے میاں کے بخار اٹھ کھڑا ہوا ۔ مجھ سے کہا جا کے آپ ہی طے کر آئیے اپنے گھر جیسی تو بات ہے ۔ ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی ۔ چاہتی ہیں جلد ہی اس بوجھ سے سر ہلکا پڑ جائے ۔“

شادی شوال کی سات کو ٹھہری ۔

دن غم کے ہوں یا خوشی کے، بیتتے ہی بیتے اور بیت گئے ۔ جس دن منجھو ماں مانجھے چڑھنے والی تھی، لگتا تھا گھر میں شادی کے نہیں موت کے سامان ہو رہے ہیں ۔ بڑے ماموں میاں اور دولہن پاشاہ نے مل کر پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ کسی کو دعوت نہیں جائے گی ۔ حتیٰ کہ دولہن پاشاہ کے میکے والوں کو بھی نہیں ۔

بڑے ماموں میاں نے حیرت سے دیکھا ۔ ”اپنی اماں کو بھی نہیں ۔“

۔ مگر یہ نہیں کریں گے۔ ایک بیٹی بالکل بھولی بھالی گئی۔ کرتے پھریں گھر میں
کسی کو نیوتہ نہ دوں گی۔ مجھے اپنا فضیحت نہیں کرانا ہے۔

۔۔ فضیحتے کی بات کیا ہے بیٹی۔ اللہ کا یہی حکم رہا ہوگا۔ جیسا کچھ بھی حال
ہے اس پر قانع رہنا چاہیے۔

پھر دولہن پاشا کی آنکھوں پر سہرا پہنچ گیا تو اس نے میاں کو ایک لفظ کہنا
نہ سوجھا۔

بڑے دے گھر ہی کے لوگ تھے۔ یا پھر آس پڑوس کے چند ہی ایسے موقعوں
پر جن بلائے ہی شور شرابہ مچانے آ موجود ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں لہنگے میں
ایک ڈھولکی دھما دھم کی تھیں اور ادھر ادھر پیٹ پیٹ کر گا رہی تھیں۔
دولہن بھی سہیری کی تاک۔ نئی شہر تاک گئے

کمرے میں ایک پلنگ پر کونے میں دولہن بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے بدن پر
ہلکا پھلکا زعفرانی جوڑا تھا۔ اور ادھ کھلی کلیوں سے جو خوشبو مہک رہا تھا۔
ہاتھوں پیروں میں سرخ سرخ مہندی اور گلابی گلابی آنکھوں میں چھم چھم
جھلکتے ہوئے آنسو۔ دولہن پاشا بیاہی تھیں۔ ان کے ارمان جی میں رہ گئی
تھیں۔ آتے جاتے ہیں کو بیٹی پر بیٹھا دیکھتی اور ماں کا دل بھر بھر آتا دل کو
یہی اطمینان تھا کہ چلو اچھا بیٹی آخر اپنے گھر کی راج پاٹ رہی تھی۔

بڑے بھولے شادی کی ہلکی پھلکی رونق گھر پہ چھانے لگی۔ انسان کا
دل خدا نے بنایا ہی ایسا ہے کہ پیار و محبت تم پڑیں پھر بھی کھل جائے۔ ماں
۔۔ سنجیدہ روح سی بکھرنے لگی بھائی ادھر ادھر چھپے ہوتے تھے۔ بڑے ماموں کا

بھی کیسا مطمئن ہو رہا تھا کہ چلو یہ بڑا بوجھ تھا جو خدا نے اتارا۔

بڑے سرکار نے بڑے ماموں میاں کو ہاتھ میں ٹیکنے کی ایک چھڑی دی تھی — ایک دن کسی کام سے جھکے ہیں آ کر بڑے ماموں اٹھے تو ذرا کی ذرا جھک گئے — پاؤں میں موچ آ گئی —

بڑے سرکار نے ہنس کر کہا۔

میاں کوئی سہارا ہوتا تو یوں نہ پھسلتے۔

ماموں میاں نے ہنس کر انہیں دیکھا اور بولے — خدا آپ کو سلامت رکھے۔ خدا کے بعد آپ ہی سب سے بڑا سہارا ہیں آپ ہیرے کا ٹکڑا ہیں۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔ بس بہن کی اور آپ کی محبت مل گئی۔ میری دین و دنیا دونوں ہی سنور گئی ہے

بڑے سرکار نے اسی دن انہیں ایک چھڑی تحفۃً دی تھی جس کا ہتھا پورا سونے کا بنا تھا۔ ارے وہ دو تولے سے کیا کم سونا رہا ہوگا — آج وہ چھڑی صحیح معنوں میں ان کا سہارا بن گئی تھی کہ اس کا سونا بیچ بیچ کر تمام رہا اور لڑکی کی سربراہی کا جشن کیا تھا — بڑے سرکار کی یاد میں ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں —

جسم پر جو ہلکا پھلکا زیور رہ گیا تھا وہ صفیہ ماں کے جہیز میں جانے والا تھا۔ دلہن پاشا نے اپنے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں جہیز جوڑ دیا تھا۔ ہلکے بھاری ملا کر اکیس جوڑے، تھوڑے سے بہت برتن اور ایک چھوٹا صندوق ایک بڑا صندوق — سفری پاندان، اچھا گھڑا، آفتابہ، سلفچی اور اپنا

روزمرہ کے استعمال کا چھوٹا پاندان۔

دوسری صبح شوال کی سات تاریخ تھی۔

صبح سے ہی گھر میں وہ چہل پہل جو شادیوں کا خاص حصہ ہوتی ہے، وہ ضرور ہے کہ چھوٹے پیمانے پر تھی مگر لگتا تھا کہ شادی رچائی جا رہی ہے۔

نکاح فوراً حسب معمول مغرب کی نماز سے کچھ وقت ادھر ٹھہری تھی۔

محلے پڑوس کی لڑکیوں، بالیوں، بچوں، کچھوں سے گھر بھر رہا تھا۔ پاس پڑوس کی بن بلائی عورتیں بھی تاکا جھانکی کر رہی تھیں۔ بس نہیں موجود تو رقیہ میاں، جن کی بیٹی کا ہاتھ آج ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیا جانے والا تھا۔

پتہ نہیں دلہن پاشا کس کام سے، اپنے کمرے کو گئیں تو وہیں دروازے کی چوکھٹ پر بھرا دل لے کر بیٹھ گئیں، جس پر کی نظروں کی زد میں تھی وہ ٹکٹکی باندھے دیکھے جاتی تھیں، آنکھ میں آنسو کہ جھلک سی نمی بھی دکھ گھلی تھی۔

بوٹے ماموں میاں نے سر پر بڑا سا ٹوکرا رکھوائے۔ وہیں سے چلتے چلتے آئے۔

دلہن بی بی۔ ذرا دیکھیو۔ یہ سہرا خشک ہے کہ تازہ، پھر آگے آتے آتے بولے۔

چار تو بج رہے ہیں، بتائیے ابھی سے وہ دلہے کا جوڑا، سہرا بھجوا جائیں تو اچھا ہے ورنہ پھر رخصتی میں دیر ہو گی۔

دلہن پاشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماموں میاں سامنے آ گئے۔

اداس ہو کر بولے۔

بیٹی کو دل کرا کر فائدہ بھی کیا ہے، میں جانتا ہوں تیرے دل

میں کہا ہے۔ قدیر میاں نہیں ہیں تو دن دہاڑے کے ہاتھ میں بیٹی کا ہاتھ دے کر رخصت کرتا ہے۔ کرو بٹیا اپنی گوڈولی میں سوار کروائے گا۔ تو عظمت نے کہا بیٹی، یہ تو صفیہ کی قسمت تھی کہ باپ کے ہوتے بھی سونے بازو نہ ڈولی چڑھتی، ورنہ کیا اچھا لگتا کہ دولہا گھوڑے میں سوار۔ ایک بازو بھائی ایک بازو باپ آگے پیچھے ماموں و چچا ۔۔۔"

گلے میں گولہ سا اٹکنے لگا تو اونچی آواز سے بولے ۔۔۔ مگر باپ کو اتنی کہاں ہوتی اتنی محبت خیال ہوتا تو یہ دن نہ دکھاتا۔ داماد کے لئے سواری کو گھوڑا تک کرائے کا چلا ہے ۔۔۔ گھوڑی اچھے ہوتے تو آج یہ گھر دلہن کی طرح سجا سجایا اجاڑ نہ نظر آتا۔

دو بہن پاشا تیزی سے اٹھیں اور ماموں کے سینے سے لگ گئیں۔

صحنچی میں ڈھولکی پڑی تھی ۔۔۔ لڑکیوں نے اٹھا کر پیٹنا شروع کر دیا۔

گورے گورے ہاتھوں پہ مہندی کی بہار
اس پہ بار سنگھار ۔۔۔ سکھی آیا ری آیا
سکھی آیا ری آیا دیکھو گھوڑے پہ سوار

صفیہ کا جی بھر آیا اس نے جلدی جلدی سسکیاں لینی شروع کر دیں ۔۔۔ مغلانی بی نے اس کو اپنی طرف کھینچا ۔۔۔

"رو نہیں گڑیا بیٹی ۔۔۔ جی ہلکان ہو جائے گا۔"

"دولہے کو سہرا بندھوایا گیا ہے۔ اب گھنٹے دو گھنٹے میں برات چڑھے گی۔" امراؤ میاں تو پکار کر چلے گئے اور دو بہن پاشا کا جی مچل گیا ۔۔۔

اماں بی ایک کونے میں بیٹھی کرتا کتر رہی تھیں۔

• عقیقے کے لیے کتنے بکرے کٹوائیں گے جی — پورے گاؤں کو کھانا کھلانا ہوگا کہ نہیں —؟

• اور سفید پوری حویلی سجائی ہے — شہر تک بتی بھی تو منگوائی ہے۔ ارے آتی بس نہیں ہوگی، کچہری تک جھنڈیاں بھی تو لگوائیں گی میں —

• عید سر پر آگئی ہے — ... کی دریاں علی پہ اب تک چونا بھی نہیں پڑا — اور کپڑے بھی ادھورے پڑے ہیں جوڑ کر رکھے — اے بی یہ تمہارے ہاتھ جلدی کیوں نہیں چلتے —؟

دولہے کا سہرا بھجوا دیا گیا ہے — یہ آواز ان کے کانوں میں بھی پڑی اور جیسے وہ چونک سی گئیں — تکیے کا سہارا لے کر انہوں نے خود ہی بڑی مشکل سے ہلکے پھلکے وجود کو اٹھایا اور بیٹھ کر سننے لگیں —

دلہن پاشا آنچل سے اپنی آنکھیں صاف کرتی ہوئی آئیں اور اماں بی کے شانے کے قریب منہ لے جا کر بولیں —

• اماں بی منہ دھو کر کپڑے بدل لیجیے نا —

اماں بی نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں — بس ہنستی رہیں —

دلہن پاشا نے اپنی ساری رہی سہی قوت جمع کی۔ آنکھوں میں امڈنے والے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بھنچی ہوئی آواز سے بولیں —

• اماں بی آج آپ کی سفرماں کی شادی ہے نا جس کے جہیز میں آپ نے رات کو دن بنا دیا تھا —"!!!

امّاں بی نے معصوم نگاہوں سے بہو کو دیکھا جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

زکیہ بیگم نے پھر کہا "ہاں دادی امّاں بی دیکھیے تو صفیہ اس کمرے میں اکیلی بیٹھی ہے۔ بھلا آپ نہ سنواریں تو اسے سنوارے بھی کون ۔۔۔؟"

امّاں بی معصوم اور نادان بچوں کی طرح کھل کھلا کر ہنسنے لگیں۔ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئیں ۔۔۔ اسی لمحے باہر سے ایک چھوٹی سی بچی دوڑتی ہوئی آئی اور دولہن پاشا سے بولی۔

"دولہن بی بی جی ۔۔۔ دولہے والے آ گئے۔"

"ہائیں ۔۔۔ دولہے والے آ گئے ہیں؟" دولہن پاشا حیرت سے بولیں "تو کیا جانے؟ باجا نہ تاشے کی روشنی نہ شور غوغا۔ تجھے کیا معلوم ہے؟"

"میں نے خود گھوڑا دیکھا ۔۔۔ اپنی آنکھوں سے ۔۔۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا بڑی مونچھوں والا ہے کہ نہیں سکوں ۔۔۔" اس نے اپنی ساتھ والی کو بھی گواہ پیش کر دیا۔

"ہاں ہے کیسے نہیں اور ساتھ میں چھ سات مرد وے اور بھی تو ہیں۔"

"پر دولہے کی مونچھیں ان سب سے بڑی ہے ۔۔۔ ہے نا سکوں ۔۔۔؟"

"ہاں ہے کیسے نہیں۔"

زکیہ دولہن بڑی طرح الجھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں کس کس کو دولہا بنا کر جا رہی تھیں یہ بچیاں۔ ہو سکتا ہے کوئی رشتہ دار ہو لیکن اگر ہوتے تو اطلاع ... نرگس کے رشتے دار کو تو خبر نہیں بھجوائی۔ پھر کون ایسا تنگ ناک ہے جو اٹھا کر بن بلائے چلا آتا۔

دلہن پاشا مسکرا کر بولیں۔ "اچھا جاؤ جاؤ — جا کر دولہا میاں کا انتظار کرو مگر نیگ لئے بغیر اندر نہ آنے دینا۔" اسی لمحے بڑے ماموں اندر لپکے ہوئے آئے۔ بال بکھرے ہوئے، چہرے کا رنگ زرد — اچکن کے سارے بٹن کھلے اور ہونٹوں میں کپکپی ایسی کہ بات تک نہ نکلتی تھی —

"دلہن پاشا — دولہن پاشا —"

دلہن پاشا جو سامنے ہی کھڑی تھیں۔ ذرا کی ذرا مسکرا کر بولیں۔ "داماد کی آمد نے اتنا بدحواس کیوں کر دیا ہے آپ کو —" بڑے ماموں کے قدم اسی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے — بڑے کرب کے ساتھ بولے —

"داماد —؟"

پھر پوری طاقت سے چلا کر بولے — یوں جیسے پاگل ہوں —

"دلہن پاشا — حویلی خالی کروانے کو جمن خان آیا ہے۔" سناٹا

دلہن پاشا کے پیر کانپ گئے اور وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئیں —

"حویلی خالی کروانے — مگر کیوں —؟"

بڑے ماموں جلدی جلدی ہاتھ ملتے ہوئے بولے — "ارے بیٹی تمہیں معلوم تھا نہیں — پچھلے دنوں قدیر میاں آئے تو زیور تو لے ہی گئے۔ حویلی بھی پندرہ ہزار کو بیچ دی مگر چھ مہینے کا کرایہ بھر کر چلے گئے — اور وہ کرایہ آج ہی ختم ہوتا تھا — جمن خان سر پر کھڑا ہے — اب کیا ہوگا بیٹی؟ — اب کیا ہوگا۔ اوخدا۔ اب کیا ہوگا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ اب کیا ہوگا —؟"

دلہن پاشا پتھر کی طرح خاموش تھیں — بڑے ماموں میاں ایکساں اٹھتے جاتے اور روتے جاتے۔

"اب کیا ہوگا۔ اب کیا کرنا ہے؟"

اماں بی کی معصوم ہنسی رک گئی تھی۔ اشتعال نے ان کے دماغ کی کرشمی رگ کو تیش دلا کر ایک دم تن کر کھڑی ہو گئیں — پورے طمطراق کے ساتھ بولیں۔

"کس میں دم ہے حویلی خالی کروانے کا۔ ذرا میرے سامنے آ کے تو"

دلہن پاشا اور ماموں میاں بجلی کی سی تیزی سے لپک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں بی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے اور اتنے عزم و استقلال سے کھڑی تھیں جیسے کبھی بیمار ہی نہ رہی تھیں —

ماموں میاں نے غور سے بہن کی طرف دیکھا — نرم آواز سے بولے۔

"بہن — اب رحمت خاں کھڑا ہے جیسے بھی۔ کبھی تو بڑے سرکار سے بدلہ لینا ہی تھا۔ بڑے سرکار جتنے دیالو اور نیک تھے وہ ساری برادری اور گاؤں پہ روشن تھا۔ محسن خاں ایسا دیا بھی سر ہو نہ تھا۔ وقت پر سود نہ ملتا تو ٹھاکی سے بہو بیٹیوں کی جوانی سے وصول کرتا۔ گاؤں والے اب بھی کہا کرتے ہیں کہ غریبوں کا اتنا بھیانک ظلم ہو سکتا ہے۔ مجبوری اور غریبی تو انسان کو گونگا بھی بنا دے — گاؤں کے رہنے والوں میں برکت بھی ایک تھے بیچارے کاشتکاری کرتے، دو بچے، ایک بیوی تھی، نام تو برکت خاں تھا مگر گھر میں کسی قسم کی برکت نہ تھی۔ ایک سال فصل ابھی قریب پکی ہی تھی کہ بھی نہ پڑی۔ پیٹ کی ضرورت کیسے پوری ہوتی اور پھر دو بچے ادھر کھیت پہ پھر پہرہ لگا ہی تھا۔ تھا تو غریب مگر غیرت مند، غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بڑے سرکار کے آگے ہاتھ

پیار سے۔ یہ جانتا تھا کہ وہ دیں گے تو ہمارا نام مٹے نہ دیں گے — یہ تو سر پر بھیک
ہو گئی اور یہ ان کی برداشت سے باہر تھا — جمن خاں سود پر پیسے دیتا تھا اور
تجھن۔ یہی بھی کیا کرتا تھا۔ یہاں پاس میں کیا دھرا تھا کہ انہیں نام دیتے۔ منہ سے
انہوں نے کچھ مانگا نہ اس نے کچھ مانگا۔ بات اتنی طے ہوئی کہ چھ مہینے کے بعد چھ سو روپے
مع سود کے، اسے یہ کیا تو زمین رکھ لیا جائے گا۔ بات چھوٹی سی نہیں تھی ایک بیٹی کی
عزت کا سوال تھا اور بیٹی بھی کیسی کہ اطراف ایک لڑکی ہی تھی مگر سیجوں میں تکی۔
آنکھوں میں پلی — بھلا بڑے سرکار نے اس دہ جانتے، بس اتنا فرق تھا کہ گودی ماں اور
رقمان تو ان کا اپنا خون تھیں، اور سر پر دے گاؤں کی بیٹیاں ان کی رفیق بیٹیاں تھیں۔

برکت خاں کو بیٹھ پیچھے ہی بہت لتاڑا اور بیٹے آرک کے ہاتھ سے جمن خاں کے
پورے روپے مع سود کے پھیر دیئے — جمن خاں کے کھوروں میں لگی تو سر تک جا پہنچی
اٹھا یا تو تر ولد کیسے پیچھے ہٹ گیا۔ مگر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کو تو قلم ملی تھی جو چل
گئی۔ مگر رگوں میں بیج خون تھا۔ کینہ ہی کروٹ کروٹ کر جوا تھا۔ بھلا وہ بڑے سرکار
کی برائی پر تو کیا آتا — مگر موقع کی تاک اسے ضرور تھی۔ جو آج خدا نے پوری کر دی

جمن خاں — نانی بی منہ سے پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولیں تو اس بیچ
کا کیا مجال ہے کہ ادھر آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے — بھلا میاں تم ہی کہو یہ حویلی خالی
کی جا سکتی ہے۔ بڑے ماموں اور دونوں پاشا ایک دوسرے کی طرف حیرت
بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ نانی بی حواس میں
ہیں یا ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے ...

نانی بی نے اپنے ایک سو کچھ مارے ہاتھ سے ماموں میاں کا ہاتھ پکڑ اور دو کر

ہاتھ سے دولہن پاشا کا ہاتھ پکڑ کر، تقریباً گھسیٹتی ہوئی بڑھیں۔

"آؤ — ذرا میرے ساتھ آؤ —"

اماں بی تیزی سے دونوں کو کھینچتی ہوئی بڑے سرکار کے کمرے تک لے گئیں۔

"دیکھو — وہ کرسی دیکھ رہی ہو؟ اس پر بڑے سرکار بیٹھتے تھے۔ اس پر بیٹھ اپنے کاغذات دیکھتے تھے۔ اور کبھی کبھی آنکھیں جھپکا لیتے تھے وہ وہ رہا چھپر کھٹ جس پر وہ سوتے تھے، اور دیکھو وہ جا۔نماز، وہ تخت۔ میں نے تو ان کی جانماز تک نہیں اٹھائی — مجھے یقین ہے، وہ ضرور رات کو اپنے تخت پر تہجد کی نماز پڑھتے ہیں — یہ ان کا کمرہ — جس کے در و دیوار سے ابھی ان کی خوشبو تک نہیں گئی ہے۔ یہ تمہیں ان کے حوالے کر دوں گی —؟"

اماں بی نے اسی تیزی سے ان دونوں کو کھینچا اور دولہن پاشا کے کمرے پر لا کر کھڑا کر دیا — "یہ دیکھو، یہ میرے بچے میرے بیٹے کا کمرہ ہے۔ دیکھو وہ مسہری مسہری دیکھتی ہو، نقش کے تاروں کی جھلملاہٹ تو ابھی تک مدھم نہیں پڑی ہے اور پائنتی سے دیکھو، اپنا جھولا، وہ ہے جس کی ڈوری پکڑ کر میں نے صفدر کو جھولے کا پینگ دیا تھا — دیکھو اب تک ڈوری ہل رہی ہے — بستر کی چادر ابھی تک میلی تو نہیں ہوپائی ہے — میرا بیٹا شہر گیا ہے کاروبار دیکھنے۔ اسے آتے نہیں کل کبھی تو آئے گا۔ پھر سوچو تو میرا بیٹا آئے گا تو یہ میری بہو کے ساتھ کہاں سوئے گا۔ جو رکی رہی نہ جھکی تو پھر میں بیچ کہاں بچھاؤں گی —؟"

دولہن پاشا نے اپنے منہ میں دوپٹے کا پلو ٹھونس لیا۔ دونوں کے ہاتھ پکڑ کر پھر برآمدے تک لے گئیں —

- جیتی زندگی کو ریت رسمیں لگی ہی رہتی ہیں۔ یہ حویلی بک جائے گی تو پھر اتنے سارے مہمانوں کا اٹھنا بیٹھنا کہاں ہوگا — یہ دیکھو میں نے سرخ کاغذ اور سنہری روپہلی فنیتہ کے پھول چھت گیری میں لگوائے تھے۔ آج تک تو جھل ملا رہے ہیں — تمہیں معلوم ہے میرا خاندان کتنا پھیلا ہوا ہے — ایک کام کرنے کی ٹھان لوں تو بھی ہزار کی چپت پڑ جاتی ہے — اے جنھیں میرے کمانے والے۔ مجھے کون لگی پڑی ہے۔ مگر یہ حویلی ہی نہ رہی تو کس کا برآمدہ اور کس کا دالان ہے؟

نرتاخ دالان کے پاس رک کر انہوں نے دروازوں کو پھر سے تاکنا شروع کر دیا۔

- منجھلے میاں کے ختنے ہوئے تھے تو بھول گئے کیا۔ کہ اتنا بڑا دالان بھی کم پڑ گیا تھا۔ کتنی بیبیوں کو تو چبوتروں کے پاس بیٹھنا پڑا تھا۔ میں کہوں اللہ رکھے میری منفرد کے اولاد ہوگی — میرے پوتوں کے گھر بھریں گے تو پھر ایسی ریت رسمیں کرنے ہم اور کہاں جگہ ڈھونڈتے پھریں گے" پھر ناک کی نوک پر سر رکھ کر بولیں۔

- اب تک ہماری نسل میں مشرق کی خوشبو رچی ہوتی ہے۔

- اماں بی کا سانس چڑھ گیا تھا — اور وہ چھوٹے چھوٹے سانسوں کے درمیان گھومتی گھماتی پھر رہی تھیں — ماموں میاں تسبیح کے دانوں کے پٹکنے کی طرح اماں بی کے ہاتھوں میں متحرک رہے تھے۔ دلہن پاشا کی سسکیاں اب ابھرتی جا رہی تھیں —

چھوٹے میاں باہر سے آکر بولے —

- اماں میاں — وہ مسجد والا آدمی کہہ رہا ہے کہ ہمیں جلدی ہے۔

اماں بی نے سنی ان سنی کر دی۔ اب وہ باغ میں کھلنے والے دروازے کے سامنے تھیں۔

۔ بادل گرجیں گے اور گھٹا چھائے گی ــ بجلی کی چمک کے ساتھ ساتھ ننھی ننھی بوندیاں گریں گی ــ تو لڑکیاں ہرے ہرے پہناوے پہن کر جھولے جھولیں گی۔ اونچے اونچے پینگ بڑھائیں گی۔ اور حویلی نہ ہوئی تو پھر یہ سب کچھ کہاں ہوگا ــ وہ دیکھو گلاب کے، موتیا کے، چنبیلی کے، دریچے کے پرے سے دکھائی دیتے ہیں نا۔ اور بڑے سرکار نے تو ایسا باغ لگوا دیا ہے کہ بڑی بھاری شادی بھی رچ جائے تو بھی گھر کے پودوں سے ہی سہرے تو گندھ جائیں اور پھر بھی پھول بچ رہیں۔ پودے سوکھ گئے تو کیا ہوا۔ موسم بھی تو جا رہا ہے۔ وہ پھر آئے گا، بہار تو بڑھا ٹھہرا۔ اگلی بہار میں پھول کھلیں گے اور ضرور کھلیں گے مگر حویلی کیسے جائے ــ حویلی کے دم سے باغ ہے ــ باغ کے دم سے پھول ہیں۔

ہوا کے ایک تیز و تند جھونکے کے ساتھ سوکھی سوکھی پتیاں، بیلا اور اماں بی کے قدموں میں لوٹ گئیں ــ " اور یہ بار بار کی نانا ــ یہاں تو صدا سے دیکھیں گرد کورتی ہیں ــ سدا انہی کے نکھار کی رسم سونپیں اڑتی رہتی ہیں۔ یہ ہوا جھٹس خاں کیا میری حویلی لے گا ــ ہوں! شدّاد ــ اس کے ہاتھوں یہ حویلی بچے سدا ایسے ٹھنڈے رہے گی اور سب کی یہ عالم ہے کہ صدا کھٹکتے رہتے ہیں!

بڑے بڑے ٹھنڈے جھونکے منہ چھپائے اماں بی کو کتکتے رہے تھے۔

صبا دھلانے کے سامنے رک کر اماں بی نے گرد بھرا چہرہ اٹھایا۔

۔ تمہیں معلوم ہے ــ میرے کام کیسے اونچے پیمانے پر ہوتے ہیں؟ جو جو بیاہ شادی بیاہ میں آیا کریں گے تو کیا میں انہیں اپنے سر پر بٹھاؤں گی ــ یہ کمرے میں نے اور بڑے سرکار نے اسی لئے تو بنائے تھے ــ مہمانوں کی خاطر کریں۔ ورنہ

پردے والی بیبیوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

- اماں بی اپنے کمرے کے سامنے آ کر رک گئیں۔ ان کی انگلیوں کی گرفت ماموں میاں اور دلہن پاشا کے ہاتھوں پر ڈھیلی سی پڑ گئی۔

- یہ میرا کمرہ ہے۔ یہاں میں دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ آگے بڑھیں اور ایک پلنگ کے کر بولیں۔ یہ یہاں میرا پلنگ تھا۔ پھولوں، صندل اور عطر سہاگ کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ میں یہاں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ تیرے سرکار آئے جس کر میرے سامنے بیٹھ گئے اور چہرہ اوپر اٹھا کر بولے۔

- فقیروں کی بستی پسند آئی ہے؟

- مجھے یاد ہے میں نے شرما کر سر جھکا لیا تھا تو بولے تھے

- چاند بادل کی اوٹ میں چلا گیا۔

ابا جان نے وداع کرتے وقت مجھے کہا تھا۔ بیٹی میاں کے گھر کو ہی اپنا گھر سمجھنا اور اس دہلیز کو کبھی نہ چھوڑنا۔ میں مرکر ہی نکلنا۔ میں اس دہلیز کو کیسے چھوڑوں گی۔ یہاں تو میں سہاگن بن کر آئی تھی۔ یہیں تو میں پہلے پہل ماں بنی تھی۔ یہیں رہتے رہتے تو میرے سیاہ بالوں پہ سفید برف پڑی ہے۔ میں اس دہلیز کو کیسے چھوڑ دوں گی۔ کبھی کوئی دلہن اپنے دولہا کا گھر چھوڑتی ہے؟؟

انہوں نے سوالیہ نظروں سے ماموں میاں کی طرف دیکھا۔ کبھی ایسا ہوا ہے؟

ماموں میاں نے ڈرتے ڈرتے دبے سے کہا۔ نہیں۔ نہیں۔ گھومتے گھومتے مستورات کا کمرہ آ گیا۔

- اور یہ دیکھو۔ کسی لڑکیوں نے یہاں سر جھکا کر سدا اپنے جھولے جھلائے

دلہنوں سے خوشامد کروانے کے رنگین خواب دیکھے ہیں، حسین خواب، رنگ رنگ خواب۔ چار دن یہاں بیٹھے بیٹھے ان کے خوابوں میں رنگ چھا جاتا ہے۔ اور تم کہو یہ حویلی دے دی تو ان کنواری بالیوں کے خواب پھیکے نہ پڑ جائیں گے — یہ کیا حویلی چھوڑی جا سکتی ہے ؟؟

صفیہ بالو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ماموں بی اس کے کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی تھیں۔

دلہن پاشا اب برداشت نہ کر سکتی تھیں — کانپ کر بولیں —

"ماموں میاں۔ یہ کیا ہو رہا ہے — میں پاگل ہو جاؤں گی"

ماموں میاں نے بے بس نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ "کوئی تدبیر کروں علاج" وہ مرے مرے لہجے میں بولیں۔ "انسان ہی انسان پر ترس کھاتا ہو ماموں میاں — آج تو صدمے کی گھڑی چھٹنے والی ہیں کیا یہ مر جانے والی بات نہیں — ؟ میں ابھی سہاگ نتھ دیتی ہوں ماموں میاں۔ اس سے کچھ صرف کل تک کے لئے ٹھہر جائے" اور کمرے کو پلٹ گئیں۔

ماموں میاں کانپ گئے۔

اماں بی زور سے چیخ کر بولیں —

"دلہن"

دلہن پاشا کے قدم ٹھٹھک گئے۔

"سہاگ نتھ اور سو روپے ان کے ہاتھوں میں" وہ رک رک کر بولنے لگیں۔

"دلہن یہ تم نے کہا ہے — ؟ یہ تم نے کہا ہے دلہن؟ اپنے منہ سے کہا ہے تم نے؟"

وہ خواب ناک انداز میں بولیں۔

"یہ تو نے کہا ہے — تیری سہاگ تو چلے جانے سے اس گھر میں اندھیرا چھا جائے گا — تو بیوہ نہ ہو جائے گی — تیرا سہاگ نہ لٹ جائے گا — تیرے بچے نہ یتیم ہو جائیں گے — میری — میری کوکھ نہ اجڑ جائے گی..."

"اماں بی"

دولہن پاشا نے پوری طاقت سے چلا کر کہا۔

"بس کیجئے اماں بی — بس کیجئے — خدا کیلئے بس کیجئے"

اور انہوں نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر سختی سے رکھ لئے۔

اماں بی کے آئے ہوئے حواس پھر لوٹ گئے — وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگیں — اور ہنسی کے دورے پڑنے لگیں — ان کے سفید بال ادھر ادھر جھولنے لگے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

وہ صفیہ اماں کے کمرے کی چوکھٹ پر بیٹھ گئیں اور صحن میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں سے چلا کر بولیں۔

"بابل گاؤ ری لڑکیو"

بے سمجھے بوجھے ننھی ننھی لڑکیوں نے ڈھولک اٹھائی اور تیلی پتلی آوازیں صحن میں سسکنے لگیں —

کاہے کو بیاہے بدیس رے سن بابل مورے

اماں اماں سن بابل مورے

آج صفیہ اماں کی شادی تھی — ختم شد ::